روشن راہیں

جنرل آفیسر کمانڈنگ 4 ائر ڈیفنس ڈویژن میجر جنرل ظفر اقبال،
ہلال امتیاز (ملٹری) اور کمانڈانٹ ملٹری کالج جہلم بریگیڈیئر محمد سعید انور کی
ذاتی دلچسپی اور ایما پر عالمگیرین اور پاکستان کی نوجوان نسل کی رہنمائی کے لیے
سعید راشد علیگ عظیم استاد پروفیسر کی اس کتاب کو دوبارہ شائع کیا گیا ہے



ملٹری کالج جہلم
سرائے عالمگیر

تعارفِ مصنف

نام: محمد سعید راشد

تعلیم: ادبیاتِ اُردو، انگریزی اور فنِ تعلیم

درس گاہیں: اسلامیہ انٹر کالج بریلی/ بریلی کالج بریلی/ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مربّی اساتذہ: جناب مبارک حسین، مولانا محمد محسن،
ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر داس گپتا،
ڈاکٹر عشرت حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ذاکر حسین

پیشہ: اُستاد ملٹری کالج جہلم، سرائے عالمگیر از 1950ء تا 1988ء
پرنسپل آرمی پبلک سکول، جہلم کینٹ

ذہنی پس منظر: تحریکِ پاکستان کا دور

مشغلہ: تصنیف و تالیف

مشن: پاکستانیت کا فروغ

اُردو کتب:

- حیاتِ قائداعظم
- گفتار و کردار قائداعظم
- تذکرۂ اقبال (حالاتِ زندگی)
- مکالماتِ اقبال (سنہرے واقعات)
- میجر محمد اکرم شہید (نشانِ حیدر)
- شاد باد منزلِ مراد (تقاریر و مباحثے)
- کردار کی کرنیں (سبق آموز سچے واقعات)
- کرنل حق نواز کیانی شہید (ستارۂ جرأت)
- کیپٹن معظم علی بلوچ (شہید سیاچن)
- جرأتوں کے نشان (پاک و ہند کے 42 جنگی اعزاز یافتہ غازیوں کا تذکرہ)
- تذکرہ شہدا (جنگ ستمبر و دسمبر کے 15 شہیدوں کا تذکرہ)
- گفتار و کردار سرسید
- پاکستانیت اور کیریکٹر بلڈنگ
- کیریکٹر بلڈنگ اور پبلک سپیکنگ
- روشن راہیں
- آدمی میں انسان کی تلاش
- دیئے سے دیئے کو جلاتے چلو
- دانائی کی تلاش
- کردار ساز (حالات بریگیڈیئر محمد رفیق)
- داستانِ علم و عمل (2 جلدیں) تاریخ ملٹری کالج، جہلم
- چراغوں کی قطار (ملٹری کالج کے اساتذہ کا تذکرہ)

English Books:

* Character and Conduct of Quaid-e-Azam
* Living with Leadership
* Learning to Lead
* In Search of Maturity
* From School to College
* A Lasting Light House
* In Search of Character
* Character Building Exercise
* Teacher Education Programme
* Character Building & Public Speaking
* Pakistan and Character Building
* Recognition
* Teacher Guide

پروفیسر سعیدؒ راشد علیگ



۱۹۵۱ء



۱۹۷۱ء



۱۹۸۸ء



۱۹۹۵ء

روشن راہیں

پروفیسر سعیدؔ راشد علیگ

بُک کارنر
جہلم، پاکستان

ضابطہ

ایڈیشن: جولائی 2020ء

نام کتاب: روشن راہیں

مصنف: پروفیسر سعید راشد علیگ

مقصد: تخلیقی ذہن اور تخلیقی تعلیم کا فروغ

اہتمام: ملٹری کالج جہلم، سرائے عالمگیر

سرورق: ابو اِمامہ

مطبع: زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

ناشر: بک کارنر، جہلم (پاکستان)

بُک کارنر

شورُوم: اقبال لائبریری روڈ، بک سٹریٹ، جہلم (پاکستان)
Ph: +92 (544) 614977, 621953 Email: info@bookcorner.com.pk
WhatsApp # 0314-4440882 Facebook: book corner showroom

WWW.BOOKCORNER.COM.PK

انتساب

ہر اس استاد کے نام

جو

سوچتا ہے

Who Thinks

جو

زندگی

اور تعلیم کا

ایک

Vision رکھتا ہے۔

(سعید راشد)

کتاب کا پیغام

علم کی کمی
خلوص سے
پوری ہو جاتی ہے
لیکن
خلوص کی کمی
کسی چیز سے
پوری
نہیں ہوتی

فہرست

تعارف

سلطانہ فاؤنڈیشن کے شعبہ کریکٹر بلڈنگ اور ٹیچر ایجوکیشن کی یہ پانچویں کتاب ہے۔ اس سے پہلے طلبا کی کردارسازی اور رہنمائی کے لیے دو کتابیں ''آدمی میں انسان کی تلاش'' اور ''دیئے سے دیئے کو جلاتے چلو'' اردو میں اور In Search of Character اور Exercises in Character building انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں۔ اساتذہ کی اقداری تربیت اور آگہی کے لیے ''روشن راہیں'' شعبہ کی پہلی کتاب ہے۔ اسی سلسلہ کی دوسری کتاب 101 Teacher Education Programmes زیر طباعت ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچے، وہ کتاب بھی چھپ چکی ہو گی۔ اہل قلم سے گزارش ہے کہ ان دونوں مجموعوں کو سامنے رکھ کر اپنے تاثرات سے ہمیں مستفید فرمائیں۔

ٹیچر ایجوکیشن یعنی اساتذہ کی تعلیم کے دو پہلو ہیں۔ ایک پیشہ ورانہ مہارت کا، دوسرا رویوں اور اقدار کا۔ جب کوئی استاد کلاس میں پڑھاتا ہے تو اس کی پیشہ وارانہ مہارت ہی بروئے کار نہیں آتی، اس کی شخصیت بھی مسلسل اس عمل میں کارفرما رہتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو تدریس بھی اس استاد کی موثر ہو جاتی ہے جس کی شخصیت پڑھانے کے عمل میں بجلی کی رو کی طرح جاری و ساری ہو۔ تدریس ہو یا کوئی اور پیشہ، اصل فرق شخصیت ہی سے پڑتا ہے۔ لیکن تعلیم و تدریس میں یہ فرق بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ٹیچر ایجوکیشن کے ہر پروگرام میں استاد کی شخصیت کی نشو ونما کو بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔

مجھے خوشی ہے کہ سلطانہ فاؤنڈیشن کے ٹیچر ایجوکیشن کے شعبے کی یہ کتاب ''روشن راہیں'' خاص طور پر ٹیچر ایجوکیشن کے اس نظر انداز شدہ پہلو پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔ اس کا

موضوع ہی استاد کی آ گہی، اس کی شخصیت، رویے اور قدریں ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک نئی سوچ اور تحقیق کے دریچے کھولتی ہے۔

ٹیچر ایجوکیشن کی تاریخ میں یہ کتاب ایک قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ کتاب اس نظریہ پر مبنی ہے کہ ٹیچر کی شخصیت تدریس اور تعلیم کے عمل میں دوسرے عناصر سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کاوش وہ ضروری مقصد پورا کر سکے گی جس کے لیے یہ لکھی گئی ہے۔

ایک بار پھر میرا یہ خوشگوار فرض ہے کہ میں کردار سازی کے شعبہ کے سربراہ پروفیسر سعید راشد کو مبارک باد دوں۔ بے لوث خدمت کا کوئی مول نہیں ہوتا، میری دُعا ہے کہ پروفیسر صاحب کا عزم وحوصلہ جواں رہے اور اس طرح کی تخلیقی کاوشوں کے سوتے بھی خشک نہ ہوں۔ یہ اللہ کی دین ہے۔ وہ شخص خوش نصیب ہے جسے کسی کارخیر کا موقع ملتا ہے اور وہ اس کا حق ادا کرتا ہے۔

(ڈاکٹر) نعیم غنی

چیئرمین سلطانہ فاؤنڈیشن، اسلام آباد

پیش لفظ

تعلیم و تربیت کے عمل میں استاد کی شخصیت اور Awareness کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ ٹیچر ایجوکیشن کے ہر پروگرام میں اس کو بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ گو اب تک ٹیچر ایجوکیشن Pre-service اور In-Service تربیتی پروگراموں میں اس پہلو کو بڑی حد تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ تخلیقی تعلیم Creative Education اور Character-building کے Process میں تو ٹیچر کے Vision کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے سلطانہ فاؤنڈیشن کے کالج آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ نے ٹیچر ایجوکیشن کا جو Comprehensive پروگرام شروع کیا ہے۔ اس کے لیے ایک ایسے سلسلہ وار کری کیولم کی ضرورت تھی جو نہ صرف ٹیچرز کی Professional آگہی کو فروغ دے بلکہ ان کے Vision اور Values کو بھی پروان چڑھائے۔

یہ مجموعہ ''روشن راہیں'' اس نوعیت کی ایک کوشش ہے۔ اس کری کیولم کے تین باب ہیں اور ہر باب کے کئی کئی حصے ہیں۔ باب اوّل کا عنوان ہے۔ ''روشنی کی تلاش''۔ اس کا پہلا حصہ ''تعلیم و تربیت'' پُر مغز تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے۔ دوسرا حصہ مختار مسعود کی کلاسیکی کتاب ''آواز دوست'' کے چند اقتباسات کے لیے مختص ہے۔ تیسرا حصہ جس کا عنوان ہے ''روشنی کے رخ کے دریچے'' آٹھ دس فکر انگیز مذاکروں پر مشتمل ہے۔ (یہ کتاب کا بہت قیمتی حصہ ہے) چوتھا حصہ سوچنے سمجھنے کی مشقوں Exercises in Thinking پر محیط ہے۔ پانچویں حصے میں زندگی کی چند سچائیاں بیان کی گئی ہیں۔ چھٹا حصہ ''درس زندگی'' کے عنوان کے تحت دانائی کی باتوں کا خزینہ ہے۔ باب دوم کے تین حصے ہیں۔ پہلے کا عنوان پاکستانیات

ہے۔ دوسرا قائداعظم کی شخصیت اور کردار کا ایک جائزہ پیش کرتا ہے۔ تیسرے حصے کا موضوع ''اقبالیات'' ہے۔ باب سوم کا مرکز ٹیچر ایجوکیشن ہے۔ اس کے پہلے حصے میں جس کا عنوان ''مٹی کا دیا اور دسمبر کا گلاب'' ہے، ٹیچر کے رول کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسرا حصہ آٹھ بڑے ماہرین کے تذکرے پر مشتمل ہے اور تیسرے حصے میں ٹیچرز کی مارننگ اسمبلی کے چھ ماڈل پروگرام دیئے گئے ہیں۔

اس مجموعہ ''روشن راہیں'' کی ایک Complemantary Volume بھی ہے جس کا نام ہے Beacon Light اور ذیلی عنوان ہے 101 Teacher Education Programme توقع کی جاتی ہے کہ ان دونوں مجموعوں کو ساتھ ساتھ پڑھا جائے گا اور ٹیچر ایجوکیشن کے اس کری کیولم سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔ یہی مواد ٹیچر اسمبلی، پبلک سپیکنگ اور Personal Skills Development کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

کوئی کتاب بھی اپنے موضوع پر حرف آخر نہیں ہوتی۔ یہ تو قطعی طور پر ایک تجرباتی چیز ہے۔ اس کے مواد اور Format اور مسائل کے بارے Feed-back کی ضرورت ہے تا کہ خوب سے خوب کی جستجو کا سفر جاری رہے۔

اس مسودہ کی پروف ریڈنگ اور ترتیب کے لیے عزیزم ہارون رشید اور طاہرہ رشید کا ممنون ہوں۔ اس کتاب کا سرورق ملک کے نامور خطاط اور مصور جناب اسلم کمال کی نظر کرم کا ثمر ہے۔ اس حسین کاوش کے لیے میں جناب اسلم کمال کا شکر گزار ہوں۔ جزاک اللہ!!

یہ کتاب سلطانہ فاؤنڈیشن کے ٹیچر ایجوکیشن کے پروگرام کی دوسری کڑی ہے۔ اس سے پہلے طلبا کی کردار سازی کے لیے دو کتابیں ''دیئے سے دیئے کو جلاتے چلو'' اور Light a Candale کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ اس سلسلے کے لیے فاؤنڈیشن کے چیئرمین جناب ڈاکٹر نعیم غنی اور بورڈ آف ڈائریکٹرز کا ممنون ہوں کہ ان کی توجہ، دلچسپی اور حوصلہ افزائی سے کتابوں کی تخلیق اور طباعت بروئے کار آسکی۔

سعید راشد

باب اوّل

روشنی کی تلاش

پہلا حصہ

تجربات و مشاہدات

شروع کرتا ہوں نام لے کر خدا کا

(منظوم ترجمہ سورۃ فاتحہ)

پناہ مانگتا ہوں میں اپنے خدا کی
لعین اور مردود شیطاں سے تیری

شروع کرتا ہوں نام لے کر خدا کا
جو ہے مہرباں درگزر کرنے والا

کہ تعریف سب اس خدا کے لیے ہے
جو ہے پالنے والا کل عالموں کا

وہی مہرباں درگزر کرنے والا
خداوند ہے جو کہ روز جزا کا

عبادت کیا کرتے ہیں صرف تیری
تجھی سے مدد مانگتے ہیں خدایا

دکھا سیدھا رستہ ہمیں بھی انہی کا
جنہیں تو نے انعام سے ہے نوازا

نہ ہرگز چلا ان کے نقش قدم پر
کہ نازل ہوا ہے غضب جن پہ تیرا

نہ وہ جو کہ گمراہیوں کے سبب سے
رہِ راست سے کر چکے ہیں کنارا

دُعا کرنا مقبول میری خدایا
یہی التجا ہے دوبارہ سہ بارہ



کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا

(حمد)

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا
حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے اسے جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

(حالؔی)



لوح بھی تو، قلم بھی تو

(نعت)

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب
شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

(اقبالؔ)



نیکی سے بدی ہے نہیں کچھ دور بہت

(آج کا خیال)

جو لوگ نیکیوں میں ہیں مشغول بہت
ہوں نیکیوں پہ اپنی نہ مغرور بہت
نیکی بھی اک بدی ہے اگر ہو نہ خلوص
نیکی سے بدی ہے نہیں کچھ دور بہت

ہے جان کے ساتھ کام ہر انساں کے لیے
بنتی نہیں ہے زندگی بے کام کیے
جیتے ہو تو کچھ کیجیے زندوں کی طرح
مُردوں کی طرح جیے تو کیا خاک جیے

(حالؔی)



علم خیر کثیر

قرآن حکیم میں حکمت کو خیر کثیر کہا گیا ہے۔ یعنی علم و حکمت سے بھلائی اور بہتری کے بہت سے پہلو نکلتے ہیں۔

اس میں کیا شک ہے کہ حکمت خیر کثیر ہے۔ قرآن حکیم ہی میں خود اللہ تعالیٰ جل شانہ نے رسول کریم ﷺ کو جو دعائیں مانگنے کو کہا ان میں ایک یہ بھی ہے کہ

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا.

(سورۃ طٰہٰ، آیت:114)

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تحصیل علم ایک مسلسل عمل ہے۔ اس لیے اس میں ہر دم اضافے کی دُعا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ علم وحکمت کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔

وَ فَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ.

''ہر علم والے سے بڑھ کر ایک علم والا ہے۔''

(سورۃ یوسف، آیت:76)

علم اور تعلیم کے شرف و عظمت کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ خود رسول کریم ﷺ نے اپنی بعثت کا ایک مقصد تعلیم دینا بھی ٹھہرایا اور اپنے آپ کو معلم کہا۔ حدیث نبوی ﷺ ہے:

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعلّماً.

''میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

(سنن ابن ماجہ، حدیث:229)

اسلام روشنی کا داعی، روشنی کا پیامبر ہے۔ طلب علم کو اسلام میں ایک مذہبی فریضے کی حیثیت حاصل ہے۔ مشہور حدیث ہے:

طَلَبُ الْعِلْمُ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ.

''یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔''

(سنن ابن ماجہ، حدیث:224)

اور اس میں عمر کی بھی قید نہیں۔ ایک نہیں بہت سی احادیث ایسی ہیں جن سے علم کی اور حصول علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص علم کی تلاش میں کسی راستے پر چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔''

(سنن ترمذی، حدیث:2682۔ ابن ماجہ، حدیث:223)

ایک اور موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص علم کی طلب میں نکلتا ہے تو وہ لوٹتے وقت تک اللہ کے راستے میں ہوتا ہے۔''

ایک اور حدیث میں عابد و زاہد پر عالم کو ترجیح دی گئی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علم میں صرف دینی علوم شامل ہیں یا فنی اور سائنسی علوم بھی؟ اسلام میں دین و دنیا، مادہ اور روح کی تفریق نہیں۔ قرآن میں سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ اور اللہ کی آیات یعنی نشانیوں کے مطالعے و مشاہدے اور تحقیق و تدبر کی تلقین کی گئی ہے۔ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ اور اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ کے فقرے بار بار آتے ہیں۔ اسلام کے اسی تعلیمی و تحقیقی نقطہ نظر سے تحصیل علم و حکمت کی وہ عظیم اور ہمہ گیر تحریک اٹھی جس نے گیارہویں صدی اور بارہویں صدی میں بغداد اور اُندلس کو دنیا کا روشن ترین خطہ بنا دیا تھا۔ جدید مغرب کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے سوتے مسلم سپین ہی سے پھوٹے۔ یہ ساری دنیا کو معلوم ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا انسائیکلو پیڈیا مسلمانوں ہی نے دسویں صدی عیسوی میں ''اخوان الصفا'' کے نام سے مرتب کیا تھا۔

آخر میں ایک معروف حدیث کی طرف اشارہ کروں گا، یعنی:

''علم حاصل کرو، چاہے تمہیں چین تک جانا پڑے۔''

(''المدخل''، للامام البیہقی، ''جامع بیان العلم'' از امام ابن البر، ''اخبار اصبہان'' از امام ابونعیم الاصبہانی)

اس حدیث کے بغور مطالعہ میں تین نکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حصول علم کے لیے جتنی زحمت و مشقت اٹھانی پڑے، اٹھانا چاہیے۔ چین اس زمانے کی معلوم دنیا کا بعید ترین ملک

تھا۔ جہاں تک پہنچنا مشکل ترین تھا۔اس کے باوجود چین تک جانے کی ہدایت کی گئی۔

دوسرے یہ کہ اس میں غیر مذہبی، سائنسی اور فنی علوم کے حصول کو اتنی اہمیت دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث کا مرکز تو مکہ مدینہ تھے۔ اگر حصول علم کے لیے چین تک جانے کا کہا گیا تھا تو یقیناً یہ علم محض دینی علم نہیں ہوسکتا۔غور فرمائیے۔چین اس وقت تک اسلام کی روشنی سے فیض یاب نہیں تھا۔ وہاں کی زبان بھی عربی نہیں تھی۔ وہاں کے استاد بھی مسلمان نہیں ہو سکتے تھے۔ اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ یہی کہ سائنسی وفنی علوم کا مطالعہ کرنا، غیر ملکی زبان سیکھنا، غیر مسلم استادوں سے پڑھنا اور غیر مسلموں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھنا، سب جائز ہے بلکہ نہایت ضروری ہے۔

آج اس مبارک تقریب کے موقع پر اس حدیث پر غور کرنا ضروری ہے تا کہ تحصیل علم کو ہم ایک عبادت سمجھیں۔ ہمارا اسکول ہی ہمارا چین ہے۔



سخت جان بیج

بُرائی ہی نہیں پھیلتی
نیکی بھی پھیلتی ہے
کبھی کبھی رواروی میں کی ہوئی
ایک معمولی سی نیکی بھی
بہت بڑی نیکیوں کی بنیاد بن جاتی ہے
کبھی کبھی
چلتے پھرتے
بے خیالی میں کی ہوئی
ایک چھوٹی بات
کسی کے دل میں اُتر جاتی ہے
اور بھلائے نہیں بھولتی
کبھی محبت اور شفقت کی ایک
نظر سے
زندگی بدل جاتی ہے
ذرا سی ہمدردی سے
ٹوٹے ہوئے دل جُڑ جاتے ہیں
اور دُکھی دلوں کو
آرام آجاتا ہے
لہٰذا ایک چھوٹی سی نیکی کو،
معمولی سی بھلائی کو،
تھوڑی سی ہمدردی کو
تھوڑا نہ سمجھو،
اندھیرے میں ایک کرن
اور پیاسے کے لیے ایک بوند
بھی
بہت ہوتی ہے
لیکن بھلائی کے کاموں میں
بے صبری سے نہیں،
صبر سے چوکھا رنگ آتا ہے
انسان جو کچھ ہوتا ہے،
وہ ایک روز میں نہیں بنا ہوتا
اس لیے ایک روز میں اس کا
بدلنا بھی مشکل ہوتا ہے
اسی وجہ سے
اچھے کاموں کی
ظاہری بے اثری سے
مایوس نہ ہونا چاہیے
یہ ضروری نہیں کہ
آج کا بُرا آدمی ہمیشہ بُرا رہے
انسان کی فطرت میں بُرائی نہیں
نیکی کی طرف لوٹنا
اس کی مٹی میں ہے
اس لیے ہر وہ شخص جو
نیکی سے محبت کرتا ہے،
کسی بُرے آدمی سے مایوس نہ
ہوگا

اور نہ اس سے نفرت کرے گا
پتہ نہیں کب گم کردہ راہ دل
ایمان کی روشنی سے روشن
ہو جائے
چونکہ نیکی وہ بیج ہے
جو ذرا دیر سے پھوٹتا ہے
اور نہ بھی پھوٹے تو
بڑا سخت جان ہوتا ہے
مدتوں کیچڑ میں،
ریت میں،
بنجر زمین میں،
پتھروں میں،
سنگلاخ تہوں میں
پڑا
بارش کے دو قطروں کا
انتظار کرتا رہتا ہے
انسان اچھا نہیں بنتا،
نہ بنے
لیکن اچھائی کے احساس کو
دل سے نوچ پھینکنے پر
اسے قدرت حاصل نہیں
بھٹکے ہوئے دل میں بھی
کھٹک برابر رہتی ہے
بُرے سے بُرا آدمی بھی
پہلے بُرائی کرنے کا
کوئی جواز ڈھونڈتا ہے،
پھر بُرائی کرتا ہے
آخر کیوں؟
اس لیے کہ
بُرائی کو بُرائی سمجھ کے کرنا
انسان کے لیے ممکن ہی نہیں
انسان سب چوٹیں سہہ لیتا ہے
لیکن ضمیر کی چوٹ
اس سے نہیں سہی جاتی
دل میں کس نے جھانکا ہے
ضمیر کو کون دیکھ سکتا ہے،
کیا خبر کہ اندر سے
کوئی کیسا ہے
اس لیے کیا یہ بہتر نہیں کہ
ہر ایک سے پُر امید رہا جائے
اس وقت بھی اُمید کے
ٹمٹماتے دیئے سے
آس لگائے رہا جائے
جب دوسرے اندھیرے سے
ہار کر
دل چھوڑ بیٹھے ہوں
بیج ڈالتے رہنا
اپنے کام سے کام رکھنا
ہماری ذمہ داری ہے
نتیجہ
ہماری ذمہ داری نہیں

گمنام محسنوں کو سلام

قائد اعظم رحمہ اللہ کے دست راست اور تحریک پاکستان کے پرجوش کارکن نواب بہادر یار جنگ نے ایک بار کہا تھا:

’’ہمیں ان لوگوں کی ضرورت ہے جو کھاد بن کر زمین میں جذب ہوتے ہیں اور جو مٹی اور پانی میں مل کر رنگین پھول اور میٹھے پھل پیدا کرتے ہیں۔ ہم بنیاد کے ان پتھروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے رہ کر اوپر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہیں۔‘‘

میں ایسے گمنام محسنوں کو سلام کرتا ہوں۔ قومیں ایسے ہی خاموش مجاہدوں سے بنتی ہیں۔ ایسے خاموش مجاہد جو خوشی سے گمنامی کی زندگی اور گمنامی کی موت قبول کر لیتے ہیں۔ ایسے جاں نثار جو شہرت طلبی کے جال میں نہیں پھنستے۔ ایسے خدمت گزار جو اپنے نفس کے ناروا مطالبوں سے بلند ہوتے ہیں۔ قوم کے ان محسنوں کے نام سے دنیا واقف نہیں ہوتی۔ ان کے نام تاریخ میں نہیں لکھے جاتے۔ طاقت کا نشہ انہیں نہیں ہوتا۔ دھن، دولت کی مستی کا مزہ وہ نہیں جانتے۔ بس اپنی دُھن میں مست اپنا کام کیے جاتے ہیں۔

میں قوم کے ان محسنوں کو سلام کرتا ہوں۔



حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

(آج کا شعر)

تعصب کہ ہے دشمن نوعِ انساں
بھرے گھر کیے سیکڑوں جس نے ویراں

یونہی کام دنیا کا چلتا رہا ہے
دیئے سے دیا یونہی جلتا رہا ہے

وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

جفا کش بنو گر ہو عزت کے خواہاں
کہ عزت کا ہے بھید ذلت میں پنہاں
حلال آدمی پر ہے کھانا نہ پینا
نہ ہو ایک جب تک لہو اور پسینہ

بشر کو ہے لازم کہ ہمت نہ ہارے
جہاں تک ہو کام آپ اپنے سنوارے

خدا کے سوا چھوڑ دے سب سہارے
کہ ہیں عارضی زور کمزور سارے

کڑے وقت میں دائیں بائیں نہ جھانکو
سدا اپنی گاڑی کو تم آپ ہانکو

زمانہ اگر ہم سے زور آزما ہے
تو وقت اے عزیزو یہی زور کا ہے

(حالؔی)

کسی کے پاس دولت یہ رہتی نہیں
سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

(میر حسن)

غنیمت سمجھ زندگی کی بہار
کہ آنا نہیں ہے یہاں بار بار
تو اس طرح کر باغِ ہستی کی سیر
کہ انجام اس سیر کا ہو بخیر

(خواجہ دل محمد)



دُنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
(آج کی نظم)



دُنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

(آدمی نامہ، نظیر اکبرآبادی)



کردار کی چار قسمیں

ماہرینِ نفسیات نے کردار کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ دو اقداری یا اَخلاقی لحاظ سے اور دو نفسیاتی اعتبار سے۔ کسی کا کردار اقداری لحاظ سے اچھا یا بُرا اور نفسیاتی اعتبار سے مضبوط یا کمزور ہوتا ہے۔ یوں کردار کے چار Combination ہوئے۔

اچھا+ مضبوط اچھا+ کمزور

بُرا+ مضبوط بُرا+ کمزور

سب سے اچھا کمبی نیشن ہے ''اچھا+ مضبوط''۔ بدترین ہے ''بُرا+ کمزور''۔ عام طور پر بہت سے اچھے لوگ اقداری لحاظ سے اچھے لیکن نفسیاتی اعتبار سے یعنی ارادے کی سختی، عزم، قوت برداشت اور جوش و ولولے کے لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں اور بہت سے بُرے لوگ اقداری لحاظ سے بُرے لیکن نفسیاتی اعتبار سے مضبوط ہوتے ہیں۔ لیڈر شپ کے موثر یا غیر موثر ہونے کا تعلق بڑی حد تک نفسیاتی اعتبار سے کمزور یا مضبوط ہونے سے ہے۔

بہت سے اچھے لوگ قیادت نہیں کر پاتے چونکہ وہ نفسیاتی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں اور بہت سے اقداری لحاظ سے بُرے لوگ عملاً موثر لیڈر ثابت ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ نفسیاتی اعتبار سے یعنی ارادے کی سختی، عزم، ولولے، آگے بڑھنے، مقابلہ کرنے اور قیادت کرنے کی امنگ سے لب ریز ہوتے ہیں۔ اسی لیے دنیا میں زیادہ فساد بھی انہی لوگوں کی وجہ سے ہے۔ پاکستان کو ایسے جواں مردوں کی ضرورت ہے جو اقداری لحاظ سے اچھے اور نفسیاتی اعتبار سے مضبوط ہوں۔



خواہشیں اور ضرورتیں

سوال کیا خواہشوں (Wants) اور ضرورتوں (Needs) میں کوئی فرق ہے؟

جواب جی ہاں! بہت بنیادی فرق ہے۔

سوال کیا؟

جواب خواہشوں (Wants) کا تعلق زیادہ تر جسمانی وجود سے اور ضرورتوں (Needs) کا تعلق انسان کے تہذیبی وجود سے ہوتا ہے۔ خواہشیں انسان کے اندر سے پھوٹتی ہیں۔ چھوٹا ہو یا بڑا، وحشی انسان ہو یا مہذب، سب کو اندرونی خواہشیں ہر دم بے چین رکھتی ہیں۔ انسان کو اپنی ضرورتوں کا ادراک بتدریج تہذیبی شعور کی ترقی کے ساتھ ہوتا ہے۔

سوال خواہشوں اور ضرورتوں کا فرق مثالوں سے واضح کیجیے؟

جواب ایک بچے کو دیکھیں، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے جس کی جو چیز پسند آئے لے لے۔ لیکن اس کی کسی چیز کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ پھر اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ماں صرف اس کی ہو، کسی اور بہن بھائی کی نہ ہو۔ ایک لڑکے کو دیکھیں۔ اس کی ساری دلچسپی کھیلنے، سیر و تفریح کرنے میں یا بے مقصد گھومنے پھرنے میں ہوتی ہے لیکن اسے تعلیم، ڈسپلن، کیریئر جیسی ضرورتوں کا اتنا اور اس طرح شعور نہیں ہوتا جتنا اس کے والدین کو ہوتا ہے۔ اس طرح بعض نوجوان انہی فطری خواہشوں کے جال میں اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ انہیں اپنے کیریئر کی ضرورتوں کا خیال نہیں رہتا۔ خواہشوں اور ضرورتوں میں تمیز کرنا اور دونوں کا حق ادا کرنا تہذیبی زندگی کا اہم تقاضا ہے۔



اخلاقی جرأت

جرأت تین قسم کی ہوتی ہے۔ جسمانی، ذہنی اور اخلاقی۔

سوال جسمانی جرأت سے کیا مراد ہے؟

جواب جب بندہ جسمانی تکلیف یا خطرہ کو حوصلہ سے برداشت کرے تو یہ جسمانی جرأت (یا فزیکل کریج) ہے۔

سوال ذہنی جرأت کیا ہوتی ہے؟

جواب اگر کوئی اپنی رائے یا فیصلہ کی غلطی کو تسلیم کرے اور اسے اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائے۔ اپنی رائے یا طریق کار کو تبدیل کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے تو یہ ذہنی جرأت ہو گی۔

سوال اخلاقی جرأت کا مطلب کیا ہے؟

جواب اپنی غلطی ماننا، اپنے جرم کا اعتراف کرنا، اور اس کی سزا بھگتنے کے لیے از خود تیار ہو جانا، اپنے وعدے یا عہد کو ہر قیمت پر نبھانا، سچ بولنا، صحیح گواہی دینا خواہ اس سے فائدہ ہو یا نقصان، اخلاقی جرأت کی مثالیں ہیں۔ اخلاقی جرأت کریکٹر کی جان ہے۔ جس میں اخلاقی جرأت (مارل کریج) نہ ہو وہ کیریکٹر سے بھی عاری ہوتا ہے۔



غیبت

پیٹھ پیچھے کسی کی بُرائی کرنے کو غیبت کہتے ہیں۔ غیبت کرنا کردار کی کمزوری بھی ہے اور حماقت بھی۔

سوال وضاحت کیجیے کہ غیبت کردار کی کمزوری کس طرح ہے اور حماقت کس طرح؟

جواب غیبت کردار کی کمزوری اس طرح ہے کہ اگر کسی میں آپ کو کوئی بُرائی نظر آتی ہے تو اس کی اصلاح کی صورت نکالیے۔ اگر آپ میں ایسا کرنے کی اخلاقی جرأت نہیں ہے تو یہ آپ کے اپنے کردار کی کمزوری ہے۔ احساس کمتری کا شکار آدمی سب سے زیادہ غیبت کرتا ہے۔ چونکہ وہ سامنے آ کر مقابلہ کرنے یا وار کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا اس لیے چھپ کر وار کرتا ہے اور یوں اپنی دشمنی یا نفرت کا بزدلانہ اظہار کرتا ہے۔ غیبت کی بدترین صورت یہ ہے کہ سامنے خوشامد، پیچھے بُرائی۔ لاحول ولا قوۃ، یہ کمینگی کی انتہا ہے۔ ایسے شخص کی قسمت میں عزت کی زندگی ہی نہیں ہوتی۔

سوال غیبت حماقت کس طرح ہے؟

جواب وہ اس طرح کہ جس کی غیبت کی جائے، اس کو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بیشتر صورتوں میں تو اسے خبر ہی نہیں ہوتی کہ کون کہاں اس کے خلاف زہر اُگل رہا ہے۔ وہ چین کی نیند سوتا ہے اور اپنے معمول کے کام جاری رکھتا ہے لیکن جو غیبت کرتا ہے وقت تو اس سے ضائع ہوتا ہے، توانائی تو اس کی صرف ہوتی ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ کوئی تعمیری کام کرے وہ اپنے آپ کو الجھائے رکھتا ہے اور اپنا اعتبار اور سکون، دونوں کھو دیتا ہے۔ یہ حماقت نہیں تو کیا ہے؟ غیبت کرنے والا عموماً جھوٹا، نالائق، ناکام اور بُزدل ہوتا ہے۔

سوال پھر اس مسئلہ کا کیا حل ہے؟

جواب یہ کہ جتنی جلدی ہو سکے انسان یہ عہد کرے، یہ اصول بنائے کہ جو ہو سو ہو، مجھے غیبت کرنے کی ذلالت اور حماقت نہیں کرنی۔ حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ’’تکلیف اٹھانا ذلت اٹھانے سے بہتر ہے۔‘‘

ضمیر کی چبھن

انسان اچھا نہیں بنتا نہ بنے۔ لیکن اچھائی کے احساس کو دل سے نوچ پھینکنے پر بھی اسے قدرت حاصل نہیں۔ بھٹکے ہوئے دل میں کھٹک باقی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بُرے سے بُرا آدمی بھی پہلے بُرائی کا جواز ڈھونڈتا ہے، پھر بُرائی کا ارتکاب کرتا ہے۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ بُرائی کو بُرائی سمجھ کر کرنا انسان کے لیے ممکن ہی نہیں۔ انسان سب چوٹیں سہہ سکتا ہے لیکن ضمیر کی چبھن اس سے نہیں سہی جاتی۔

دل میں کس نے جھانکا ہے

دل میں کس نے جھانکا ہے۔ ضمیر کو کس نے دیکھا ہے۔ تمہیں کیا خبر ہے کہ اندر سے کوئی کیا ہے۔ چپکے چپکے آہستہ آہستہ اس کے دروں میں کون سی تبدیلی آ رہی ہے۔ جو تمہیں باہر سے نظر نہیں آتی۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں کہ تم ہر ایک سے پُر امید رہو۔ اس وقت بھی امید کے ٹمٹماتے ہوئے دیئے سے آس لگائے رکھو جب دوسرے اندھیرے سے ہار کر دل چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ تم بیج ڈالتے رہو، جس راہ سے گزرو۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ نتیجے کی فکر نہ کرو۔ وہ تمہاری ذمہ داری نہیں۔

خیر جاریہ اور شر جاریہ

اچھے بُرے لوگ مر جاتے ہیں لیکن ان کے اچھے بُرے کام نہیں مرتے۔ دونوں کے اچھے بُرے اثرات باقی رہتے ہیں۔ جس طرح خیر جاریہ ہوتا ہے اسی طرح شر جاریہ بھی

ہوتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ ہمیں خاص طور پر ایسی بُرائیوں سے بچائے جن کے اثرات دیر تک باقی رہ سکتے ہوں۔

جسمانی توانائی

وقت کی طرح انسان کی جسمانی اور ذہنی توانائی بھی از خود خرچ ہوتی ہے۔ آپ جسم سے، دماغ سے، صحیح کام لیں، غلط کام لیں یا کوئی کام نہ لیں، یعنی سستی اور کاہلی ہی میں وقت گزار دیں، جسمانی و ذہنی توانائی کو از خود خرچ ہوتے ہی رہنا ہے۔ اس لیے وقت کی طرح توانائی کی بھی قدر کرنا چاہیے۔ قدر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جسمانی و ذہنی توانائی کو بہت احتیاط سے اپنی زندگی کی ترجیحات کے مطابق صرف کیا جائے۔ زمانہ طالب علمی میں اپنے وقت اور توانائی کو غیر ترقیاتی مشغلوں کی بھینٹ چڑھا دینا اپنے مستقبل کی تباہی کو خود دعوت دینا ہے۔ بعض بڑے ذہین، ہوشیار باصلاحیت لوگ زندگی کی دوڑ میں محض اس لیے پیچھے رہ جاتے ہیں کہ وہ تعلیم و ترقی کے ان بہترین مواقع سے جو انہیں میسر تھے اور اپنی جسمانی و ذہنی توانائیوں سے بروقت کام نہ لے سکے۔ کام کرنے، محنت کرنے، ترقی کرنے کا زمانہ انہوں نے سستی، کاہلی، لاپرواہی، غلط ترجیحات یا والدین کی دولت یا عہدہ پر اکڑنے میں ضائع کر دیا۔



صحت و تندرستی

سوال صحت کی کیا اہمیت ہے؟

جواب صحت یا تندرستی کامیاب زندگی کی شرط ہے۔صحت کے بغیر لکھنا پڑھنا ممکن ہے نہ کھیلنا۔اگر صحت خراب ہوتو ذہن بھی صحیح طور پر کام نہیں کرتا۔

سوال صحت کی کتنی قسمیں ہیں؟

جواب صحت کی تین قسمیں ہیں۔

سوال کون کون سی؟

جواب جسمانی صحت، ذہنی صحت اور روحانی صحت، اور تینوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

سوال جسمانی صحت یا تندرستی کے بنیادی اصول کیا ہیں؟

جواب جسمانی صحت کے تین اصول ہیں۔

سوال کون سے؟

جواب پاکی (Purity) یا صفائی، تواتر (Regularity) اور اعتدال (Moderation)۔

سوال پاکی یا صفائی کا مطلب کیا ہے؟

جواب پاکی یا صفائی کا مطلب ہے کہ ہر چیز پاک و صاف ہو، جسم پاک و صاف ہو، ذہن پاک و صاف ہو، کپڑے، لباس، جگہ پاک و صاف ہو، ہوا جس میں ہم سانس لیں، پانی جو ہم پئیں، غذا جو ہم کھائیں غرض ہر چیز پاک و صاف ہو۔ پاکی اور صفائی تندرستی کا پہلا بنیادی اصول ہے۔

سوال تواتر سے کیا مراد ہے؟

جواب تواتر (Regularity) کا مطلب ہے کہ جو کام بھی کیا جائے اپنے وقت پر تسلسل سے کیا جائے۔

سوال یعنی؟

جواب یعنی یہ کہ کھانے پینے، کام کرنے، سونے، کھیلنے یا پڑھنے لکھنے کا جو مناسب وقت ہے، ہر روز اس کی پابندی کی جائے۔ وقت بے وقت کھانا پینا، کھیلنا، سونا حتیٰ کہ وقت بے وقت پڑھنا بھی صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔

سوال صحت کا تیسرا اُصول کیا ہے؟

جواب صحت کو قائم رکھنے کا تیسرا اصول وہی ہے جس کا حکم رسولِ پاک صاحبِ لولاک ﷺ نے دیا۔ یعنی **خیر الامور اوسطھا** یعنی ہر کام میں توازن، اعتدال سے کام لیا جائے۔ بہت کم نہ بہت زیادہ۔ ایک انتہا نہ دوسری۔

سوال مثلاً؟

جواب مثلاً یہ نہیں کہ ہر وقت پڑھنا ہی پڑھنا ہے، آرام نہ تفریح، کھیل نہ ڈھنگ سے کھانا پینا۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ دن رات کھیل ہی کھیل، ٹی وی ہی ٹی وی، سونا یا کھانا ہی کھانا، Living habit میں بھی اعتدال ہونا چاہیے۔

Moderation is the Law.



مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

بانگ درا میں جواب شکوہ کے بعد تین شعروں کا ایک قطعہ درج ہے، بعنوان ''ساقی'' زیر بحث موضوع اس قطعہ کے پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ ہے۔

؎ نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

ساقی کا لفظ یہاں ایک علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جس کسی کے ہاتھ میں جس صورت میں بھی اقتدار ہے، اختیار ہے، لیڈر شپ ہے، قیادت ہے، وہ ساقی ہی ہے۔ استاد علم کے پیاسوں کی پیاس بجھاتا ہے۔ وہ معلم ہونے کے ساتھ ساتھ مربی بھی ہوتا ہے۔ اس کا ایک کام تربیت کرنا بھی ہے۔ اس لحاظ سے استعارہ میں اسے ساقی بھی کہا جا سکتا ہے۔ اب کسی لیڈر، کسی صاحب اختیار، کسی ساقی کی ایک کمزوری یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ انسان کام کر کے اپنی دکان چمکائے۔ بڑھے ہوؤں کو آگے بڑھائے۔ جن کاموں میں محنت کی ضرورت کم لیکن نمود کی گنجائش زیادہ ہو وہ ان پر زیادہ توجہ دے۔ اس رویے کو شاعر نے، ''نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے''، کہا ہے۔ کبھی کبھی بعض استاد بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر اس کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں اور چند فطری طور پر تیز ذہن اور پُر اُمنگ طلبا کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتے ہیں۔ وہ ان معدودے چند طلبا کی ذاتی ذہانت و کارکردگی سے جس کو چمکانے میں ان کا اپنا حصہ زیادہ نہیں ہوتا، سکول کی اور اپنی دکان چمکانے کا کام لیتے ہیں۔ یہی نشہ پلا کے گرانا ہے لیکن:

ع مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

یعنی استاد گرتے ہوؤں کو، جھجک، احساس محرومی اور احساس کمتری کے مارے ہوؤں کو اٹھائے اور جن کی صلاحیتیں بے توجہی کی منوں مٹی کے نیچے دبی پڑی ہیں، آگے بڑھ کر سہارا دے۔ انہیں اپنی توجہ و تربیت کا مرکز بنائے اور اپنی محبت و محنت سے ان کے چھپے ہوئے جوہروں کو ابھارے۔ خدمت تو یہ ہے۔ اصل کام تو یہ ہے۔ ورنہ نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے۔

جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

راہ کے کانٹوں کو چار و ناچار برداشت کرنا ایک بات ہے اور ان کو دیکھ کر خوش ہونا اور بات ہے اور بڑے حوصلے کی بات ہے۔

ع جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

وہی کہہ سکتا ہے جسے اپنے زورِ بازو پر، اپنی قوت برداشت پر، اپنے عزمِ سفر پر اعتماد ہو اور بھرپور اعتماد ہو اور یہ خطر پسندی اور یہ ذوقِ سخت کوشی ہی زندگی میں کامیابی کی ضمانت ہے۔

ے چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے



قتلِ حُسین رضی اللہ عنہ اصل میں مرگِ یزید ہے

یہ مولانا محمد علی جوہر کے ایک شعر کا پہلا مصرعہ ہے۔ دوسرا مصرعہ بھی کم معروف نہیں۔

ع اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اس شعر میں حسین رضی اللہ عنہ اور قتلِ حسین رضی اللہ عنہ یہ دونوں الفاظ علامت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ جس طرح تلوار علامت ہے جنگ کی۔ قلم علامت ہے علم کی، شمع علامت ہے روشنی کی، مینار علامت ہے مسجد کی، اور مسجد علامت ہے اسلام کی۔ اسی طرح حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ علامت ہیں مزاحمت کی۔ ظلم سے ٹکر لینے کی، حق و صداقت سے ہر قیمت پر وفاداری کی۔ ایک عظیم مقصد سے مکمل وابستگی کی اور قتلِ حسین رضی اللہ عنہ علامت ہے اس بات کی کہ ایک مقصد کے لیے اپنی مرضی سے، حوصلے سے جان بھی دینا پڑتی ہے۔ اپنا سب کچھ لٹانا پڑتا ہے۔ مال و دولت دنیا اور رشتہ و پیوند سے اونچا بھی اٹھنا پڑتا ہے۔

قتلِ حسین رضی اللہ عنہ اس بات کا اشارہ بھی ہے کہ حق و صداقت کی بظاہر ہار بھی ہوتی ہے۔ اسے ظاہری مظلومی و بے بسی سے دو چار بھی ہونا پڑتا ہے لیکن یہ سب ظاہری تماشا ہوتا ہے، عارضی۔ اصل میں ''یزید'' مرتا ہے، ہار ظالم کی ہوتی ہے۔ جابر ہی آخر میں خوار ہوتا ہے۔ یہ زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے۔ یزید اور اس کے حواریوں کا عبرت ناک انجام تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔

ع مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

قتلِ حسین رضی اللہ عنہ کے کچھ عرصے بعد ہی بنی اُمیہ کو بنو عباس نے کس طرح بیخ و بن

سے اکھیڑا۔ وہ داستان کسے یادنہیں۔ وہ انجام تو جان و مال کے اعتبار سے تھا۔ جو ذلت یزید کا مقدر ہوئی وہ بھی قابلِ غور ہے۔ شاعر نے دوسرے مصرعہ

ع اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

میں پہلے مصرعہ کے تصور کو آگے بڑھایا ہے۔ اس مصرعہ میں ہر کربلا کا لفظ توجہ چاہتا ہے۔ یہاں کربلا بھی علامت ہے آزمائش کی، ابتلا کی، شدید ترین امتحان کی، سخت ترین دباؤ کی۔ تو مطلب یہ ہوا کہ کربلا سے ڈرنا نہیں چاہیے، پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ کربلا کی ظاہری بربادی، ظاہری نقصان سے بد دل یا مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی طرح بڑی سے بڑی قربانی دینے سے ہچکچانا نہیں چاہیے۔ حق وصداقت کی راہ میں بظاہر جو ہار ہوتی ہے وہی آخرکار جیت اور کامیابی کی نشانی بن جاتی ہے۔

آخر میں عرض کروں گا کہ ہر آدمی کی اپنی کربلا ہوتی ہے۔ زندگی میں کبھی نہ کبھی اندر کے یا باہر کے کسی نہ کسی یزید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر آدمی کے سامنے کسی نہ کسی شکل میں وہ سوال، وہ مسئلہ آن کھڑا ہوتا ہے جو یزید کی شکل میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے سامنے تھا۔



زہر کا پیالہ

(تلاشِ حق کی آزمائش)

اچھے بُرے لوگ مر جاتے ہیں لیکن ان کے اچھے بُرے کام نہیں مرتے۔ دونوں کے اچھے بُرے اثرات باقی رہتے ہیں۔ جس طرح خیر جاریہ ہوتا ہے اسی طرح شر جاریہ بھی ہوتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ ہمیں خاص طور پر ایسی بُرائیوں سے بچائے جن کے اثرات دیر تک باقی رہ سکتے ہوں۔

ایسا اچھا کام جو مثال بن جائے، جس سے دوسروں کی راہیں روشن ہوں، بہت بڑی سعادت ہے، جو کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔ تاریخ میں ایسا روشن نام سقراط کا ہے۔ قدیم یونان کے اس درویش صفت فلسفی نے اپنی ساری زندگی سچائی کی تلاش اور سچائی کی ترویج میں گزار دی اور آخر میں سچائی ہی کی خاطر زہر کا پیالہ پی لیا اور خوشی خوشی پی لیا۔

اس کو اس جرم میں زہر کا پیالہ پینے کی سزا سنائی گئی تھی کہ وہ نوجوانوں کو دیوتاؤں سے برگشتہ کرتا ہے اور تفکر و تدبر کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ چاہتا تو جیل خانہ سے بھاگ بھی سکتا تھا۔ اس کے دوستوں اور عقیدت مندوں نے اس کے فرار کا منصوبہ تیار کر لیا تھا لیکن اس نے کہا:

''میں اپنی ریاست کے قانون کا احترام کرنا چاہتا ہوں، سچائی کے لیے جان دینا، سچائی کے لیے بھاگ جانے سے بہتر ہے۔''

زہر کا پیالہ اب علامت ہے اس تکلیف کی، اس قربانی کی، اس ایثار کی، جو سچائی کے لیے، بھلائی کے لیے، دیانت کے لیے ہر بھلے اور اچھے آدمی کو دینی پڑتی ہے۔ ہر دور میں، ہر عہد میں، ہر جگہ کسی نہ کسی کو سقراط بننا پڑتا ہے اور زہر کا پیالہ پینا پڑتا ہے۔ یہ کام مشکل ہے اور بہت مشکل ہے لیکن جو زہر کا پیالہ پی لیتا ہے، وہ امر بھی ہو جاتا ہے۔ جو شخص ہنسی خوشی ایک اچھے کام کے لیے مشقتیں اٹھا لیتا ہے، اذیتیں برداشت کر لیتا ہے، دُکھ جھیل لیتا ہے، وہ کندن بن جاتا ہے۔ بلکہ پارس ہو جاتا ہے۔ ایسا کہ جو اس سے مس ہو جائے وہ بھی سونا بن جائے۔

مولانا محمد علی جوہر کا شعر ہے:

؎ قتلِ حسین رضی اللہ عنہ اصل میں مرگِ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ہر کربلا کے لفظ سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ کربلا بھی ایک علامت ہے۔ کربلا سچائی کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کی علامت ہے۔ ہر انسان کی اپنی کربلا ہوتی ہے۔ اپنا زہر کا پیالہ ہوتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے جب اسے سچائی کے لیے، روشنی کے لیے ایک کٹھن اور پُرخطر راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جو شخص اس کربلا میں اُترنے، یہ زہر کا پیالہ پینے کا حوصلہ رکھتا ہے وہی نوجوان قبیلہ کی آنکھ کا تارا ہوتا ہے۔



عدل

سوال عدل کس زبان کا لفظ ہے؟

جواب عدل عربی زبان کا لفظ ہے۔

سوال عدل کے لیے اُردو لفظ کیا ہے؟

جواب انصاف۔

سوال کیا دونوں لفظوں کے معنی ایک ہی ہیں؟

جواب جی نہیں۔

سوال پھر کیا فرق ہے؟

جواب عدل کا لفظ عربی میں بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

سوال مثلاً؟

جواب عربی میں عدل چار معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ توازن، انصاف، برابری اور بدلہ۔

سوال کیا عدل کا لفظ قرآن حکیم میں استعمال ہوا ہے؟

جواب جی ہاں! عدل کا لفظ قرآن حکیم میں ان چار معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

سوال کیا قرآن حکیم میں عدل کے لیے کوئی اور لفظ بھی استعمال ہوا؟

جواب قرآن حکیم میں عدل کے معنوں میں دو اور الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔

سوال وہ دو لفظ کیا ہیں؟

جواب قرآن میں ''میزان'' اور ''قسط'' کے الفاظ بھی عدل ہی کے مفہوم میں استعمال

ہوئے ہیں۔

سوال میزان کے کیا معنی ہیں؟

جواب میزان کے معنی ہیں ترازو، تولنا، برابر، توازن۔

سوال قرآن کریم میں وہ کون سی آیات ہیں جن میں عدل کا ذکر ہے؟

جواب قرآن حکیم میں عدل کا ذکر بہت سی آیات میں آیا ہے۔

سوال مثلاً؟

جواب مثلاً ایک آیت ہے:

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ.

ترجمہ: ''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں۔''

سوال مجھے، سے کون مراد ہے؟

جواب مجھے، رسول اللہ ﷺ کے لیے آیا ہے۔

سوال تو اس آیت کا کیا مطلب ہوا؟

جواب اس آیت میں اللہ جل شانہٗ نے رسول ﷺ سے فرمایا کہ آپ ﷺ لوگوں میں عدل کریں۔

سوال یہ آیت کس سورۂ مبارکہ کی ہے؟

جواب یہ آیت سورۂ شوریٰ کی ہے۔

سوال کون سی؟

جواب دسویں۔

سوال اس آیت کا مطلب کیا ہے؟

جواب اس آیت کا مطلب ہے جس کسی کو جس پوزیشن میں جو فیصلہ کرنے کا جتنا اختیار ہے وہ انصاف کے ساتھ کرے۔

سوال عدل کے بارے میں کوئی اور آیت ہے؟

جواب عدل کے بارے میں ایک اور آیت ہے۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا.

ترجمہ: ''اور جب تم بولو تو عدل کی بات بولو۔''

سوال یہ آیت کس سورۂ مبارکہ کی ہے؟

جواب سورۂ انعام کی۔

سوال کون سی؟

جواب سورۂ انعام کی آیت نمبر 152 ہے۔

سوال اس آیت کا مطلب کیا ہے؟

جواب اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بات بھی منہ سے نکلے وہ سچی اور صحیح ہو۔ The whole truth۔ خاص طور پر جب کوئی گواہی دی جا رہی ہو۔ اس آیت کا دوسرا ٹکڑا ہے:

وَ لَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی.

سوال تو پوری آیت کا کیا مطلب ہے؟

جواب جو کہو سچ کہو، دوستی، دشمنی اپنے غیر کا لحاظ کیے بغیر۔

سوال عدل کا احسان سے کیا تعلق ہے؟

جواب بہت گہرا تعلق ہے۔ عدل سماجی زندگی کی بنیادی شرط ہے۔ عدل کے بغیر نہ آپس کے تعلقات قائم رہ سکتے ہیں نہ سماجی ادارے موثر طریقے سے کام کر سکتے ہیں۔ لیکن صرف عدل ہی کافی نہیں، عدل معاشرے کی بنیاد ہے تو احسان اس کا جمال و کمال۔ اس لیے اللہ جل شانہٗ نے عدل کے ساتھ ساتھ احسان کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔

سوال وہ آیت کون سی ہے؟

جواب وہ آیت ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ.

ترجمہ: ''بے شک اللہ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔''

سوال یہ آیت کس سورۂ مبارکہ کی ہے؟

جواب سورۂ النحل کی۔

سوال کون سی؟

جواب آیت نمبر 90۔

سوال عدل کا ترازو سے کیا تعلق ہے؟

جواب قرآن حکیم میں عدل اور میزان یعنی توازن ایک ہی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔

سوال مثلاً؟

جواب وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانِ ، اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِيْزَانِ.

سوال اس کا ترجمہ؟

جواب ''اس نے آسمان کو بلند کیا اور میزان قائم کر دی۔ اس کا تقاضا ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو۔''

سوال یہ آیت کس سورۂ مبارکہ میں ہے؟

جواب یہ آیت سورۂ رحمٰن میں ہے۔

سوال کون سی؟

جواب آیت نمبر 8۔

سوال اس آیت:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانِ ، اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِيْزَانِ.

کا مطلب کیا ہے؟

جواب اس آیت کے دو حصے ہیں:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانِ.

اس کا مطلب ہے کہ اس نے یعنی اللہ جل شانہٗ نے آسمان کو بلند کیا اور میزان قائم کر دی۔ دوسرے حصے میں:

اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِيْزَانِ.

کے معنی ہیں کہ تم اس میزان میں خلل نہ ڈالو۔

سوال پوری آیت کا اصل مقصد کیا ہے؟

جواب اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام میزان و عدل یعنی توازن پر قائم کیا ہے اور چاہتا ہے کہ اس میزان و عدل کو انسانی زندگی میں ملحوظ رکھا جائے۔

سوال ہماری روزانہ کی زندگی میں اس آیت کا اطلاق کیسے ہوگا؟

جواب اپنے ساتھ انصاف اور دوسروں کے ساتھ انصاف کرنے سے۔

سوال اپنے ساتھ انصاف سے کیا مراد ہے؟

جواب اپنے ساتھ انصاف سے مراد ہے کہ خدا نے ہمیں جو صلاحیتیں عطا کی ہیں ان کو بروئے کار لائیں۔ اپنی توانائی اور وقت کا ضیاع نہ کریں۔ کھانے، پینے، کھیلنے، آرام کرنے اور پڑھنے لکھنے میں اعتدال سے کام لیں۔ ہر کام میں افراط وتفریط دونوں انتہاؤں سے بچیں۔

سوال دوسروں سے انصاف سے کیا مراد ہے؟

جواب جو حق جس کا ہے اس کو دیں۔ کسی کے ساتھ بھی کسی موقع پر زیادتی نہ کریں۔ عدل کے بغیر کوئی رشتہ، کوئی تعلق، کوئی ادارہ، کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔



احسان

سوال احسان کا کیا مطلب ہے؟

جواب احسان کا مطلب ہے کسی کے ساتھ ایسی بھلائی کرنا جو اس کا حق نہ ہو اور کرنے والے کا فرض نہ ہو۔

سوال کیا فرض اور احسان میں فرق ہے؟

جواب جی ہاں، بہت واضح فرق ہے۔

سوال کیا؟

جواب جو کام قانونی طور پر یا اخلاقی طور پر ضروری ہے وہ فرض ہے لیکن جو بھلائی، جو خدمت اپنی مرضی سے اختیاری طور پر بغیر کسی Obligation کے کی جائے وہ احسان ہے۔

سوال کیا خدمت اور احسان میں فرق ہے؟

جواب جی ہاں، خدمت اور احسان میں بھی باریک سا فرق ہے۔

سوال کیا؟

جواب ہوسکتا ہے کہ کوئی خدمت فرض بھی ہو۔ اس صورت میں جہاں فرض کی خدمت کی حد ختم ہوتی ہو اس سے آگے اپنی مرضی سے جو خدمت کی جائے وہ احسان ہے۔
احسان کرنا بہت بڑی بات ہے۔

سوال جو احسان کرے اسے کیا کہتے ہیں؟

جواب جو احسان کرتا ہے اسے محسن کہتے ہیں۔ سب سے بڑا محسن خود اللہ تعالیٰ ہے، جو رحمان اور رحیم ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے قرآن مجید میں بار بار احسان کرنے کی

تاکید کی ہے۔

سوال مثلاً؟

جواب مثلاً:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۔ (سورۃ البقرۃ، آیت:195)

وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۔ (سورۃ آل عمران، آیت:134)

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ۔ (سورۃ التوبہ، آیت:120)

سوال ترجمہ؟

جواب ترجمہ:

''بے شک اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ یقیناً اللہ احسان کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔''

سوال احسان کے موضوع پر کوئی حدیث مبارکہ؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

''مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ خدا کے نزدیک بہترین انسان وہ ہے جو خدا کے کنبے کے ساتھ احسان کرتا ہے۔''

سوال احسان کا احسان کرنے والے پر کیا اثر پڑتا ہے؟

جواب بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔

سوال کیسے؟

جواب جو خوشی احسان کرتے وقت ہوتی ہے وہ خوشی اس خوشی سے بدرجہا زیادہ ہوتی ہے جو محض فرض ادا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ جو احسان کرتا ہے وہ بہت مطمئن رہتا ہے۔ خدمت میں اور احسان میں بڑی طاقت ہوتی ہے جو خدمت کرتا ہے یا احسان کرتا ہے وہ اپنے آپ کو بہت مضبوط محسوس کرتا ہے۔ جو احسان کرتا ہے اس کی لوگ عزت ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے لیے جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بے لوث احسان کرنے کا سب سے زیادہ فیض آخرکار خود اس کو پہنچتا ہے جو احسان کرتا ہے۔



برداشت

سوال: برداشت کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟

جواب: برداشت کے لیے انگریزی لفظ Tolerance ہے۔

سوال: Tolerance کی کتنی قسمیں ہیں؟

جواب: Tolerance کی تین قسمیں ہیں۔

سوال: کون کون سی؟

جواب: پہلی Physical Tolerance دوسری Social Toleracne، تیسری Intellectual Tolerance۔

سوال: Physical Tolerance کا کیا مطلب ہے؟

جواب: Physical Tolerance کا مطلب ہے کہ انسان کے اندر اتنی قوت مدافعت Resistance ہو کہ وہ معمولی تکلیفوں، عام بیماریوں، روزمرہ کے جذباتی دباؤ، Stresses اور Tensions کو حوصلے سے برداشت کر سکے۔

سوال: کیا جسمانی قوت برداشت کا تعلق ذہن سے بھی ہے؟

جواب: جی ہاں، برداشت کا تعلق بڑی حد تک ذہن سے ہے۔ جس چیز کو ہم ذہنی طور پر قبول کر لیتے ہیں یا جس چیز کی ضرورت یا اہمیت کے بارے میں ہم ذہنی طور پر Convince ہو جاتے ہیں اسے جسمانی طور پر برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ Physically Tough ہونے کے لیے Mentally Tough ہونا ضروری ہے۔ زندگی کی دوڑ میں Soft اور ضرورت سے زیادہ Sensitive انسان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

سوال: Social Tolerance کیا ہے؟

جواب: چھوٹے بڑے ہر سوشل گروپ میں سمجھ دار اور ناسمجھ، شائستہ اور بدتمیز، ہمدرد اور

حاسد، خوش مزاج اور بدمزاج، صلح پسند اور جھگڑالو، غرض ہر Personality Pattern کے لوگ ہوتے ہیں۔

سوال اس فرق کی وجہ؟

جواب ذہانت اور مزاج کا فرق Built-in یعنی فطری ہوتا ہے۔ البتہ عادتوں اور Manners کا فرق اکثر و بیشتر گھریلو ماحول اور ابتدائی تربیت کی وجہ سے پایا جاتا ہے۔

سوال پھر Social Tolerance کیا ہے؟

جواب اپنے آپ سے مختلف لوگوں کو صبر و تحمل سے برداشت کرنے اور ان کے ساتھ ضرورت کی حد تک Adjust کرنے کا نام Social Tolerance ہے۔

سوال اس کی کیا اہمیت ہے؟

جواب Social Tolerance سماجی زندگی کی پہلی ضرورت ہے۔ کوئی سوشل گروپ انفرادی اختلاف کو خوش دلی سے برداشت کیے بغیر کارگر نہیں ہوسکتا۔

سوال Intellectual Tolerance کا کیا مطلب ہے؟

جواب جس طرح ایک سوشل گروپ میں ذہانت، مزاج اور عادات کا فرق ہوتا ہے اسی طرح اس گروپ میں رنگ، ذات، نسل، زبان، عقیدہ، مذہب، علاقہ اور کلچر کا فرق بھی ہوسکتا ہے۔ ایک بڑے سوشل گروپ میں تو ان میں سے ایک سے زیادہ چیزوں کا مختلف ہونا کم و بیش یقینی سی بات ہے۔ اس صورت میں Intellectual Tolerance کا تقاضا ہے کہ گروپ کے لوگ اس قسم کے ہر فرق کو بنیادی انسانی حقوق Fundamental Human Rights کے طور پر قبول کریں۔ ہر قسم کے رابطوں اور معلومات کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے دیں۔

سوال اگر اس قسم کی Tolerance نہ ہو تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

جواب اگر کسی معاشرہ میں Social اور Intellectual Tolerance نہ ہو تو ایسا معاشرہ مسلسل اندرونی کشمکش اور Tension کی وجہ سے بہت جلد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔ پاکستان جیسے جمہوری ملک کی بقا اور ترقی کا انحصار جہاں نسل، زبان، عقیدہ، علاقہ اور کلچر کا فرق کسی نہ کسی شکل میں ہر جگہ موجود ہے، بڑی حد تک رواداری اور ایک دوسرے کی برداشت پر ہے۔

صبر

سوال: صبر کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟

جواب: صبر کے لیے انگریزی لفظ Patience ہے۔

سوال: صبر کیا ہے؟

جواب: کسی تکلیف کو سہنا، کسی زیادتی کو برداشت کرنا، ثابت قدمی، صبر ہے۔

سوال: کیا درگزر کرنا بھی صبر ہے؟

جواب: کسی تکلیف کو سہنا، کسی کی زیادتی کو معاف کرنا، بدلہ لینے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی بدلہ نہ لینا صبر ہے بلکہ اصل صبر یہی ہے۔ صبر و تحمل دوستی، رشتہ داری بلکہ ہر قسم کے قریبی تعلقات کی ضمانت ہے۔

سوال: کس طرح؟

جواب: دوستی میں، رشتے داری میں اونچ نیچ تو ہوتی رہتی ہے۔ کبھی ایک طرف سے کبھی دوسری طرف سے۔ اگر ایسے موقعوں پر صبر و تحمل اور درگزر سے کام نہ لیا جائے تو دوستی ہو یا رشتہ داری، زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی۔

مختصر یہ کہ ہر قسم کے قریبی تعلقات صبر و تحمل سے باقی رہتے ہیں اور عفو و درگزر سے مستحکم ہوتے ہیں۔ جھگڑالو، بدمزاج اور حاسد انسان کو دوست تو دوست اپنے بہن بھائی بھی پسند نہیں کرتے۔

میزبان: صبر میں طاقت ہے۔

سوال: کس طرح؟

جواب: جو صبر کرتا ہے، جو برداشت کرتا ہے، جو Tolerate کرتا ہے، جو لڑتا جھگڑتا نہیں

وہ ذہنی دباؤ Tension کا شکار نہیں ہوتا۔ اس کی جسمانی اور ذہنی توانائی ضائع نہیں ہوتی۔ اس کا وقت بھی ضائع نہیں ہوتا۔ وہ صبر وشکر سے راضی بہ رضائے الٰہی اپنے کام میں لگا رہتا ہے اور آخرکار کامیاب ہوتا ہے۔صبر میں بڑی طاقت ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ.

اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔

میزبان: صبر سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔

Patience keeps You happy

سوال: کس طرح؟

جواب: ذہنی سکون کی وجہ سے، حق پر ہونے کی وجہ سے۔

میزبان: صبر کامیابی کی کنجی ہے۔

سوال: کس طرح؟

جواب: جنگ ہو یا امن، فرد ہو یا قوم، قوت برداشت ہی سے آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ Patience کسی کمزوری یا مجبوری کا نام نہیں۔قوت برداشت سے، زندگی کے سفر میں قدم قدم پر آزمائشوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو صبر سے کام لیتا ہے، جو تکالیف برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے وہ آخرکار کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

میزبان: صبر کا تعلق صحت سے بھی ہے۔

سوال: کس طرح؟

جواب: بے صبری سے، بے چینی سے، جسمانی اور ذہنی دباؤ یعنی Tension بڑھتا ہے اور صحت متاثر ہوتی ہے۔ جو صبر وشکر سے رہتا ہے، جس کو برداشت کی عادت ہوتی ہے، جو لڑتا جھگڑتا نہیں، وہ ذہنی طور پر بے چین نہیں رہتا، وہ ذہنی دباؤ کا شکار نہیں ہوتا۔ اس کی بھوک متاثر نہیں ہوتی۔ وہ آرام سے سوتا ہے۔ اس طرح صحت اچھی رہتی ہے۔



خدمت

سوال خدمت کا کیا مطلب ہے؟

جواب خدمت کا مطلب ہے کسی کے کام آنا، کسی کا کام کرنا یا کوئی ایسا کام کرنا جس سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔

سوال کیا کسی کا بھلا چاہنا بھی خدمت ہے؟

جواب جی ہاں! کسی کا بھلا چاہنا بھی خدمت ہے۔

سوال کیا کسی کو Encourage کرنا بھی خدمت ہے؟

جواب جی ہاں! کسی ساتھی یا کسی کلاس فیلو کو Encourage کرنا بھی خدمت کی ایک صورت ہے۔

سوال ایک مشہور مثل ہے ''خدمت میں عظمت ہے'' کیا یہ صحیح ہے؟

جواب جی ہاں! سو فیصد صحیح ہے۔

سوال کیسے؟

جواب خدمت کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ جو خدمت کرتا ہے آخر کار اسے بڑائی حاصل ہوتی ہے۔

سوال فارسی کی ایک مثل ہے ''ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد۔'' جس نے خدمت کی وہ مخدوم ہوا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب جو خدمت کرتا ہے اسے خادم اور جس کی خدمت کی جائے اسے مخدوم کہتے ہیں۔ فارسی کی اس مثل کا مطلب ہے کہ جو خدمت کرتا ہے آخر کار اس کی خدمت بھی کی

جاتی ہے۔

سوال کیا خدمت سے محبت حاصل ہوتی ہے؟

جواب یقیناً۔

سوال وہ کیسے؟

جواب جو خدمت کرتا ہے وہ خود بخود اچھا لگنے لگتا ہے۔ اسے اپنے اوپر Confidence بہت ہوتا ہے۔ اس کی Self-image روز بروز بہتر ہو جاتی ہے۔

سوال کیا خدمت میں طاقت ہے؟

جواب بلاشبہ خدمت بہت بڑی طاقت ہے۔ خاموش خدمت بڑی بڑی نفرتوں کو محبت میں بدل دیتی ہے۔ Devotion سے بڑے بڑے کارنامے انجام پاتے ہیں اور بڑے مشکل کام آسان ہو جاتے ہیں۔

سوال کیا خدمت میں مضبوطی ہے؟

جواب جی ہاں! خدمت میں سچائی کی طرح مضبوطی ہے۔ جو خدمت کرتا ہے وہ بہت مضبوط بن کر ابھرتا ہے۔

سوال کیا خدمت اور صحت کا کوئی تعلق ہے؟

جواب جی ہاں! جو خدمت کرتا ہے، جو محبت کرتا ہے، جو اپنے کام میں مگن رہتا ہے اس کی صحت اچھی رہتی ہے۔

سوال خودغرضی اور حسد کا صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟

جواب خودغرضی اور حسد سے جسمانی اور ذہنی صحت بُری طرح متاثر ہوتی ہے۔

سوال کیا خدمت میں کامیابی ہے؟

جواب بے شک خدمت میں کامیابی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ .

(سورۃ التوبہ، آیت:120)

خدمت وہ احسان ہے جو کبھی ضائع نہیں جاتا۔ جو خدمت کرتا ہے وہ زندگی کی ہر منزل میں ہر طرح کامیاب رہتا ہے۔



دوسرا حصہ

آوازِ دوست

(اقتباسات)

 عظمت کا راز

 انسان کی فطرت

 شکرِ عطا

 شکرِ والدین

 اہلِ شہادت و اہلِ احسان

عظمت کا راز

ان تمام پیغمبروں میں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ دو خوبیاں مشترک ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی زندگی دوسروں کی خدمت، راہنمائی اور اصلاح میں بسر ہوئی اور دوسرے ان کی طبیعت کا وہ استقلال جس کی وجہ سے وہ نہ تو ناکامی میں متزلزل ہوئے اور نہ کامیابی میں متکبر۔ یہ زندگیاں پامردی اور بے لوثی سے دوسروں کے لیے وقف رہیں۔ یہی ان کی عظمت کا راز ہے اور یہی ان کی زندگیوں سے حاصل ہونے والا سب سے بڑا سبق ہے۔

انسان کی فطرت

انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ بلندی کی طرف مائل بہ پرواز ہو، پستی میں وہ گرتا ضرور ہے مگر وہاں ٹھہر نہیں سکتا۔

شکر عطا

عطا کا پہلا حق یہ ہے کہ انسان اس کا شکر ادا کرے۔ دل شکر سے لبریز ہو تو روشن ہو جاتا ہے، شکوہ سنج ہو تو بجھ جاتا ہے، ناشکر گزار ہو تو پتھر بن جاتا ہے۔

شکرِ والدین

انسان ناشکر گزار، زود فراموش اور زود رنج ہے۔ اس لیے ہدایت ہوئی کہ خدا کو یاد کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ خدا نے والدین کا شکر ادا کرنے کی بھی تاکید کی ہے۔ گویا عبادت میں اور کسی کا ذکر داخل ہوا تو وہ شرک اور شکر میں جتنے حصے دار ہوں وہ جائز ہے۔



قبیلۂ فرہاد

یہ لوگ بھی عجیب ہیں۔ ان کو اس بات سے ہرگز دلچسپی نہیں کہ وہ یاد رکھے جائیں گے یا بھلا دیئے جائیں گے۔ غرض ہے تو صرف یہ کہ اس بے ڈھب دنیا کو کیونکر ڈھب پر لایا جا سکتا ہے۔ ان میں ہر شخص نے دُنیا کو جس حال میں پایا اس سے بہتر حال میں چھوڑا اور یہی بات انہیں عام آدمی سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ لوگ فرہاد کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان کی ساری زندگی پہاڑ کھودتے اور نہر نکالتے گزر جاتی ہے۔ اس نفسا نفسی کی دنیا میں جہاں ہر شخص صرف اپنے لیے زندہ ہے، یہ فرہادی گروہ دوسروں کے لیے زندگیاں لٹاتا ہے۔

یہ لوگ دنیا بھر کی مصیبتیں نقدِ حیات کے عوض خرید لیتے ہیں اور پھر بھی اس سودے میں انہیں خسارہ نہیں ہوتا۔ یہ گروہ نہ ہوتا تو دنیا غیر آباد ہوتی اور یہ گروہ ناپید نہ ہوا تو انسان مریخ میں بھی ایک نئی دنیا آباد کرے گا۔



اہلِ شہادت و اہلِ احسان

بعض انسانوں کی زندگی سے جرأت اور قربانی کا نشان ملتا ہے اور بعض اہل نظر سے حکمت اور خدمت کے معانی کا پتا چلتا ہے۔ پہلے گروہ کے لوگ شہید کہلاتے ہیں اور اس دوسرے گروہ میں جو لوگ شامل ہیں انہیں اہل احسان میں شمار کیا جاتا ہے۔ اہل شہادت اور اہل احسان میں فرق صرف اتنا ہے کہ شہید دوسروں کے لیے جان دیتا ہے اور محسن دوسروں کے لیے زندہ رہتا ہے۔ ایک کا صدقہ جان ہے تو دوسرے کا تحفہ زندگی۔ ایک سے ممکن وجود میں آتا ہے اور دوسرے سے اس وجود کو توانائی ملتی ہے۔

ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی ہوتا ہے جو اس توانا وجود کو تابندگی بخشتا ہے۔ جو لوگ اس آخری گروہ میں شامل ہیں انہیں اہل جمال کہتے ہیں۔

اہل جمال کی پہچان یہ ہے کہ یہ لوگ مسجد قرطبہ کی تعمیر کرتے ہیں اور تحریر بھی۔ یہ الحکم کی طرح بادشاہ بھی ہو سکتے ہیں اور اقبال کی طرح درویش بھی۔ انہیں تخلیقِ حسن پر مامور کیا جاتا ہے۔

نثر ہو کہ شعر، نقش ہو کہ نغمہ، رنگ ہو کہ خشت و سنگ، یہ خون جگر سے اسے یوں تمام کرتے ہیں کہ جو نظر ان کی تخلیق پر پڑتی ہے وہ روشن ہو جاتی ہے۔ اگر ان کی تخلیق میں حسن صورت ہے تو خود ان کی ذات میں بھی ایک حسن ہوتا ہے جسے حسنِ سیرت کہتے ہیں۔

حسن کی دولت اہل جمال کو اتنی وافر مقدار میں ملتی ہے کہ وہ اسے دوسروں میں تقسیم

کرتے پھرتے ہیں۔ یہ تقسیم ان کی زندگی کے بعد بھی جاری رہتی ہے اور اس کی بدولت بدی اور بدنمائی کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملتا۔

زندگی کو ایک گروہ نے ممکن بنایا، دوسرے نے توانا اور تیسرے نے تابندہ۔ جہاں یہ تینوں گروہ ہوں وہاں زندگی موت کی دسترس سے محفوظ ہو جاتی ہے اور جس ملک یا عہد کو یہ گروہ میسر نہ آئیں اسے موت سے پہلے بھی کئی بار مرنا پڑتا ہے۔

جس سرحد کو اہل شہادت میسر نہ آئیں وہ مٹ جاتی ہے۔جس آبادی میں اہل حسن نہ ہوں اسے خانہ جنگی اور خانہ بربادی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جس تمدن کو اہل جمال کی خدمات حاصل نہ ہوں، خوشنما اور دیرپا نہیں ہوتا۔ پاکستان کو اہل شہادت کی بھی ضرورت ہے اور اہل احسان و اہل جمال کی بھی۔



تیسرا حصہ

روشنی کے رُخ کے دریچے

(فکر انگیز مذاکرے اور فیچر)

(مذاکرے)

 جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

 سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

 اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

 صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گل بھی ہے

 کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

 تری خاک میں شرار زندگی نہیں ہے

 جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

 کامیاب کون ہے؟ ناکام کون ہے؟

 قوموں کا عروج و زوال

جوئے شیر و تیشہ وسنگ گراں ہے زندگی

میزبان: حضرات! آج کے مذاکرے کا موضوع ہے:
جوئے شیر و تیشہ وسنگ گراں ہے زندگی
سب سے پہلے میں رفیق صاحب کو اظہار خیال کی دعوت دیتا ہوں۔
رفیق:
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی
یہ مصرعہ اقبال رحمہ اللہ کی لافانی نظم ''خضر راہ'' سے ماخوذ ہے۔
شاعر کے سوال ''زندگی کا راز کیا ہے؟'' کے جواب میں خضر نے زندگی پر جو بھرپور اور پُرمغز تبصرہ کیا ہے، اس نظم کے چوتھے شعر کا یہ دوسرا مصرعہ ہے:

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

اقبال کے فلسفہ زندگی کو یہ نظم بڑی خوبصورتی سے بیان کرتی ہے اور اس نظم کی جان

زیر بحث مصرعہ ہے:

ع جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

میزبان: اب میں رفیع صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کو آگے بڑھائیں۔

اس مصرعہ میں زندگی کا پورا لائحہ عمل موجود ہے۔ زندگی کی پہلی حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک سنگ گراں ہے، ایک چیلنج ہے، ایک امتحان ہے۔

ے قلزم ہستی سے تو اُبھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

زندگی کی دوسری حقیقت یہ ہے کہ اس سنگ گراں میں جوئے شیر بھی خوابیدہ ہے۔ جوئے شیر استعارہ ہے زندگی کے بے انتہا تخلیقی اور ارتقائی امکانات سے۔

ع آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے

اور تیشہ استعارہ ہے سخت کوشی اور جانفشانی کی زندگی سے۔ تیشہ ہی سے اس سنگ گراں کو چیر کر جوئے شیر نکالی جا سکتی ہے۔

میزبان: آخر میں نعمان صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ صبر اور نوجوانوں کے حوالے سے موضوع زیر بحث پر کچھ روشنی ڈالیں۔

نعمان: طلبہ کے لیے زندگی سے مراد تعلیمی زندگی ہے۔ تعلیم ایک طویل اور صبر آزما عمل ہے جو پوری توجہ اور مسلسل جدوجہد چاہتا ہے۔ سخت کوشی کے رویے کے بغیر تعلیمی ترقی ممکن نہیں۔ جو یہ ''کوہ کنی'' کر لے، جس کے تیشہ کی ضرب کاری ہو، اس کا انعام بھی بہت ہے۔ جوئے شیر بھی اسی کو ملتی ہے۔

اُردو کے مشہور ادیب و مفکر رشید احمد صدیقی کا ایک بڑا خوبصورت اور فکر انگیز فقرہ ہے:

''زندگی آزمائش بھی ہے اور انعام بھی۔''

یہ قول بھی اسی حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ

''جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی''



سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

میزبان: حضرات! آج کے مذاکرے کا عنوان ہے:

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

سب سے پہلے میں نعمان صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کا آغاز کریں۔

نعمان: زیر بحث موضوع ''بالِ جبریل'' کے شعر

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

کا دوسرا مصرعہ ہے۔ بہتر ہو گا کہ پہلے اس کے الفاظ پر غور کیا جائے۔ تلخ زندگانی سے مراد یہ ہے کہ زندگی ایک کڑوی، کسیلی، مشکل، صبر آزما چیز ہے۔ اس کو سخت کوشی سے انگبیں یعنی انگور کے رس ایسا میٹھا یا خوشگوار بنایا جا سکتا ہے۔ اس پورے مصرعہ میں سخت کوشی کا لفظ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ سخت کوشی کو فکر اقبال میں ایک بنیادی تصور کی اہمیت حاصل ہے۔

میزبان: اس امر کی وضاحت کے لیے میں شفیق صاحب کو زحمت دوں گا؟

شفیق: ۱۹۰۵ء میں علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ یورپ گئے۔ یہ کوئی تفریحی دورہ نہ تھا۔ مطالعاتی سفر تھا۔ یورپ میں دو تین سال قیام کے دوران انہوں نے فلسفہ اور قانون کی اعلیٰ ڈگریاں ہی حاصل نہیں کیں بلکہ یورپ کا تہذیبی و تمدنی مطالعہ بھی کیا۔ وہ زمانہ یورپ میں سامراجی قوتوں کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر

ممالک یورپ کی سامراجی طاقتوں کے پنجہ استبداد میں گرفتار تھے۔ خصوصاً مسلمان ملکوں کی تو بُری حالت تھی۔ وہ سیاسی اور معاشی طور پر ہی نہیں نفسیاتی طور پر بھی مغلوب ہو چکے تھے۔ ان میں ایک طرح کا احساس کمتری اور احساس مجبوری پیدا ہو گیا تھا۔ اقبال رحمہ اللہ نے ساری صورت حال کا اسلامی تعلیمات و تاریخ کی روشنی میں مطالعہ کر کے اس کا حل خودی اور تصور سخت کوشی کی شکل میں پیش کیا۔

سلیم: فلسفہ خودی کیا ہے؟

شفیق: سادہ اور عام فہم زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خودی اپنی خداداد صلاحیتوں کو پہچاننے، ابھارنے اور خود شناسی اور خود اعتمادی کے ذریعے اپنی شخصیت کو پروان چڑھانے کا نام ہے اور سخت کوشی اس کا عملی پہلو ہے۔

نعیم: کیا سخت کوشی اور محنت و جفاکشی ایک ہی چیز ہے؟

شفیق: نہیں، سخت کوشی ایک نظریے کی حیثیت سے محض محنت و مشقت سے آگے کی چیز ہے۔ مثلاً حالی نے مسدس حالی میں بھی مسلمانوں کو محنت اور مشقت کی تعلیم دی ہے:

؎ مشقت کی ذلت جنھوں نے اُٹھائی
جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی

لیکن اقبال رحمہ اللہ کا نظریہ یہ ہے کہ افراد اور قوموں کو سخت کوشی اور جفاکشی کا رویہ اختیار کرنا چاہیے اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہیے۔ اقبال رحمہ اللہ کہتے ہیں:

؎ محروم رہا دولت دریا سے وہ غواص
کرتا نہیں جو صحبت ساحل سے کنارا

چنانچہ ساحل سے کنارا کرنے اور عمیق دریا میں غواصی کرنے کا خطرہ مول لینے کو تیار رہنا چاہیے۔ اسی لیے وہ نوجوانوں سے کہتے ہیں:

؎ وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری

''ضرب کاری'' کو اقبال رحمہ اللہ ایک اصول زندگی کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ بغیر

تگ و تاز کے ذوق کے، بغیر مہم جوئی کی سپرٹ کے، نہ قومیں اُبھرتی ہیں نہ افراد اُبھرتے ہیں۔

میزبان: آخر میں شمیم صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس مذاکرہ پر تبصرہ کریں۔

شمیم: میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ سخت کوشی کے فلسفہ پر اقبال رحمۃ اللہ نے اپنے فارسی کلام میں بہت کچھ کہا ہے۔ سخت کوشی ان کا خاص موضوع ہے۔ خودی کی زندگی سخت کوشی کی زندگی ہوتی ہے۔ زیر بحث شعر

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

کے حوالے سے میں طلبہ سے کہوں گا کہ وہ سخت کوشی کے رویے کو اپنے کردار کی بنیاد بنائیں۔

میزبان: جناب والا! طلبہ اپنی تعلیمی زندگی میں سخت کوشی کے رویے کو کیسے اپنا سکتے ہیں؟

پرنسپل: اس شعر کے مخاطب نوجوان طلبہ ہی ہیں۔ طلبہ سخت کوشی کے رویہ کو اپنے لائف سٹائل یا طرز زندگی میں اپنا سکتے ہیں۔ اس طرح کہ وہ اپنے آپ کو غیر ضروری آسائشوں کا عادی نہ بنائیں۔ اپنی جسمانی اور ذہنی قوت برداشت کو بڑھائیں۔ ضروری جسمانی اور ذہنی مشقت سے نہ گھبرائیں۔ تعلیم میں شارٹ کٹ نہ ڈھونڈیں نوٹس بنانے ہوں تو خود بنائیں۔ ریفرنس (حوالے کی کتابیں) خود دیکھیں۔ مشکل موضوعات پر مشکل کتابیں پڑھنے سے گریز نہ کریں۔ امتحان کی تیاری اتنی مکمل کریں کہ پرچے کے مشکل سوالوں کا جواب آسانی سے دے سکیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ لکیر کے فقیر نہ بنیں۔ سوچنے اور سمجھنے، تفکر و تدبر کی عادت ڈالیں اور اپنی تخلیقی قوتوں کو بیدار کریں اور ان کو آگے بڑھائیں۔ یہی خودی کا راستہ ہے۔



اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

میزبان: مجلس اقبال کے اس مذاکرہ کا عنوان ہے:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

یعنی ہم طلبہ کے لیے خودی کا مفہوم کیا ہے۔ میں سب سے پہلے رفیع صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کا آغاز کریں۔

رفیع: جس طرح ایک بیج میں ایک پیڑ چھپا ہوتا ہے اسی طرح ہر فرد میں کچھ صلاحیتیں چھپی ہوتی ہیں۔ ابتدا میں فرد کو بھی پتا نہیں ہوتا کہ اس کے اندر ترقی کے کون سے امکانات خوابیدہ ہیں۔ شخصیت کی ان خوابیدہ یا چھپی ہوئی صلاحیتوں اور امکانات کو تلاش کرنا اور پھر ان کو ترقی دینا خودی ہے۔

جمال: میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح ایک فرد کی خودی ہوتی ہے اسی طرح قوم کی بھی ایک خودی ہوتی ہے۔

رفیع: اور ایک فرد کی خودی کی طرح ایک قوم کی خودی بھی ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ اپنی ذات کے خوابیدہ امکانات کو تلاش کرنا اور ان کو ترقی دینا زندگی کا مقصد وحید ہے۔

اسلم: خودی کی ترقی کا پیمانہ کیا ہے؟

رفیع: اس کا جواب بھی عرض کرتا ہوں۔ دیکھیے جب ہم سکول میں آئے تھے تو ہم وہ نہیں تھے جو آج ہیں۔ اب ہمیں اپنے اوپر زیادہ اعتماد ہے۔ اب ہمیں ذات کا زیادہ شعور ہے۔ ہمیں اپنی صلاحیتوں کا زیادہ احساس ہے۔ اب ہمارے اندر آگے بڑھنے، جدوجہد کرنے اور اپنی شخصیتوں کو ترقی دینے کا زیادہ حوصلہ ہے۔ اسی کا نام خودی کی بیداری ہے۔

اسلم: لیکن ہم میں سے ہر لڑکے کی خودی کی بیداری کی رفتار یکساں کیوں نہیں؟ کہیں اس لیے تو نہیں کہ ہر ایک کی فطری صلاحیتوں میں کافی فرق ہے؟

رفیع: نہیں، میرا خیال یہ ہے کہ اتنا فرق ذہانت یا صلاحیت میں نہیں جتنا مختلف وجود سے خودی کو بیدار کرنے کی امنگ میں ہے۔

اسلم: تو پھر یہ امنگ کیسے پیدا ہو؟

رفیع: ہر قسم کی ترقی کا پہلا مرحلہ خود شعوری (Awareness) اور خود اعتمادی (Self Confidence) ہے۔ I Can کہہ سکنا خودی کی بیداری کی طرف پہلا قدم ہے۔ خود شعوری سے I Will کہنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ اقبال رحمہ اللہ کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے قومی سطح پر خود اعتمادی بحال کی اور خود شعوری بیدار کی بلکہ پیدا کی۔ احساس کمتری خودی کی نفی ہے۔ اس صدی کے شروع میں جب اقبال رحمہ اللہ نے خودی کا نظریہ پیش کیا تو ہندی مسلمان شدید احساس کمتری کا شکار تھے۔ انہیں اپنی قوتوں کا علم تھا اور نہ اپنی صلاحیتوں کا شعور۔ وہ بھی قومی سطح پر خودداری اور خود اعتمادی سے محروم تھے۔ اس لیے اقبال رحمہ اللہ نے مسلمانوں کو اپنے آپ کو پہچاننے اور اپنے امکانات کو بروئے کار لانے کا درس دیا۔

اسلم: براہ کرم، اقبال رحمہ اللہ کے وہ شعر بھی سنایئے جو اس وقت آپ کے ذہن میں ہیں۔

رفیع: میرا اشارہ ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی نظم ''شمع و شاعر'' کے ایک بند کی طرف ہے:

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشہ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو، ساقی بھی تو، مینا بھی تو، محفل بھی تو

اس میں واضح طور پر اپنے اوپر اعتماد کرنے اور اپنی صلاحیتوں کے سہارے آگے بڑھنے کی تلقین ہے۔ جو ۱۹۱۲ء کے دور کی غلامانہ ذہنیت کو کھلا چیلنج ہے۔

میزبان: مذاکرہ کا وقت ختم ہوتا ہے، آپ حضرات کا بے حد شکریہ!!!

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے

میزبان: سامعین گرامی! آج کے مذاکرہ کا موضوع یہ شعر ہے:

ے صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گِل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل، آزادی کو تو کر لے

مسئلہ یہ ہے کہ آزادی کا پابندیوں سے کیا رشتہ ہے؟ یا دوسرے لفظوں میں پابندیوں سے آزادی کس طرح حاصل ہوتی ہے؟ اس تصور کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے یہ مذاکرہ منعقد کیا جا رہا ہے۔ میں سب سے پہلے حامد صاحب کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ شعر کی وضاحت سے بحث کا آغاز کریں۔

حامد: زیر بحث شعر، جس کا پہلا مصرعہ ہے:

ع صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گِل بھی ہے

یہ اقبال رحمہ اللہ کی نظم ''پھول'' کا تیسرا شعر ہے۔ میں پہلے اس شعر کا لفظی مطلب بیان کرتا ہوں۔ صنوبر ایک قسم کا ''سرو'' ہے جو بلند قامت اور سیدھا ہوتا ہے۔ اس کی جڑیں گِل یعنی مٹی میں بہت گہرائی تک پھیلی ہوتی ہیں۔ باغ میں صنوبر کے بلند و بالا درخت کو دیکھ شاعر کہتا ہے کہ صنوبر اس لیے بلند و بالا ہے کہ وہ پا بہ گِل ہے۔ اس کے پاؤں یعنی اس کی جڑیں زمین میں جکڑی ہوئی ہیں۔ گویا پا بہ گِل ہونے نے اسے آزادی دی ہے۔

یہ تو شاعرانہ استدلال ہے۔ اصل میں اقبال رحمہ اللہ صنوبر کی مثال سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آزادی بغیر پابندیوں کو قبول کیے حاصل نہیں ہوسکتی۔ بلکہ بعض پابندیاں ہی آزادی کی ضمانت ہوتی ہیں۔

میزبان: اب میں محمود صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس امر کی وضاحت کریں کہ پابندیاں کس طرح آزادی کی ضمانت بنتی ہیں؟

محمود: میں اس تعلق کی وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا جو آزادی اور پابندی میں ہے۔ اصل میں پابندی سے اقبال رحمہ اللہ کا اشارہ نظم و ضبط اور تربیت و تنظیم کی طرف ہے۔ نظم وضبط اور ترتیب و تنظیم سے قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ کارکردگی بڑھتی ہے اور استحکام ملتا ہے۔ جس فرد کی زندگی میں ضبط و نظم ہو، ترتیب و تنظیم ہو وہ یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

میزبان: کس طرح؟ براہ کرم اس کی وضاحت کیجیے؟

محمود: ضبط سے قوت ضائع نہیں ہوتی اور نظم سے قوت میں اضافہ ہوتا ہے، اقبال رحمہ اللہ نے اپنے شعر میں جس پابندی کا ذکر کیا ہے وہ یہی ضبط و نظم ہے۔ ترتیب و تنظیم یا ڈسپلن سے ایک فرد ہی نہیں سارا معاشرہ ترقی کرتا ہے۔
انسانی تہذیب و ترقی کی کہانی انسانی ذہن اور اس کی زندگی کی ترتیب و تنظیم کی کہانی ہے۔ انسان نے جتنا اپنے آپ کو منظّم کیا اس کی قوتوں میں اتنا ہی اضافہ ہوا۔ مثالیں تو بے شمار ہیں لیکن میں ایک بہت قریب کی مثال دیتا ہوں۔ سکول میں کون لڑکا زیادہ ترقی کرتا ہے؟ وہی جس کی زندگی میں نظم زیادہ ہے، ضبط، زیادہ ہے، ترتیب و تنظیم زیادہ ہے۔ جس کو منزل کا احساس زیادہ ہے۔ جس کو سمت کا شعور زیادہ ہے۔ اس کے برعکس جو لڑکا اپنی قوتوں، اپنی صلاحیتوں کی تنظیم و ترتیب نہیں کر پاتا، جس کی زندگی میں نظم وضبط کی کمی ہوتی ہے، جو اپنے وقت اور اپنی توانائیوں کو ضائع کرتا ہے وہ پیچھے رہ جاتا ہے اور بہت پیچھے رہ جاتا ہے اور آپ جانتے ہیں:

ع درماندہ کے لینے کو آتا نہیں کوئی

میزبان: آخر میں نعمان صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کا جائزہ لیں۔

نعمان: ماشاء اللہ! مقررین نے بڑے اچھے نکتے پیدا کیے ہیں۔ میں ان پر صرف یہ اضافہ کروں گا کہ اسلام میں ضبط و نظم کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اسلامی عبادات اور شعائر اسلام مسلمانوں میں، منجملہ اور چیزوں کے، ضبط و نظم بھی پیدا کرتے ہیں۔

میزبان: آپ سب حضرات کا شکریہ۔ سچ ہے:

ے صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گِل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

میزبان: حضرات! آج کے مذاکرہ کا موضوع ہے:
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور
اس پر تحقیقی گفتگو کے لیے میں شاہد کو دعوت دیتا ہوں۔

شاہد: زیرِ بحث موضوع ''بالِ جبریل'' کی نظم ''حال و مقام'' کے آخری شعر کا دوسرا مصرعہ ہے۔ پورا شعر یوں ہے۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

میزبان: اب میں سعید سے اظہارِ خیال کی درخواست کرتا ہوں۔

سعید: اقبال رحمہ اللہ کا یہ شعر:

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

فکرِ اقبال رحمہ اللہ کے ایک اہم نکتے کو ظاہر کرتا ہے اور وہ یہ کہ انسان ماحول سے بلند ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے، چنانچہ یکساں ماحول میں رہتے ہوئے بھی ایک انسان کا عمل دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

میزبان: کیوں؟

سعید: اس لیے کہ وہ خود اندر سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کی سوچ مختلف ہوتی ہے۔ اس شعر میں کرگس اور شاہین دو کردار، دو دائمی رویے ہیں۔ شاہین کا لفظ ایک علامت کے طور پر اقبال رحمہ اللہ کے کلام میں بار بار آتا ہے۔
۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کو لکھے ہوئے ظفر احمد صدیقی کے نام ایک خط میں خود اقبال رحمہ اللہ نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ انہوں نے شاہیں کو ایک مثالی مسلمان کی

علامت کے طور پر کیوں استعمال کیا؟

میزبان: براہِ کرم اقبال رحمۃ اللہ کے اپنے الفاظ نوٹ کیجیے؟

سعید: عرض کرتا ہوں۔ اقبال رحمۃ اللہ نے اس خط میں لکھا: ''شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ نہیں، اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں:

۱۔ خوددار اور غیرت مند ہے کہ غیر کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔

۲۔ لاتعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔

۳۔ خلوت پسند ہے۔

۴۔ تیز نگاہ ہے۔

اقتباس ختم ہوا۔

اس سلسلہ میں، میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف بھی مبذول کرانا چاہوں گا کہ شاہین ظاہری طور پر بھی شاندار اور پُروقار اور Impressive ہوتا ہے۔ کرگس کی خصوصیات اور صفات اس کے بالکل اُلٹ ہیں۔ ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی۔

میزبان: اس شعر میں دو اور الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ فضا اور جہاں۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

فضا اور جہاں سے کیا مراد ہے؟

سعید: فضا سے مراد ماحول اور جہاں سے مراد رویہ، کردار یا شخصیت ہے۔

میزبان: پھر شعر کا اصل مفہوم کیا ہوا؟

سعید: یہ کہ ایک سی فضا میں، ایک سے ماحول، ایک سے حالات میں بھی اس شخص کا عمل اور Behaviour جس کا کردار شاہین کا سا ہے اس فرد کے عمل اور Behaviour سے بالکل مختلف ہوگا جس کا کردار کرگس کا سا ہے۔ شعر کا نکتہ یہ ہے کہ اصل چیز فضا، ماحول یا حالات نہیں، انسان کا کردار، اس کی خودی، اس کی شخصیت ہے۔ انسان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اپنے ماحول کے دباؤ Compulsions اور Pressures سے بلند بھی ہوسکتا ہے اور جو ہو جاتا ہے وہی جواں قبیلے کی آنکھ کا تارا بنتا ہے۔



تری خاک میں شرار زندگی نہیں ہے

میزبان: اقبالیات کے سلسلے میں آج کے مذاکرہ کا عنوان ہے:

تری خاک میں شرار زندگی نہیں ہے

اس موضوع پر توضیحی گفتگو کے لیے میں سب سے پہلے اشعر صاحب کو دعوت دیتا ہوں۔

اشعر: مذاکرہ کا عنوان اقبال رحمہ اللہ کے ایک فارسی شعر:

؎ اگر امروز تو تصویر دوش است
بخاک تو شرار زندگی نیست

کے دوسرے مصرعے کا لفظی ترجمہ ہے۔ پورے شعر کا مطلب کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اگر تمہارا آج یعنی ''حال'' تمہارے گزرے ہوئے کل ''ماضی'' کی تصویر ہے اور تم آج بھی ہو بہ ہو وہ ہو جو کل تھے۔ یعنی تم بہتر طور پر بدلے نہیں ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمہاری خاک میں شرار زندگی نہیں ہے۔ یعنی تم صحیح معنوں میں زندہ نہیں ہو۔

میزبان: کیا اس شعر میں ماضی سے رشتہ توڑنے کی تلقین کی گئی ہے؟

اشعر: نہیں۔ اقبال رحمہ اللہ نے ماضی سے رشتہ توڑنے کو کبھی نہیں کہا۔ انسان کی جڑیں اس کے ماضی میں ہوتی ہیں۔ کلچر نام ہی روایتوں، Traditions کے تسلسل کا ہے۔ اقبال رحمہ اللہ نے اس تسلسل کو برقرار رکھنے پر بھی بڑا زور دیا ہے۔

ع پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

انہی کا مصرعہ ہے لیکن اقبال ؒ ماضی کو زنجیر نہیں بنانا چاہتے۔ صرف پس منظر یا حوالہ رکھنا چاہتے ہیں۔ جس کی روشنی میں آگے بڑھا جا سکے۔ اس لیے وہ یہ اصرار کرتے ہیں۔

؎ آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پر اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

میزبان: کمال، آپ کا کیا خیال ہے؟

کمال: میں اشعر سے اتفاق کرتے ہوئے کہوں گا کہ فکرِ اقبال ؒ کا بنیادی نکتہ یہی ہے کہ ضمیر لالہ میں چراغ آرزو روشن ہو اور چمن کا ذرہ ذرہ شہید جستجو ہو۔ اقبال ؒ کی نظم ''چاند اور تارے'' کا موضوع بھی یہی ہے۔

اس راہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

اور ''خضر راہ'' میں زندگی کے عنوان سے یہ فکرانگیز شعر ملتے ہیں:

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

میزبان: آخر میں مجلس اقبال کے صدر اپنے محترم اور فاضل استاد پروفیسر عرفان علوی صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس موضوع پر اظہار خیال فرمائیں۔

پروفیسر عرفان: زیر بحث موضوع اقبال کے جس فارسی شعر سے ماخوذ ہے۔ وہ اقبال کے فارسی مجموعہ کلام ''پیام مشرق'' کے شروع میں آتا ہے اور ایک قطعہ کا دوسرا شعر ہے۔ دو شعروں کا وہ قطعہ یوں ہے:

دما دم نقش ہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروز تو تصویر دوش است
بخاک تو شرار زندگی نیست

یعنی یہ لحہ بہ لحہ نئی سے نئی صورت اختیار کرتی رہتی ہے۔ زندگی کو کسی ایک صورت میں قرار نہیں ہے۔ چنانچہ اگر تمہارا آج تمہارے کل کی تصویر ہے تو تمہاری خاک میں شرار زندگی نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس آخری شعر کے مضمرات پر گفتگو کروں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس شعر کے پس منظر پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

یہ شعر یوں تو ''پیام مشرق'' کا ہے۔ جو ۱۹۲۳ء میں چھپی تھی۔ لیکن اس میں جو فلسفہ خودی ہے۔ وہ ''اسرارخودی'' کی بازگشت ہے۔ اقبال کی یہ شہرہ آفاق فارسی نظم ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی تھی اور یہی وہ کتاب ہے جس میں اقبال کے بنیادی تصورات وضاحت سے بیان ہوئے ہیں۔ اس لیے اس کے تاریخی پس منظر کو جاننا ضروری ہے۔

مسلمانوں کے سیاسی زوال پر مہر تو ۱۴۹۲ء میں سقوط غرناطہ کے المیہ کے موقع پر لگی لیکن تہذیبی زوال اس سے کئی صدی پہلے شروع ہو چکا تھا اور مسلمان مفکروں اور مدبروں نے اس کے اسباب پر غور وفکر کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں پہلا نمایاں نام ابن خلدون کا ہے۔ جس کی تاریخ کا مقدمہ علم تاریخ کی تاریخ میں ایک اونچا مقام رکھتا ہے۔ اس کے بعد جن مفکروں نے اس مسئلہ کا تجزیہ کیا ان میں سترہویں صدی میں مجدد الف ثانی رحمہ اللہ اٹھارویں صدی میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور انیسویں صدی میں جمال الدین افغانی رحمہ اللہ اور مصر کے محمد عبدہٗ سرفہرست ہیں۔ موجودہ صدی کے شروع میں اقبال رحمہ اللہ نے اس مسئلہ پر گہرائی میں جا کر غور کیا۔ اقبال رحمہ اللہ کو ایک اور بھی غیر معمولی Advantage حاصل تھا۔ انہیں قدیم و جدید مشرقی و مغربی فلسفہ پر عبور حاصل تھا اور چند سال یورپ میں رہ کر انہوں نے خود جدید تہذیب کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ وہ اس کی خامیوں سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے نیشنلزم یعنی ''علاقائی قوم پرستی کے مغربی تصور'' پر اور اس کی

اخلاقی اقدار پر سخت لب ولہجہ میں تنقید کی ہے۔

؎ تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

واضح رہے کہ علامہ نے یہ شعر ۱۹۰۷ء میں لکھا تھا جب وہ جرمنی میں فلسفہ میں پی ایچ ڈی کے لیے اپنا تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے لیکن اقبال رحمہ اللہ کی تحقیق کا اصل منشا تو یہ معلوم کرنا تھا کہ اسلامی ملت کو کس طرح زندہ وتابندہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ گہرے تفکر وتدبر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اقوامِ مشرق، خاص طور پر مسلمانوں کی خودی کو بیدار اور مستحکم کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کہ مسلمانوں کو فکری آزادی کی بھی اشد ضرورت ہے تا کہ وہ اسلامی اصولوں، قدروں اور رویوں کو جدید سیاسی سماجی اور معاشی اداروں کی شکل میں تشکیل دے سکیں۔ اس امر کے لیے اجتہاد کی ضرورت تھی۔ تا کہ تہذیبی ترقی کا سفر جاری رہے۔ اس لیے اقبال رحمہ اللہ نے زور دے کر کہا کہ اجتہاد کرتے ہوئے آگے بڑھو اور بڑھتے جاؤ۔ خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہر دم جواں پیہم رواں زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے۔

؎ اگر امروز تو تصویر دوش است
بخاک تو شرار زندگی نیست

کا مطلب یہی ہے کہ اگر تمہارا آج بالکل ویسا ہے جیسا کل تھا یعنی اس میں کوئی جوہری تبدیلی نہیں آئی تو گویا تمہاری خاک میں شرار زندگی نہیں ہے یعنی تم مر چکے ہو۔ اس شعر میں دو لفظ امروز (آج) اور دوش (گزرا ہوا کل) بھی توجہ طلب ہیں۔ یعنی جو تبدیلی ہوتی ہے وہ دن بہ دن، لمحہ بہ لمحہ ہوتی ہے۔

ع ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

میزبان: سر، آپ نے اس شعر کے پس منظر پر اور اس کے مضمرات پر بڑی عالمانہ گفتگو کی۔ اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ اب آخر میں، مَیں آپ سے یہ گزارش کروں گا کہ آپ اس امر پر بھی روشنی ڈالیں کہ اقبال رحمہ اللہ کے اس شعر کا اطلاق ہم طلبہ کی زندگی پر کس طرح ہوسکتا ہے؟

عرفان: اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ طلبہ کے نام اقبال رحمہ اللہ کا پیغام کیا ہے تو میں بے ساختہ

''پیام مشرق'' کے یہی اشعار پڑھوں گا:

دما دم نقش ہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروز تو تصویر دوش است
بخاک تو شرار زندگی نیست

طلبہ کی زندگی کا تو سب سے واضح مقصد ہی روشنی کی تلاش، خوب سے خوب تر کی جستجو، اپنی شخصیت کے ارتقا کے لیے مسلسل کاوش ہوتا ہے۔ اس شعر میں تصور ارتقا چھپا ہوا ہے۔ طلبہ کو بتایا گیا ہے کہ ترقی ایک تدریجی عمل اور Process ہے۔ اگر ایک طالب علم ہر روز شعوری طور پر ذہنی، اخلاقی، جسمانی ارتقا کے لیے جدوجہد کرتا رہے تو اس کا مستقبل یقیناً تابناک ہوگا۔ طلبہ کو خاص طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ تعلیم و تربیت بھی ایک مسلسل عمل ہے۔ یہ ایک دو دن یا دو چار ماہ کی بات نہیں کہ امتحان آیا تو کچھ پڑھ لیا، کچھ رٹ لیا۔ باقی وقت خواب خرگوش کے مزے لیے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ زندگی میں امتحان نہ کبھی شروع ہوتا ہے اور نہ کبھی ختم ہوتا ہے۔ یہ مسلسل جاری رہتا ہے۔ اس لیے کتابی امتحان کی تیاری بھی مسلسل جاری رہنی چاہیے۔ تاکہ علمی اعتبار سے بھی ہر آج ہر کل سے بہتر ہو۔ اپنی گفتگو ختم کرنے سے پہلے میں ایک اور نکتے کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ ''آج'' کے ''کل'' سے بہتر ہونے کا انحصار Quantitative تبدیلی پر نہیں Qualitative تبدیلی پر ہوتا ہے۔ اس لیے طلبا کو معلوم ہونا چاہیے کہ Qualitative تبدیلی صرف نصابی کتابوں کے خلاصے رٹ لینے سے نہیں آئے گی۔ معلومات اور علم میں فرق ہے۔ طلبا کو صرف معلومات ہی میں اضافہ کرنے پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ علم میں اضافہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور علم میں اضافہ کسی مضمون کے بنیادی تصورات کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے ہر مضمون کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ تعلیم ایک تخلیقی اور Creative عمل ہے، Reproductive کارروائی نہیں جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کا آخری امتحان یہ ہے کہ وہ کس حد تک متعلم کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارتی ہے۔ اسی لیے اقبال ؒ نے طلبا کو مشورہ دیا تھا

کہ علم حاصل کرو اور علم پیدا بھی کرو۔

آخر میں، مَیں یہ بھی کہوں گا کہ ''آج'' کو ''کل'' سے بہتر بنانے کے لیے طلبا کو اپنے کردار پر نظر رکھنی ہو گی۔ اپنے لائف سٹائل کو بھی طالب علمانہ بنانا پڑے گا اور اپنی ترجیحات کو بھی تعلیم کے نقطہ نظر سے مرتب کرنا ہو گا۔

مختصر یہ کہ ''آج'' کو ''کل'' سے بہتر بنانے کا عمل روشنی کی تلاش کا سفر ہے۔ جس کے کئی پہلو، کئی Dimensions ہیں۔

تو رہ نورد شوق ہے، منزل نہ کر قبول!



سلطان ٹیپو کی وصیت



تو رہ نورد شوق ہے، منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
کھویا نہ جا صنم کدہ کائنات میں
محفل گداز، گرمی محفل نہ کر قبول
صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)



جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

میزبان: حضرات! آج ہم ایک نہایت خیال انگیز موضوع پر بحث کر رہے ہیں جس کی عملی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ بحث کا عنوان ہے:

جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

سب سے پہلے میں سلمان صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ گفتگو کا آغاز کریں۔

سلمان: زیر بحث موضوع غالب کا ایک مصرعہ ہے۔ پورا شعر یوں ہے۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

اس شعر میں یہ فقرہ ''جی خوش ہوا ہے'' پورے شعر کی جان ہے۔ راہ کو پُر خار یعنی کانٹوں سے بھرا دیکھ کر نہ صرف یہ کہ گھبرانا نہیں بلکہ اوپر سے خوش ہونا زندگی کے ایک خاص رویے بلکہ ایک خاص فلسفہ حیات کی غمازی کرتا ہے۔

میزبان: عرفان صاحب! آپ کا کیا خیال ہے؟

عرفان: میں سمجھتا ہوں کہ راستے کو کانٹوں سے بھرا دیکھ کر خوش ہونا صرف نہ گھبرانے سے بہت آگے کی منزل ہے۔ قابل غور نکتہ یہ ہے کہ شاعر کانٹوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔

میزبان: کیوں؟

عرفان: سوچ اور کردار کی وجہ سے ایک تو پاؤں میں آبلے پڑے ہوئے ہیں۔ اوپر سے جو راہ ہے وہ پُر خار ہے۔ گویا مزید تکلیف یا مزید آزمائش کا سامان ہے۔ اس موقع پر

مایوسی یا بد دلی کا ردِعمل بھی ہوسکتا ہے۔ بلکہ وہ زیادہ نیچرل ہے۔ اب یہ شاعر کی سوچ ہے کہ وہ بظاہر بدترین صورت حال کے بھی روشن پہلو کو دیکھتا ہے کہ راستہ کانٹوں سے بھرا ہوا ہے تو کیا۔ کم از کم پاؤں کے چھالوں سے تو نجات ملے گی۔ گویا مشکل ترین صورت حال سے دوچار ہو کے بھی وہ پریشان نہیں ہوتا بلکہ مردانہ وار اس کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ راہ کے کانٹوں کو چار و ناچار برداشت کرنا ایک بات ہے اور ان کو دیکھ کر خوش ہونا اور بات ہے بلکہ بڑی عظیم بات ہے۔

میزبان: اب میں اس مجلس کے مہمان خصوصی محترم پرنسپل صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ طلبا کے حوالے سے اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالیں۔

پرنسپل: میں یہ عرض کروں گا کہ زندگی کی راہ کا کوئی کانٹا ڈرنے سے، بچنے سے، پریشان ہونے سے اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کانٹا کسی شکل میں بھی سامنے آ سکتا ہے۔ وہ کوئی Handicap بھی ہوسکتا ہے۔ اس کی صورت وسائل کی کمی، ماں باپ کی شفقت سے محرومی بھی ہوسکتی ہے۔ حاسدوں کا حسد اور دشمنوں کی دشمنی بھی کانٹے کی ایک شکل ہے تعلیمی سہولتوں کا فقدان بھی کانٹا ہی ہے۔ غرض کانٹوں کی ہزار شکلیں ہیں۔ ہر شخص کی راہ کے کانٹے علیحدہ ہوتے ہیں لیکن سب کا نتیجہ یکساں ہوتا ہے۔ یعنی رکاوٹ، آزمائش، امتحان، جسمانی یا ذہنی اذیت۔ ایسے تمام موقعوں پر اور ایسی تمام صورتوں میں صحیح رویہ یہی ہوتا ہے کہ صورت حال کا جرأت اور دانشمندی سے، صبر و تحمل سے مقابلہ کیا جائے۔ بلکہ اس پر غالب آنے کی کوشش کی جائے۔

مشہور امریکی مصنف ایمرسن نے اپنے نظریہ تلافی میں اس نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ قدرت جب کچھ چھینتی ہے تو کچھ دیتی بھی ہے۔ کوئی کانٹا راستے میں ڈالتی ہے تو کوئی اور اٹھاتی بھی ہے۔ کوئی ہینڈی کیپ ہوتا ہے تو قدرت کوئی اور قوت یا صلاحیت وافر مقدار میں دے کر اس کی تلافی بھی کرتی ہے۔ اگر راہ پُر خار ہوتی ہے تو کہیں چھاؤں بھی ہوتی ہے۔

ع سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے

اور اگر چھاؤں نہیں ہے تو نہ سہی آخر تپتی دھوپ میں بھی تو لوگوں نے بڑے بڑے لمبے سفر کیے ہیں۔ لہٰذا کسی ہینڈی کیپ کو ہینڈی کیپ، کسی معذوری کو معذوری، کسی مجبوری کو مجبوری، کسی رکاوٹ کو رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہیے کہ دلیروں اور جرأت مندوں کا شیوہ یہی ہے۔

طلبہ کو خاص طور پر مشکل پسندی کی عادت ڈالنی چاہیے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ کا قول ہے:

''اگر سلامتی کے خواہاں ہو تو وہ ساحل پر ہے۔ لیکن اگر موتیوں کی تلاش ہے تو وہ پھر قعرِ دریا میں ملیں گے۔''

میزبان: آپ سب حضرات کا بے حد شکریہ!!!



زندگی



برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زِندوں میں ہے — سرِ آدم ہے ضمیرِ کُن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جُوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جُوئے کم آب — اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے — گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

قُلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حَباب — اس زِیَاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تُو
پُختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تُو

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)



کامیاب کون اور ناکام کون؟

صدر: حضرات! آج کے مذاکرے کا موضوع ہے زندگی میں کامیاب کون اور ناکام کون ہوتا ہے۔ میں اشرف صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کا آغاز کریں۔

اشرف: میرا خیال ہے کہ پیسہ کامیابی کی پہلی شرط ہے۔ جن والدین کے پاس پیسہ ہوتا ہے وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ سکولوں میں بھیجتے ہیں۔ ان کو اعلیٰ تعلیم ملتی ہے۔ وہ زندگی میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

انور: میں اشرف سے اختلاف کروں گا۔ اگر ایسا ہوتا تو تمام امیروں کے لڑکے سب سے زیادہ لائق ہوتے اور جو جتنا مالدار ہوتا اس کے اتنے زیادہ مارکس ہوا کرتے۔ چونکہ ایسا نہیں اس لیے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ تعلیمی کامیابی کے لیے پیسہ بنیادی چیز نہیں، اکثر غریب لڑکے امتحانات میں اعلیٰ کامیابیاں حاصل کرتے رہتے ہیں۔

صدر: اکرم، آپ کی رائے کیا ہے؟

اکرم: میرے خیال میں ذہانت اہم چیز ہے۔ اصل فرق ذہانت سے پڑتا ہے۔

اختر: میں کچھ عرض کروں؟

صدر: فرمایئے۔

اختر: مجھے اشرف اور اکرم، دونوں صاحبان سے اختلاف ہے۔ میرا خیال ہے کہ نہ پیسے سے اتنا فرق پڑتا ہے نہ ذہانت سے۔

اشرف: کیوں نہیں؟

اختر: دیکھیے! اگر محض ذہانت سے فرق پڑا کرتا تو ہر لڑکا اپنی ذہانت کے مطابق کامیاب

ہوا کرتا۔ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ اکثر بی اور سی گریڈ کے لڑکے اے گریڈ کے لڑکوں سے زیادہ نمایاں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ ہمارا اپنا تجربہ بھی یہی ہے کہ بہت سے ذہین لڑکے شرارتیں ہی کرتے رہتے ہیں اور ان سے کم ذہین لڑکے اور عام سکولوں میں پڑھے لڑکے ان سے بازی لے جاتے ہیں۔

صدر: آخر کیوں؟

عارف: اس کا جواب میں دیتا ہوں۔ ذہانت کا تھوڑا بہت فرق محنت اور لگن سے پورا ہو جاتا ہے اور وسائل کی کمی کی تلافی بھی محنت اور شوق سے ہو جاتی ہے۔ قائداعظم رحمۃ اللہ اور علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ نے اپنی ابتدائی تعلیم بہت نامساعد حالات میں شروع کی۔ علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ کا بچپن بہت غریبی میں گزرا۔ قائداعظم رحمۃ اللہ نے ایک بار کہا تھا کہ

''میں سٹریٹ لائٹ میں پڑھا ہوں۔''

بہت سے سپاہیوں، این سی اواور جے سی اوز کے بچے جرنیل بنے ہیں۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ علم وترقی کسی کی میراث نہیں۔ جو محنت کرے گا اسے پائے گا۔

صدر: آخر میں بشیر صاحب سے کہوں گا کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

بشیر: میرے خیال میں اصل چیز یہ ہے کہ آدمی کی سوچ ٹھیک ہو اور سوچ کا ٹھیک ہونا بغیر علم وتجربے کے ممکن نہیں۔ اس لیے کامیاب وہ ہوگا جس کا رویہ ٹھیک ہے، جس کی سوچ ٹھیک ہے، جس کا شعور زیادہ ہے۔



قوموں کا عروج وزوال

میزبان: صدرِ مجلس، حاضرین گرامی!
آج کے مذاکرے کا عنوان ہے، قوموں کا عروج و زوال۔ انسانی تہذیب کی داستان ہزاروں سالوں پر پھیلی ہوئی ہے۔مصری، سندھی، یونانی، رومی اور اسلامی تہذیبیں ابھریں اور ڈوبیں۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عروج وزوال کے اسباب کیا ہیں؟
ایک قوم، ایک تہذیب اُبھرتی ہے تو کیوں اُبھرتی ہے اور جب اس کے اقبال کا آفتاب غروب ہوتا ہے تو کیوں غروب ہوتا ہے؟

میزبان: میں اشرف صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

اشرف: قوموں کے عروج و زوال کے مسئلہ پر سب سے پہلے تیرہویں صدی میں ایک مسلمان مؤرخ ابن خلدون نے روشنی ڈالی۔ بعد کے مفکروں نے بھی اس اہم مسئلہ پر غور کیا ہے۔ بیشتر کا خیال یہ ہے کہ قوموں کے عروج وزوال کا تعلق اخلاق و کردار سے ہے۔ جب کوئی قوم آگے بڑھتی ہے تو اس کے اندر عزم ہوتا ہے، جوش و ولولہ ہوتا ہے، قومی عصبیت ہوتی ہے، قومی مفاد کے لیے قربانی دینے اور ایثار کرنے کا جذبہ ہوتا ہے۔اقبال رحمہ اللہ کا شعر ہے:

ع سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

میزبان: انور! آپ کا کیا خیال ہے؟

انور: میں سمجھتا ہوں کہ مادی وسائل کی بڑی اہمیت ہے۔ بغیر مادی وسائل کے کوئی قوم

آگے نہیں بڑھ سکتی اور ترقی کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام نہیں دے سکتی۔

اکرم: میں انور صاحب سے اختلاف کروں گا۔ وسائل کی، دولت کی اہمیت تو ہے لیکن بنیادی اہمیت نہیں۔ اس کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے وسائل بہت کم ہیں اور وہاں ایک اونس لوہا بھی پیدا نہیں ہوتا لیکن انہوں نے گھڑی کی صنعت میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ یہی حال جاپان کا ہے۔ جاپان کے قدرتی وسائل بہت تھوڑے ہیں۔ لیکن پوری قوم محنتی اور جفاکش ہے۔ انہوں نے تھوڑے وسائل ہی سے کام لیا ہے۔ بلکہ دوسرے ملکوں کے وسائل سے بھی کام لیا ہے۔ عربوں کے پاس، لاطینی امریکہ اور افریقہ کے بعض ملکوں کے پاس وسائل کی کمی نہیں، کسی اور چیز کی کمی ہے۔

میزبان: وہ کیا چیز ہے؟

اختر: میں عرض کرتا ہوں کہ وہ چیز علم ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی ہے۔ محنت اور مشقت بھی اس وقت ہی کام آتی ہے جب اس کے پیچھے علم اور ٹیکنالوجی کی طاقت ہو۔ خود مسلمانوں کی تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ مسلم تہذیب کے عروج کا دور یعنی دسویں اور گیارہویں صدی ان کے علوم وفنون میں کمال کا دور بھی ہے۔

صدر: میں آخر میں عارف صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث پر اختتامی تبصرہ کریں۔

عارف: میں سمجھتا ہوں کہ سب مقرروں نے حقیقت کے ایک ایک پہلو سے پردہ اٹھایا ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ قوموں کے عروج و زوال میں قومی کردار اہم رول ادا کرتا ہے۔ محنت، مشقت، جفاکشی، عزم اور حوصلے سے ٹیکنالوجی بھی حاصل ہوتی ہے اور قومی تعمیر بھی ہوتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپان اور جرمنی مکمل طور پر تباہ ہو گئے تھے۔ یہ ان قوموں کا حوصلہ، جفاکشی اور ایثار کا جذبہ ہے، معاملات اور تعلقات میں دیانت اور تعاون کا رویہ ہے کہ ان قوموں نے دوبارہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرلیا ہے۔ یہی جذبہ چین کی عظیم ترقی کی بنیاد بنا۔

اخلاق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک بنیادی اخلاق دوسرا اسلامی اخلاق۔ بنیادی اخلاق یعنی دیانت، جفاکشی، انصاف پسندی اور رواداری۔ قومی مفاد کے لیے ایثار ہر قوم

کی تہذیبی ترقی کی بنیادی شرط ہے۔خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ اسلامی اخلاق بنیادی اخلاق سے آگے کی چیز ہے۔ اسلامی اخلاق اپنی قوم کے لیے ہی نہیں ساری اقوام کے لیے، ساری دنیا کے انسانوں کے لیے عدل، احسان، ایثار، خدمت اور محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ اسلامی اخلاق تو کجا ہم بنیادی اخلاق سے بھی من حیث القوم بڑی حد تک محروم ہیں اور یہی ہمارے زوال کا سبب ہے۔ہمیں ایمان کی روشنی میں علم کی قوت اور کردار کی توانائی کی ضرورت ہے اور یہی اسلام کا تقاضا ہے۔

؎ یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں



فیچر



سقراط کی موت

سقراط کی موت

میزبان: تفکر اور تدبر کو تعلیم میں بنیادی اہمیت حاصل ہے اور تفکر و تدبر کی تاریخ میں پہلا بڑا نام یونان کے عظیم فلسفی سقراط کا ہے۔ اسی عظیم فلسفی اور عظیم تر انسان سقراط پر ایک فیچر پیش کیا جاتا ہے۔

اس فیچر کے دو حصے ہیں۔ پہلے سقراط کے بارے میں ضروری معلومات ایک مکالمے کی صورت میں پیش کی جائیں گی۔ پھر سقراط کی موت کا منظر سٹیج کیا جائے گا۔

تو حضرات، پیش خدمت ہے سقراط کے بارے میں ایک معلوماتی مکالمہ:

سوال: سقراط کب اور کہاں پیدا ہوا؟

جواب: سقراط 469 قبل مسیح میں یعنی اب سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے یونان کے شہر ایتھنز میں پیدا ہوا۔

سوال: اس کے خاندان اور ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتایئے؟

جواب: سقراط کا باپ سنگ تراش تھا۔ گویا اس کا تعلق ایتھنز کے اونچے طبقے سے نہ تھا۔ سقراط نے بھی کچھ عرصہ سنگ تراشی کی۔ اس کی رسمی تعلیم زیادہ نہ تھی۔ اس نے اپنے ذوق وشوق سے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔

سوال: سقراط کے بارے میں کوئی اور اہم بات؟

جواب: یہ کہ اتنے عظیم ذہن اور اتنی حسین روح کا حامل یہ غیر معمولی انسان جسمانی وجاہت سے قطعاً عاری تھا۔ گہرا سانولا رنگ، دوہرا جسم، پستہ قد، چہرے کے خدوخال بھدے اور چال بے ڈھنگی۔ یہ ظاہری حالت تھی اس شخص کی جو فلسفیوں

کا فلسفی تھا۔ اس کی ازدواجی زندگی بھی ایک امتحان تھی جس پر وہ پورا اُترا۔

سوال وہ کیسے؟

جواب وہ اس طرح کہ اس کی بیوی زنوبے بہت ہی بدمزاج اور پھوہڑ عورت تھی۔ اس نے اس کے ساتھ بڑے صبر و تحمل سے گزارا کیا۔ جب کسی نے اس سے زنوبے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا:

''اس نیک بخت نے مجھے بالواسطہ طور پر ضبط و صبر کرنا سکھایا۔''

سوال کیا علم و دانش کے علاوہ بھی اسے کوئی امتیاز حاصل تھا؟

جواب جی ہاں! وہ ایک آزمودہ کار اور بہادر سپاہی بھی تھا۔ اس نے ایتھنز کی طرف سے 424 قبل مسیح میں ڈیلیٹم کی لڑائی میں دادِ شجاعت دی۔ پھر 422 قبل مسیح میں ایفی پولیس کے مقام پر لڑا۔ اس کے بعد اس نے اپنی ساری توانائی اور توجہ روشنی کی تلاش پر مرکوز کر دی۔ لیکن وہ ایک عملی دانشور تھا۔ اس نے عملی طور پر بھی اخلاقی اصولوں کی برتری کے لیے جدوجہد کی۔

سوال وہ کیسے؟ اس کی کوئی مثال؟

جواب 406 قبل مسیح کی ایک بحری جنگ میں ایتھنز کی فوجوں کو شکست ہوئی۔ ایتھنز کے شہری اپنے شکست خوردہ دس جرنیلوں کو سزائے موت دینا چاہتے تھے۔ چونکہ وہ ان کے خیال میں جنگ کے مقتولوں کو مناسب طریقے سے دفن کرنے میں ناکام رہے تھے۔ سقراط نے اصولی طور پر اس اقدام کی مخالفت کی اور اس طرح ایتھنز کی حکومت کی ناراضی مول لی۔ اس کے بعد جب تیس جابروں کا ٹولہ برسرِ اقتدار آیا تو سقراط ان آمروں سے بھی ٹکرایا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے موت کے گھاٹ اتارتے، وہ خود معزول کر دیئے گئے۔

سوال سقراط کے فلسفے کا لب لباب کیا ہے؟

جواب سقراط نے کوئی تحریر، کوئی کتاب نہیں چھوڑی۔ اس کے افکار و خیالات اس کے نامور شاگرد اور فلسفی افلاطون کی تحریروں اور کتابوں، خاص طور سے مکالمات میں ملتے ہیں۔

اپنے آپ کو پہچانو۔ Know Thyself اس کے فلسفے کا بنیادی نکتہ ہے۔ اس کا

خیال تھا کہ نیکی (Virtue) کی بنیاد علم (Knowledge) ہے اور بدی کی جڑ جہالت (Ignorance)۔ وہ کہا کرتا تھا کہ دراصل کوئی بھی آدمی بنیادی طور پر بُرا نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ حصول علم کو، روشنی کی تلاش کو افضل ترین عمل کہتا ہے۔

سوال اس کا طریق تعلیم کیا تھا؟

جواب وہ ایتھنز کی راہوں اور شاہراہوں پر گھومتا رہتا اور زیادہ تر نوجوانوں سے روح اور اخلاق پر گفتگو کرتا۔ وہ انجان بن کران پر سوال کرتا اور اس طرح کسی اخلاقی مسئلہ کو واضح کرتا۔ یہ طریقہ اب Socratic Method سقراطی طریقے کے نام سے مشہور ہے۔

سوال اسے زہر کا پیالہ کیوں پینا پڑا؟

جواب وہ تلاش حق، سچائی، اخلاقی اصولوں کی برتری کی تعلیم دیتا تھا۔ جو بالواسطہ طور پر ایتھنز کی Corrupt حکومت اور برسر اقتدار طبقہ کے لیے ایک چیلنج اور خطرہ بنتی جا رہی تھی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ ایتھنز کے نوجوان اس سے بہت متاثر تھے۔ اس طرح یہ بوڑھا فلسفی جو ٹھہر ٹھہر کر، پرسکون لہجہ میں بات کرتا تھا، ارباب اقتدار کی نگاہ میں ایک باغی اور انقلابی کے طور پر کھٹکنے لگا تھا۔

سوال اس کشمکش کا انجام کیا ہوا؟

جواب ایتھنز کی حکومت نے اس پر مقدمہ چلایا اور اسے موت کی سزا دی۔

سوال اس پر خاص الزام کیا تھا؟

جواب یہ کہ وہ دیوتاؤں کا باغی ہے اور نوجوانوں کو گمراہ کرتا ہے۔

سوال اس کی موت کس طرح واقع ہوئی؟

جواب ایتھنز میں دستور تھا کہ جس کو موت کی سزا دی جاتی اسے ہملاک نامی ایک بوٹی کا رس ایک پیالہ میں بھر کر سورج غروب ہونے کے بعد پینے کو دیا جاتا۔ ہملاک کا زہر آہستہ آہستہ اثر کرتا۔ پہلے پیر بھاری ہوتے، پھر دھڑ، آخر کار قلب متاثر ہوتا اور قیدی کی موت واقع ہو جاتی۔ سقراط کو بھی اسی زہر کا پیالہ پینا پڑا تھا۔



موت کا منظر

میزبان: حضرات! تصور کیجیے کہ یہ جگہ 399 قبل مسیح میں ایتھنز کی ایک کھلی جیل کا ایک گوشہ ہے اور شام کا وقت۔ کچھ دیر میں سورج ڈوبنے کے بعد سقراط کو ہملاک کے زہر کا پیالہ پیش کیا جائے گا۔ سقراط کے بہت سے مداح نوجوان اس کو آخری سلام کرنے کے لیے جمع ہیں۔ جن میں ان کے چہیتے خادم زینوفن کے علاوہ اس کا دوست اور نیاز مند کریٹو بھی شامل ہے۔

ایک نوجوان: اگر آپ چاہتے تو از روئے قانون اپنے لیے خود جلاوطنی کی سزا تجویز کر سکتے تھے۔ جسے عدالت فوراً قبول کر لیتی۔ آپ کا حریف خاص میلیٹس یہی چاہتا ہے۔

سقراط: میرے نوجوان ہمدرد، مجھے معلوم ہے کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ میری تعلیم کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ ہر قیمت پر مجھے اپنے راستہ سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ اس لیے میں نے خود اپنی وکالت کرنا ضروری سمجھا۔ عدالت میں میرا بیان تم نے سنا ہوگا۔ میں مر جاؤں گا لیکن یہ آواز اخلاق زندہ رہے گی۔ صدیوں، صدیوں بعد بھی۔

کریٹو: اے عظیم دانشور! ہم آپ کو کھونا نہیں چاہتے۔ ابھی ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ ایتھنز کو آپ کی ضرورت ہے۔ شہریوں کی مجلس کے ظلم سے نجات دلانے کا رستہ میں نے اور میرے دوستوں نے نکال لیا ہے۔

فیڈو: وہ کیا؟

کریٹو: ساحل پر خفیہ کشتیاں تیار کھڑی ہیں۔ ہمارے گرم خون کے لیے یہاں سے اپنے باپ کو نکال لے جانا کیا مشکل ہے۔

زینوفن: ہاں! میرے آقا یہ اچھی ترکیب ہے۔

سقراط: میرے دوستو! ریاست کے قانون کا احترام، بہرطور لازم ہے۔ یاد رکھو! سچائی کے لیے جان دینا، سچائی کے لیے بھاگ جانے سے بہتر ہے۔

جیل کا داروغہ: اے بوڑھے فلسفی! سورج غروب ہو رہا ہے۔ میں نے ہملاک تیار کر لیا ہے۔ آپ تیار ہو جائیں۔ جس کسی سے کچھ کہنا سننا ہو، کہہ لیں۔

مجھے افسوس ہے، مجھے افسوس ہے۔

سقراط: تمہیں افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم صرف اپنے فرائض بجا لا رہے ہو، تم ایک اچھے شہری ہو۔

زینوفن: میرے آقا (روتے ہوئے) اب کیا ہوگا؟

سقراط: حوصلہ رکھو، میرے بچے۔

داروغہ: یہ لیجیے (پیالہ دیتا ہے)۔

سقراط: سورج چھپتے ہی تم پیالہ لے آئے۔ تم نے اچھا کیا۔ تم فرض شناس ہو اچھے شہری (آہستہ آہستہ زہر پیتا ہے)۔

زینوفن: جی میرے آقا!۔

سقراط: مجھے یاد پڑتا ہے کہ بہت دن ہوئے ہیں میں نے دیوتاؤں کی ایک منت مانی تھی۔ تم ایک جانور قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دینا۔ (کئی نوجوان سسکیاں بھرتے ہیں، سقراط بھاری قدموں سے چل رہا ہے)۔

دوستو! (حاضرین کو مخاطب کر کے):

''میری آخری بات سنو! اپنے آپ کو پہچانو، سچائی کو تلاش کرتے رہو، روشنی کا سفر جاری رکھو۔

(پردہ گرتا ہے)۔

پس منظری آوازیں

سقراط مر گیا۔

سقراط زندہ ہے۔



چوتھا حصہ

تھنکرز فورم

Thinkers Forum

سوچنے سمجھنے کی مشقیں

Exercises in Thinking

- جاننے اور سمجھنے میں کیا فرق ہے؟
- معلومات اور علم میں کیا فرق ہے؟

ے ہے دوڑتا اشہب زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

طلب کا تازیانہ سے کیا مراد ہے؟

- استاد کے تین روپ ہیں، مدرس، معلم اور مربی۔ کس رول کی اہمیت زیادہ ہے اور کیوں
- شاہد اور شہید دونوں لفظوں کا تعلق شہادت یا گواہی سے ہے۔ دونوں میں فرق کیا ہے؟
- کسی ایسے کام کی مثال دیجیے جو جرم ہو، گناہ نہ ہو، اور ایسے کی جو گناہ ہو، جرم نہ ہو اور ایسے کام کی بھی جو گناہ بھی ہو اور جرم بھی؟
- آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟
- جیسی روح ویسے فرشتے، اس ضرب المثل کا کیا مفہوم ہے؟
- بعض لوگ دوسروں کی عزت کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ کیوں؟
- کسی دانشور کا قول ہے:

"علم کی کمی خلوص سے پوری ہو جاتی ہے لیکن خلوص کی کمی کسی چیز سے پوری نہیں ہوتی۔" کیوں؟

- اقبال رحمہ اللہ کا شعر ہے:

ے شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تُو، تو نہیں خطرہ افتاد

پُر دم ہونے سے کیا مراد ہے؟

- غالب کا شعر ہے:

ے بسکہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

آدمی اور انسان میں کیا فرق ہے؟

- غالب نے کہا:

ع بخش دو گر خطا کرے کوئی

آخر کیوں؟

- پریم چند نے ایک افسانہ میں لکھا ہے:

''سزا غلطیوں کی دی جانی چاہیے نہ کہ خامیوں کی۔'' خامی اور غلطی میں کیا فرق ہے؟''

- علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کا شعر ہے:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

بحث کیجیے۔

- اس شعر میں

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں نظر میں اذان سحر میں

خبر، نظر اور اذان سحر سے کیا مراد ہے؟

- علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ نے اسرار خودی میں لکھا ہے:

''سوال سے خودی ضعیف ہوتی ہے۔'' کس طرح؟

-

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دُشوار ہو جائے

سوال یہ ہے کہ آخر کیوں؟

- غالب کا مصرعہ ہے:

ع یہ چشم تنگ شائد کثرت نظارہ سے وا ہو

چشم تنگ اور کثرت نظارہ سے کیا مراد ہے؟

- حالی کا شعر ہے:

؎ زمانہ کی خو ہے نکتہ چینی
کچھ اس کی پروا نہ کیجیے گا

نکتہ چینی کی نفسیات کیا ہے؟

- حالؔی کا شعر ہے:

؎ فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

انسان بننا فرشتہ سے بڑھ کر کیوں ہے؟

- ایک شعر ہے (جو اقبال رحمہ اللہ کا نہیں):

؎ تندیٔ باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کے لیے

تندیٔ باد مخالف کی کیا اہمیت ہے؟

- غالبؔ نے کہا ہے:

ع جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

کیوں؟

- غالبؔ نے کہا:

ع کام اچھا ہے وہی جس کا مآل اچھا ہے

کیوں؟

- غالبؔ کا مصرعہ ہے:

ع ہے خیال حسن میں حسن عمل کا خیال

یہ کیا فلسفہ ہے؟

- خلیل جبران کا ایک فقرہ ہے:

''تم اپنی محبت اپنے بچوں کو دو جس قدر دے سکو۔ مگر اپنا تخیل نہ دو۔ وہ اپنا تخیل اپنے ساتھ لاتے ہیں۔''

سوال یہ ہے کہ تخیل کیوں نہیں دینا چاہیے؟

- اقبال رحمہ اللہ کا شعر ہے:

ے ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

صرف مسجد میں؟

- اقبال رحمہ اللہ کا شعر ہے:

ے صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

پابندی میں آزادی حاصل کرنے کا فلسفہ کیا ہے؟

- اقبال رحمہ اللہ کا مصرعہ ہے:

ع اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

من میں ڈوبنے کا کیا مطلب ہے؟

- اقبال رحمہ اللہ کا مصرعہ ہے:

ع سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

سوال یہ ہے کہ کس طرح؟

- اقبال رحمہ اللہ کا شعر ہے:

ے غواص محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرہ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

سوال یہ ہے کہ محبت کی غواصی میں اتنے خطرات کیوں ہوتے ہیں؟

- اقبال رحمہ اللہ کا شعر ہے:

ع زاغوں کے تصرف میں عقابوں کا نشیمن

کیا مطلب؟

- اقبال رحمہ اللہ کا شعر ہے:

ے پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اس شعر میں ''فضا'' اور ''جہاں'' سے کیا مراد ہے؟ ''کرگس'' اور ''شاہیں'' کس چیز کی علامتیں ہیں؟

- اقبال رحمہ اللہ کا شعر ہے:

ؔ زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

- اقبال رحمہ اللہ کا شعر ہے:

ؔ سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوق پرواز ہے زندگی

- اقبال رحمہ اللہ نے کہا:

ع زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ

کوہ کن کے دل سے ہی کیوں؟

- غالبؔ کا شعر ہے:

ؔ طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

مے انگبیں سے کیا مراد ہے؟

- حالیؔ کا شعر ہے:

ؔ کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

تنہائی بڑے آدمیوں کا مقدر کیوں ہوتی ہے؟

- ''آوازِ دوست'' میں مختار مسعود نے لکھا ہے:

''دل شکر سے لبریز ہو تو روشن ہو جاتا ہے۔ شکوہ کیجیے تو بجھ جاتا ہے۔ ناشکر گزار ہو تو پتھر بن جاتا ہے۔''

سوال یہ ہے کہ کیوں؟

- ''آوازِ دوست'' کا فقرہ ہے:

''بعض آدمیوں کی زندگی میں بڑائی کا ایک دن آتا ہے۔ اس دن کے ڈھلنے کے بعد ممکن ہے کہ ان کی باقی زندگی اس بڑائی کی نفی میں گزر جائے۔''

اس میں کیا نکتہ ہے؟

- خلیل جبران نے لکھا ہے:

"جس کے ساتھ تم نے قہقہے لگائے ہیں اسے بھول سکتے ہو، لیکن جس کے ساتھ تم نے آنسو بہائے ہیں اسے نہیں بھول سکتے۔"

کیوں؟

- اقبال رحمہ اللہ کا شعر ہے:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

طوفان سے کیا مراد ہے؟

- حالؔی کا شعر ہے:

حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

نشاط نغمہ و مے سے کیا مراد ہے؟ وقت صبح آنے کا کیا مطلب ہے؟

- حالؔی کا شعر ہے:

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالہ جرس کارواں رہے

محمل کس چیز کی علامت ہے؟

- لوحِ ایام (مختار مسعود) کا ایک فقرہ ہے:

"اس شخص سے ڈرو جسے اپنے نفس پر اختیار حاصل ہو۔"

کیوں؟

- نہج البلاغہ میں حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کا ایک قول یوں نقل کیا گیا ہے:

"جو شخص بصیرت رکھتا ہے وہ اپنے دماغ سے بھی دیکھتا ہے اور اپنے دل سے بھی۔ بے بصیرت شخص صرف آنکھ سے دیکھتا ہے۔"

کیوں؟



پانچواں حصہ

زندگی کی چند سچائیاں

- ❁ عقلمندی ہے
- ❁ ناسمجھی ہے
- ❁ کامیابی ہے
- ❁ بربادی ہے
- ❁ سکون ہے
- ❁ بے چینی ہے
- ❁ طاقت ہے
- ❁ کمزوری ہے

عقلمندی ہے

☆ کسی کو سمجھانے سے پہلے اسے سمجھنے کی کوشش کرنا عقلمندی ہے۔
☆ صورت حال خواہ کتنی بھی Provocative ہو، Reactive نہ ہونا عقلمندی ہے۔
☆ کسی شاعر کا مصرعہ ہے:
''بات بھی کھوئی التجا کر کے''
التجا کر کے بات نہ کھونا عقلمندی ہے۔
☆ وہ جن سے کوئی اٹوٹ رشتہ یا تعلق ہو، اُنہیں شرمندہ نہ کرنا، عقلمندی ہے۔
☆ کسی کی Values کی خامیوں اور Temperament کی خامیوں میں فرق کرنا، عقلمندی ہے۔
☆ کسی میں علم کی کمی اور خلوص کی کمی میں فرق کرنا، عقلمندی ہے۔
☆ اپنے Motives کو از خود سختی سے Monitor کرتے رہنا، عقلمندی ہے۔
☆ اقبال رحمۃ اللہ نے دُعا کی:
''احساس عنایت کر آثار مصیبت کا''
آثار مصیبت کا بروقت احساس کر لینا، عقلمندی ہے۔
☆ ان Demands کو Examine کرتے رہنا جو ہم دوسروں سے کرتے ہیں، عقلمندی ہے۔
☆ نصیحت کرتے ہوئے اپنی مثال نہ دینا، عقلمندی ہے۔
☆ غالبؔ نے کہا تھا:

''ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے۔''

- ☆ دوسروں کے Criticism سے دل برداشتہ نہ ہونا، عقلمندی ہے۔
- ☆ بقول اقبال رحمہ اللہ:

''جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے۔''

- ☆ Performance Oriented عقلمندی ہے۔
- ☆ اپنوں سے مشورہ کرنا لیکن بحث نہ کرنا، عقلمندی ہے۔
- ☆ اپنی Holding Power کے گراف کا جائزہ لیتے رہنا عقلمندی ہے۔
- ☆ اپنی Priorities پر نظر رکھنا عقلمندی ہے۔
- ☆ غیر تو غیر، دوستوں سے بھی کوئی ایسا Favour نہ چاہنا جسے پورا کرنا ان کے لیے مشکل ہو، عقلمندی ہے۔
- ☆ ہوا کے رُخ کو سمجھنا، عقلمندی ہے۔



نا سمجھی ہے

- ☆ دوسروں کی عزت کو اپنی توہین سمجھنا نا سمجھی ہے۔
- ☆ غیر تو غیر اپنوں کی Patience کو بھی حد سے زیادہ آزمانا نا سمجھی ہے۔
- ☆ زندگی کے سفر میں Important کیا ہے اور Urgent کیا ہے، میں فرق نہ کرنا نا سمجھی ہے۔
- ☆ اپنی Wants اور Needs میں فرق نہ کرنا نا سمجھی ہے۔
- ☆ Reactive ہونا نا سمجھی ہے۔
- ☆ جو Message کسی کے رویہ میں مضمر ہو اسے سمجھنے میں دیر کرنا نا سمجھی ہے۔
- ☆ اپنا جو کام انسان خود نہ کرسکتا ہو یہ توقع رکھنا کہ کوئی دوسرا کر دے گا، نا سمجھی ہے۔
- ☆ ہر معاملہ میں ''آدھا گلاس خالی ہے'' کے رویہ سے شروع ہونا، نا سمجھی ہے۔
- ☆ بُرا ہونے اور محض کمزور ہونے میں فرق نہ کرنا، نا سمجھی ہے۔
- ☆ اختلاف اور مخالفت میں فرق نہ کرنا، نا سمجھی ہے۔
- ☆ یہ سمجھنا کہ کوئی قریب ہے تو فاصلہ نہیں ہوگا، نا سمجھی ہے۔
- ☆ یہ سمجھنا کہ نیت کا Message دوسرے تک نہیں پہنچے گا، نا سمجھی ہے۔
- ☆ یہ سمجھنا کہ جو سمجھتا بھی نہیں، نا سمجھی ہے۔
- ☆ مروّت کی عزت اور محبت کی عزت کے فرق کو نہ سمجھنا، نا سمجھی ہے۔
- ☆ کسی کی شرافت کو اس کی کمزوری سمجھنا، نا سمجھی ہے۔
- ☆ لڑ جھگڑ کر، ڈرا دھمکا کر یا لالچ دے کر کسی کو بدلنے کی کوشش کرنا، نا سمجھی ہے۔
- ☆ Pain اور Pleasure کی Sequencing نہ کرسکنا نا سمجھی ہے۔
- ☆ اپنے کسی نقصان، کمی، محرومی یا Handicap کو Highlight کرتے رہنا، نا سمجھی ہے۔
- ☆ صحیح بات صحیح وقت اور صحیح لہجے میں کرنے کے اصول کو نظر انداز کرنا، نا سمجھی ہے۔

کامیابی ہے

☆ قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:
''جو اپنی قدر کرتا ہے وہ وقت کی قدر کرتا ہے۔''
اپنے Time کو Manage کرنا، کامیابی ہے۔

☆ جو منزل پہ پہنچنا چاہتا ہے وہ اپنی Direction پر بھی نظر رکھتا ہے۔ Direction کو Manage کرسکنا، کامیابی ہے۔

☆ کامیابی کسی کو تحفے میں یا ورثہ میں نہیں ملتی، کامیاب لوگوں کی نفسیات کی ترجمانی غالب نے اس طرح کی ہے: ''جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر''۔

☆ کامیابی کی جستجو میں پتھروں پہ چلنا، پُر خار راستوں کو تلاش کرنا، کامیابی ہے۔

☆ زندگی کے باخبر شاعر اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی کی ایک بنیادی سچائی کو ان الفاظ میں بیان کیا: ''سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں''۔
سخت کوشی کی راہ میں Pain کو برداشت کرنا اور Pleasure کا انتظار کرنا، کامیابی ہے۔

☆ ایک گمنام شاعر نے اسی ابدی حقیقت کو اس طرح قلم بند کیا:

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دُشوار ہو جائے

زندگی کے سفر میں آسانیوں سے دامن بچا کر چلنا اور موج حوادث سے کھیلنا، کامیابی کی راہ ہے۔

☆ بُری تو بُری، اچھی سے اچھی بات بھی ایک حد تک اچھی ہوتی ہے۔

☆ زندگی کا اصل الاصول عدل ہے، Justice ہے۔

☆ ہر کام میں، ہر مرحلہ میں اعتدال، کامیابی ہے۔

☆ شاعر و مفکر، اقبال رحمہ اللہ کا ایک فکر انگیز فقرہ ہے:

''سوال سے خودی ضعیف ہوتی ہے''۔

سوال نہ کرنا، اپنی خودی ضعیف نہ ہونے دینا اپنے Human Resource کو Develop کرتے رہنا کامیابی ہے اور بہت اہم کامیابی ہے۔

☆ جب کافوری شمعیں بجھ چکی ہوں اور اندھیرا گہرا ہو تو اپنے حصے کا، مٹی کا دیا جلا دینا، کامیابی ہے اور بہت بڑی کامیابی ہے۔

☆ مایوسیوں کے موسم میں، خزاں کی پت جھڑ میں امید بہار رکھنا اور سرخ گلابوں کے انتظار میں نئی قلمیں لگاتے رہنا کامیابی ہے اور بڑی کامیابی ہے۔

☆ زندگی کو گہرائی میں جا کر سمجھنے والے شاعر ابن انشاء نے کہا:

''دروازہ کھلا رکھنا
چوکھٹ پر دیا جلا رکھنا''
بہار ہو کہ خزاں
دل کا دروازہ کھلا رکھنا

اور چوکھٹ پہ محبت کا دیا جلا رکھنا، کامیابی ہے اور بڑی عظیم کامیابی ہے۔



بربادی ہے

☆ اپنی Wants اور Needs میں فرق نہ کرنا، بربادی ہے۔
☆ اپنی ترجیحات Priorties پر نظر نہ رکھنا بربادی ہے۔
☆ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑا سمجھنا خود اُلجھنا اور دوسروں کو اُلجھا رکھنا بربادی ہے۔
☆ وقت دولت ہے، اپنے وقت کو ضائع کرنا بربادی ہے۔
☆ اصل سرمایہ اصل Capital وہ صلاحیتیں ہیں جو انسان کے اندر ہوتی ہیں، اپنی صلاحیتوں کو زنگ لگنے دینا بربادی ہے۔
☆ اپنے اندر نہ جھانکنا اپنے اندر کے سونے کے ذرّوں کو نہ ڈھونڈنا بربادی ہے۔
☆ اپنے آپ کو Devalue کرنا، اپنے آپ کو کم سمجھنا بربادی ہے۔
☆ اپنا سہارا چھوڑ کر اجنبی سہاروں کا انتظار کرتے رہنا، بربادی ہے۔
☆ اقبال رحمۃ اللہ نے خدا سے دُعا کی:

''احساس عنایت کر آثار مصیبت کا''

آثار مصیبت کا احساس نہ کرنا، بربادی ہے۔
☆ اپنی ناکامیوں کے لیے Scape Goat تلاش کرنا، بربادی ہے۔
☆ نظر کو محدود اور دل کو تنگ کر لینا، بربادی ہے۔
☆ حدیثِ رسولِ حکیم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے:

''بے شک وہ خسارے میں رہا جس کا آج کل سے بہتر نہیں۔''

اپنے آج کو گزرے ہوئے کل سے بہتر بنانے کے لیے C.Q.I کے لیے مسلسل

جدو جہد نہ کرنا، بربادی ہے۔

☆ زندگی انعام بھی ہے، آزمائش بھی، آزمائش کی گھڑی میں دل چھوڑ بیٹھنا، بربادی ہے۔

☆ حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

''تکلیف اُٹھا لینا بہتر ہے ذلت اُٹھانے سے۔''

عزت بچانے کے لیے تکلیف اٹھانے سے بچنا بے عزتی ہے، بربادی ہے۔

☆ اقبال رحمہ اللہ نے کہا:

''غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں''

غیرت افراد کی بھی ہوتی ہے اور قوم کی بھی، غیرت کا حق ادا نہ کرنا بے حسی ہے، بربادی ہے۔

☆ جہاں رہنا اکتائے ہوئے سے رہنا، اپنے اوپر مایوسی طاری رکھنا زندگی کی نفی ہے، بربادی ہے۔

☆ سب سے بڑی قوت یقین ہے، بے یقینی بے دلی، بربادی ہے اور بڑی گھمبیر بربادی ہے۔



سکون ہے

☆ محنت میں سکون ہے۔
☆ مروّت میں سکون ہے۔
☆ خدمت میں سکون ہے۔
☆ ان اللّٰہ مع الصابرین (سورۃ البقرۃ، آیت:153)
☆ صبر میں سکون ہے۔
☆ برداشت، Patience میں سکون ہے۔
☆ فائدہ ہو کہ نقصان شکر ادا کرنے میں سکون ہے۔
☆ تکلیف ہو کہ آرام، الحمدللہ کہنے میں سکون ہے۔
☆ ''دروازہ کھلا رکھنا چوکھٹ پہ دیا جلا رکھنا، دل کا دروازہ'' کھلا رکھنے میں سکون ہے۔
☆ چوکھٹ پہ محبت کا دیا جلائے رکھنے میں سکون ہے۔
☆ ''بخش دو گر خطا کرے کوئی'' بخش دینے میں سکون ہے۔
☆ ''ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے''
کوئی اچھا کہے یا بُرا، اپنے کام سے کام رکھنے میں، سکون ہے۔
☆ ''زندگی آزمائش بھی ہے اور انعام بھی۔''

(رشید احمد صدیقی)

☆ آزمائشوں کے لمحوں میں ثابت قدم رہنے میں، سکون ہے۔
☆ اور انعام کا شکر بار بار ادا کرنے میں، سکون ہے۔

☆ **انما الاعمال بالنیات.**

(حدیث نبوی ﷺ)

☆ نیت کو شفاف رکھنے میں سکون ہے۔

☆ ''مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا۔''

(نعت رسول رحمت ﷺ)

☆ مصیبت میں غیروں کے کام آنے میں، سکون ہے۔
''وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا''

(نعت رسول کریم ﷺ)

☆ اپنے پرائے کا غم کھانے میں، سکون ہے۔
''مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی۔''

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)

☆ گرتوں کو تھام لینے میں سکون ہے۔

☆ کسی عظیم مقصد کی خاطر قربانی دینے میں سکون ہے اور بڑا وقیع سکون ہے۔



بے چینی ہے

☆ خود غرضی میں بے چینی ہے۔
☆ نیت کے کھوٹ میں بے چینی ہے۔
☆ کسی کا بُرا چاہنے میں بے چینی ہے۔
☆ انعام کی تمنا میں بے چینی ہے۔
☆ تعریف کی خواہش میں بے چینی ہے۔
☆ Pain اور Pleasure کی Sequencing نہ کر سکنے میں بے چینی ہے۔
☆ Trust نہ کرنے میں، بے چینی ہے۔
☆ Tolerate نہ کرنے میں بے چینی ہے۔
☆ Self Devaluation میں بے چینی ہے۔
☆ Prize Oriented ہونے میں بے چینی ہے۔
☆ ''بعض بدگمانیاں گناہ کے زمرہ میں آتی ہیں۔'' (القرآن)
☆ بدگمانی کرنے میں بے چینی ہے۔ سرمایہ تعمیر یقیں ہے، بے یقینی بے چینی ہے اور بڑی گھمبیر بے چینی ہے۔



طاقت ہے

- ☆ سچ سننا طاقت ہے۔
- ☆ اپنی غلطی ماننا طاقت ہے۔
- ☆ Trust طاقت ہے۔
- ☆ Tolerance طاقت ہے۔
- ☆ Sincerity سکون ہے، طاقت ہے۔
- ☆ Discipline طاقت ہے۔
- ☆ یہ یقین کہ I Can طاقت ہے۔
- ☆ اور یہ عزم کہ I Will طاقت ہے۔
- ☆ جس سے اختلاف ہو جو حریف ہو۔اس کی کسی Quality کی کھلے دل سے تعریف کرنا طاقت ہے۔
- ☆ اپنے فیصلے آپ کرنا طاقت ہے۔
- ☆ اپنے فیصلوں کے Consequences کو Own کرنا، طاقت ہے۔
- ☆ اپنی نیت کو مسلسل Monitor کرتے رہنا، طاقت ہے۔
- ☆ دوسرے کا رویہ صحیح ہو یا غلط اپنا رویہ صحیح رکھنا، طاقت ہے اور بڑی بنیادی، طاقت ہے۔
- ☆ Power رکھتے ہوئے اچھے بُرے کا، صحیح اور غلط کا فرق قائم رکھنا طاقت ہے اور بڑی قابل فخر طاقت ہے۔
- ☆ کسی Pleasure کا انتظار کر سکنا طاقت ہے اور بڑی Crucial طاقت ہے۔
- ☆ اپنے Vision اپنی Will سے قربانی دینا، طاقت ہے اور بڑی عظیم طاقت ہے۔



کمزوری ہے

- ☆ خودغرضی کمزوری ہے۔
- ☆ Jealousy کمزوری ہے۔
- ☆ Distrust کمزوری ہے۔
- ☆ Intolerance کمزوری ہے۔
- ☆ نیت کا کھوٹ بے چینی ہے، کمزوری ہے۔
- ☆ اپنی غلطی پر اڑنا، کمزوری ہے۔
- ☆ دوسرے کی عزت کو اپنی توہین سمجھنا، کمزوری ہے۔
- ☆ کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا، کمزوری ہے۔
- ☆ کسی کو غلط فہمی میں رکھنا، کمزوری ہے۔
- ☆ غلط اُمید دلانا، کمزوری ہے۔
- ☆ جب کہنے کا وقت ہو تو چپ رہنا، کمزوری ہے۔
- ☆ جب Initiative لینے کا وقت ہو تو سوچتے رہنا، کمزوری ہے۔
- ☆ Convention کا، لکیر کا فقیر ہونا، کمزوری ہے۔
- ☆ سہارے ڈھونڈتے رہنا، کمزوری ہے۔
- ☆ اپنی سوچ دوسروں سے لینا، کمزوری ہے۔
- ☆ Self-Devaluation کمزوری ہے اور بڑی بنیادی کمزوری ہے۔
- ☆ بے یقینی کمزوری ہے اور بڑی گھمبیر کمزوری ہے۔



چھٹا حصہ

درس زندگی

Exercises In Awareness

 روشنی اے روشنی

 خزینہ دانش

In Search of Wisdom

 دانائی کی تلاش

روشنی اے روشنی

Exercise in Thinking

☆ فرق ہے:
آدمی اور انسان میں

بسکہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(غالب)

فرشتہ سے بہتر ہے انساں بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

(حالی)

☆ انسانم آرزو است

مجھے انسان کی تلاش ہے

(اقبال)

☆ فرق ہے:
اچھے انسان اور عظیم انسان میں
اچھی شاعری اور عظیم شاعری میں
آرٹ برائے آرٹ اور آرٹ برائے زندگی میں

☆ فرق ہے:
شخص اور شخصیت میں

Person اور Personality میں
ذاتی امتیازات Personal Attributes اور شخصیت کے امتیازات
Personality
کی Traits میں

☆ فرق ہے:

Personality کی Limits اور Limitations میں۔

☆ فرق ہے:

Careful ہونے اور Meticulous ہونے میں۔

☆ Selff Image اور Self-Confidence میں۔

☆ فرق ہے:

Confident ہونے اور Complacent ہونے میں Efficient ہونے اور Effective ہونے میں Sense of Prioriities اور Sense of Purpose میں Duty اور Obligation میں۔

☆ فرق ہے:

Impressive ہونے اور Inspiring ہونے میں۔

☆ فرق ہے:

Aims اور Goals میں Goals اور Objectives میں Strategy اور Tactics میں۔

☆ فرق ہے:

Honesty کو Best Policy سمجھنے اور Best Principle سمجھنے میں۔

☆ فرق ہے:

مقابلہ ہارنے اور حوصلہ ہارنے میں
ہار جانے اور ہار ماننے میں
ناامید ہونے اور مایوس ہونے میں

؎ اڑتے اڑتے یاس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی
مزاجوں میں پاس آ گئی ہے ہمارے
نہ مرنے کا غم نہ خوشی زندگی کی

(میر)

☆ فرق ہے:

خامی اور خطا میں

(سزا خطاؤں کی ہوتی ہے نہ کہ خامیوں کی)

☆ فرق ہے:

عبادت میں اور خدمت میں

(عبادت کی قضا ہے، خدمت کی نہیں)

☆ فرق ہے:

Character اور Personality Pattern میں

Character اور Conduct میں

Character اور Weak Character میں

Moral اور Physical Courage میں

Courage اور Conviction میں

☆ فرق ہے:

قبول یا Accept کرنے اور برداشت یا Tolerate کرنے میں شک نہ کرنے اور اعتماد کرنے میں۔

☆ فرق ہے:

اہل دانش اور اہل نظر میں

(اہل دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر)

(اقبال)

☆ فرق ہے:

پڑھا لکھا ہونے اور سمجھدار ہونے میں

illiterate اور Uneducated میں

ان پڑھ ہونا اور بات ہے، ناسمجھ ہونا اور

اصل چیز Awareness ہے جو Exposure سے حاصل ہوتی ہے۔

☆ فرق ہے:

Intelligent اور Mature ہونے میں

ذہانت اور فراست میں۔

☆ فرق ہے:

Ideal بنانے اور Idol بنانے میں۔

Learning To Lead اور Leading To Learn میں۔

Direction اور Drift میں۔

☆ فرق ہے:

قابل یا Capable ہونے اور قابل اعتماد یا Reliable ہونے میں

Chronological اور Mental age میں

Sensitive اور Sensible ہونے میں

☆ فرق ہے:

بُرا ہونے اور کمزور ہونے میں

(He is not bad, he is only weak)

☆ فرق ہے:

بُرائی کو بُرائی سمجھنے اور برائی کو Rational کرنے میں

(جب تک انسان بُرائی کو بُرا سمجھتا رہے وہ بُرا نہیں ہوتا)۔

☆ فرق ہے:

کوئی تکلیف نہ ہونے اور خوش ہونے میں

آرام، سکون اور آسودگی میں

Satisfactory ہونے اور Satisfy ہونے میں۔

☆ فرق ہے:

خبر اور نظر میں

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں، نظر میں، اذان سحر میں

(اقبال)

☆ فرق ہے:

معلومات یا Information اور علم یا Knowledge میں

علم حاصل کرنے اور علم پیدا کرنے میں

رٹنے اور سمجھنے میں

جاننے اور سمجھنے میں

نہ سمجھ پانے اور سمجھنا نہ چاہنے میں

علم حاصل کرنے اور نمبر حاصل کرنے میں

(علم حاصل ہوتا ہے... سمجھنے سے، غور کرنے سے، تلاش و جستجو سے، مشاہدہ سے، تجربہ سے، تجزیہ سے)

☆ فرق ہے:

اچھے استاد اور عظیم استاد میں

Teaching Skills اور Basic Life Skills میں

☆ فرق ہے:

Reproductive اور Creative Teaching میں

☆ فرق ہے:

Creative سوال اور Reproductive جواب میں۔

☆ فرق ہے:

مدرس و Instructor اور معلم اور Educator میں

معلم و Educator اور مربی اور Monitor میں

☆ فرق ہے:

غلطی پکڑنے اور غلطی بتانے میں

نصیحت کرنے اور اصلاح کرنے میں

☆ فرق ہے:

محبت اور مروّت میں

جاننے اور پہچاننے میں

محبت کرنے اورعزت کرنے میں

(جومحبت شخصیت کے حوالے سے پیدا ہوتی ہے وہ بہت پائیدار ہوتی ہے)۔

 فرق ہے:

قریب ہونے اور فاصلہ ہونے میں

(وہ جوقربتوں نے بڑھا دیئے کبھی کم ہوئے نہ وہ فاصلے)

قریب نہ ہونے اور فاصلہ ہونے میں

 فرق ہے:

محبت کرنے اور Possessive ہونے میں

محبت کرنے ،عزت یاRespect کرنے

اور محض برداشت یاTolerate کرنے میں

 فرق ہے:

لاگ ہونے اور لاتعلق ہونے میں

(لاگ ہوتو اس کوہم سمجھیں لگاؤ)

(غالب)

(بے رخی بھی تعلق کی ایک صورت ہے)

 فرق ہے:

لاتعلق ہونے اور لاپروا ہونے میں

شکایت کرنے اور گلہ کرنے میں

 فرق ہے:

قانون کے تقاضوں اور انسانیت کے تقاضوں میں

 فرق ہے:

عدل اور انصاف میں

 فرق ہے:

انصاف، عدل اور احسان میں

 فرق ہے:

صلاحیتوں (Potential) کی برابری اور حقوق (Rights) کی برابری میں (مساوات یا Equality کا مطلب صلاحیتوں کی برابری نہیں، بنیادی حقوق کی قانونی برابری ہوتا ہے)۔

 فرق ہے:

Equality اور Equity میں

 فرق ہے:

مذہبی آدمی ہونے اور اخلاقی آدمی ہونے میں

 فرق ہے:

ناصح ہونے اور غم گسار ہونے میں

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

(غالب)

 فرق ہے:

ٹیکنالوجی میں Outdate ہونے اور Values میں Outdate ہونے میں

 فرق ہے:

Freedom for اور Freedom From میں

Freedom of Choice اور

Choice of Consequences میں (ہمارا اختیار Choice پر ہوتا ہے کسی Choice کے Consequences پر نہیں)۔

 فرق ہے:

اختیار اور اقتدار میں

نہ ماننے اور انکار کرنے میں

ماننے اور انکار نہ کرنے میں

 فرق ہے:

کسی رول Role کو دل سے قبول کرنے اور مجبوراً اختیار کرنے میں

؎ کعبہ کو چلا ہوں تو نظر سوئے دیر ہے
مڑ مڑ کے دیکھتا ہوں کوئی دیکھتا نہ ہو

اور......

ع ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)

☆ فرق ہے:

نصاب تدریس یا Syllabus اور

نصاب تعلیم یا Curriculum میں

Invisible یا Hidden Curriculum میں

(استاد خود ایک کیری کیولم ہوتا ہے)

☆ فرق ہے:

Conscious Motivation اور

Unconscious Motivation میں

☆ فرق ہے:

Critical Thinking اور

Critial Attitude میں

☆ فرق ہے:

Convergent Thinking اور

Divergent Thinking میں

☆ فرق ہے:

Reason کرنے اور Rationalise کرنے میں

Phobia اور Fear میں

Anxiety اور Worry میں

☆ فرق ہے:

Practical ہونے اور

Pragmatic ہونے میں

Generation Gap اور

Credibility Gap میں

Credibillity Gap اور Communication Gap میں

 فرق ہے:

Condition اور Conditioning میں

Classical Conditioning اور

Operant Conditioning میں

 فرق ہے:

Grace اور Glamour میں

 فرق ہے:

کوئی مسئلہ ہونے اور کسی چیز کو مسئلہ بنانے میں

 فرق ہے:

اقرار کی خاموشی اور انکار کی خاموشی میں

تائید کی خاموشی اور نفرت کی خاموشی میں

اعتراف کی خاموشی اور اعتراض کی خاموشی میں

(ایک خاموشی بے بسی کی خاموشی بھی ہوتی ہے)

(خاموشی کو سمجھنا ہی اصل سمجھنا ہے)

 فرق ہے:

ہنسی ہنسی میں

؎ پہلے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

(غالب)

 فرق ہے:

آنسو آنسو میں

ہر آنسو کی اپنی داستان ہوتی ہے

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو، بہتے ہیں اشک تو بہنے دو
جس سے بڑھے بے چینی دل کی، ایسی تسلی رہنے دو

(آرزو لکھنوی)

☆ فرق ہے:

Quality Control اور Quality Management میں

Quality Control اور Quality Audit میں

Quality Audit اور Quality Assurance میں

☆ فرق ہے:

Time Management اور Direction Management میں

Urgent کام میں اور Important کام میں

Continous Quality Improvement (C.Q.I)

اور Total Quality Management میں

☆ فرق ہے:

Theory, Concept, Principle اور Law میں

☆ فرق ہے:

Basic Life Skills

اور

Change Coping Skills میں

☆ فرق ہے:

کسی شخص، ادارہ یا چیز اور Commodity کی Catching Power

یا Attracting Power اور Holding Power میں۔



خزینہ دانش

In Search of Wisdom

☆ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ.
کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے؟

(القرآن)

☆ اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ.
کیا تم لوگ سوچتے نہیں؟

(القرآن)

☆ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ.
کیا وہ لوگ تدبر، غور و فکر نہیں کرتے؟

(القرآن)

☆ I Think therefore I am

(فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ(1596-1650)

☆ انسان کی امتیازی خاصیت اس کی سوچنے کی صلاحیت، اس کی Thinking ہے

"Those who think must govern those that toil"

(Goldsmith)

☆ Thinking دو قسم کی ہوتی ہے۔

Convergent Thinking اور Divergent Thinking

☆ Divergent Thinking بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔

Critical Thinking اور Creative Thinking

☆ Critical Thinking اور Critical Attitude میں فرق ہے۔

(Creative Thinking درحقیقت Cognitive ہوتی ہے۔

Critical Attitude بنیادی طور پر جذباتی (Emotional) رویہ ہوتا ہے)۔

☆ انسان دراصل وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ دل کی گہرائیوں میں سوچتا رہتا ہے۔

"As he Thinks in his heart, so he is."

(Old Testament)

☆ انسان کی Thinking کا اس کے رویوں ہی پر نہیں، اس کی صحت پر بھی براہ راست اثر پڑتا ہے۔

☆ انسان کی سوچ ہی سب کچھ ہے:

Nothing is good or bad, thinking makes.

(Shakspeare)

☆ Stream of Consciousness انسان کی اندرونی شخصیت کی غماز ہوتی ہے۔

☆ Exposure سے Awarness آتی ہے، آنکھیں کھلتی ہیں۔

؎ حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

(غالب)

☆ کھڑکی کے سامنے کھڑا ہونا۔
بہتر ہے آئینے کے سامنے کھڑا ہونے سے۔

(چینی کہاوت)

☆ علم کی کمی خلوص سے پوری ہو جاتی ہے، لیکن خلوص کی کمی کسی چیز سے پوری نہیں ہوتی۔

(رشید احمد صدیقی)

☆ استاد کی Competence کا Shortfall شاگرد Condone کر دیتے ہیں۔ لیکن اس میں خلوص کی کمی نالائق سے نالائق شاگرد بھی Condone نہیں کرتا۔

☆ استاد کی محبت سب سے بڑی اور سب سے اہم Teaching aid ہے۔

☆ طالب علم کا اصل مقابلہ اپنے آپ سے ہوتا ہے، دوسروں سے نہیں۔

☆ ''تم اپنی محبت اپنے بچوں کو دو جتنی دے سکو، مگر اپنا تخیل نہیں، ہر بچہ اپنا تخیل اپنے

ساتھ لاتا ہے۔''

(خلیل احمد جبران)

☆ قومیں تعلیمی اداروں سے بنتی ہیں اور اگر تباہ ہوتی ہیں تو وہیں تباہ ہوتی ہیں۔

"The battle of waterloo was won on the playing fields of Eton and Harrow:

☆ ہر انسان کا اپنا چیلنج ہوتا ہے، اس کی Limits اور Limitations کے حوالے سے۔

☆ کسی کو سمجھانے سے پہلے اس کو سمجھنا ضروری ہے۔

Seek to understand before seeking to be understood.

☆ جو خود نہ سمجھنا چاہے اسے آپ سمجھا نہیں سکتے۔

☆ Critical Thinking کی استعداد کسی میں پیدائشی طور پر نہیں ہوتی، اس کے لیے شعوری مشق کرنا پڑتی ہے۔

☆ علم بھی دو دھاری تلوار ہے۔

؎ علم را بر دل زنی یارے بود
علم را بر تن زنی مارے بود

(مولانا روم رحمہ اللہ)

☆ "Know thy self"

یہ پہلے پہل سقراط نے کہا تھا۔

☆ اپنے آپ کو جاننا جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل بھی۔ البتہ Friends, Family اور Colleagues میں آپ کی جو Image ہے اس کو جاننا زیادہ مشکل نہیں۔

☆ جس طرح بیج میں پیڑ چھپا ہوتا ہے اسی طرح انسان میں صلاحیتیں Talents چھپی ہوتی ہیں لیکن Unmapped Treasure island کی طرح!

☆ فرد ہو یا معاشرہ، تبدیلی اندر سے آتی ہے۔

☆ انسان آخر کار وہی کچھ بن جاتا ہے جو وہ شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے

آپ کو Suggest کرتا رہتا ہے۔اسی طرح Self-Image بنتی ہے۔

☆ جب کوئی کام کرنے کا ہو تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ مشکل ہے یا آسان، Pleasent ہے یا Un pleasent

ے
کہ جن سختیوں کو اٹھانا ہے مشکل
وہی ہیں کچھ اے دل اُٹھانے کے قابل

(حالی)

☆ ہر آدمی کی اپنی دُھن ہوتی ہے:
فرق اس سے پڑتا ہے کہ کس کی دُھن کیا ہے؟

ے
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)

ع
ہر دم مجھے تلاش نئے آسماں کی ہے

(سودا)

ع
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

(غالب)

ے
تندی باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لیے

(اثر صہبائی)

ے
چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

(اصغر گونڈوی)

☆ زندگی کی Marathon staple chase race میں کوئی ایک ہار، کوئی ایک جیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

Luck is a whole اور Life is a whole

☆ Optimist وہ ہے جو ہر Difficulty میں ایک Opportunity دیکھتا ہے اور

Pessimist وہ ہے جو ہر Opportunity میں ایک Difficulty دیکھتا ہے۔

☆ تکلیف گزر جاتی ہے، تخلیق باقی رہ جاتی ہے۔

"The pain passes but the pleasure of the creation of beauty remains."

(Renoir)

☆ کامیابی Concentration میں ہے۔

کوئی قوت، Will کی قوت سے زیادہ Effective نہیں ہوتی۔

☆ اصل کام اپنے Roles کو Balance کرنا ہے۔

☆ جسے آگے بڑھنا ہو وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔

☆ کام کرنے اور اس کی Understanding ہونے میں فرق ہے۔

☆ Clock یعنی Time Management کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن اصل چیز Direction Management یعنی Compass ہے۔

☆ Self-Devaluation میں فرد ہی نہیں، پوری قوم بھی مبتلا ہو سکتی ہے۔

☆ کام کے چار Quadrants ہوتے ہیں:

1. Urgent Important
2. Urgent not Important
3. Important urgent
4. Important not urgent

☆ بعض لوگوں کی ساری زندگی Urgent لیکن Not Important کاموں کے پیچھے دوڑتے گزر جاتی ہے۔

☆ زندگی کی بہت سی منزلوں میں کامیابی کے لیے Communication Skill بہت Count کرتی ہے۔

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کار گر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

(غالب)

☆ سچ سننا، سچ کہنے سے بھی مشکل تر مرحلہ ہے۔ مشتاق یوسفی کا فقرہ ہے:
''بات بہت بُری لگی، سچ ہوگی۔''

☆ آدمی کے ارادے کی تکمیل میں اس کی شخصیت کی چار صفتیں بروئے کار آتی ہیں۔ دو ارادے سے پہلے اور دو ارادے کے بعد۔ ارادے سے پہلے تو اس کی خودمختاری اور اس کی قوت فیصلہ آشکارا ہوتی ہے۔ ارادے کے بعد اس کی مضبوطی اور اس کا ثبات۔

☆ بعض لوگ اپنی صلاحیتوں کے قابو میں ہوتے ہیں۔ حالانکہ بات صلاحیتوں کو قابو میں رکھنے سے ہی بنتی ہے۔

☆ نئی بنیادیں وہی لوگ بھر سکتے ہیں جو اس راز سے واقف ہوں کہ پرانی کیوں بیٹھ گئیں۔

(مختار مسعود)

☆ بعض آدمیوں کی زندگی میں بڑائی کا ایک دن آتا ہے۔ اس دن کے ڈھلنے کے بعد ممکن ہے ان کی باقی زندگی اس بڑائی کی نفی میں گزر جائے۔

(مختار مسعود)

☆ عزیز رکھنے کی چیز صحت ہے نہ کہ زندگی، وہ بھی کارِ خیر کے ساتھ۔

☆ Tension عموماً Counter-productive ہوتا ہے۔

☆ Tension میں انسان کی سوچ کی سوئی رُک جاتی ہے۔

☆ Tension کسی Obsession کے نتیجے میں Brooding سے پیدا ہوتی ہے۔

☆ Tension دشمن ہے صحت کا، خوشی کا اور Efficiency کا۔

☆ Tense ماحول میں کام نہیں ہوسکتا۔

☆ ''سوال سے خودی ضعیف ہوتی ہے۔''

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)

☆ زندگی میں ہر انسان کے Contribution کی اپنی صورت ہوتی ہے۔

☆ حسن ہو، ذہانت یا کوئی اور خداداد صلاحیت، اسے Overexpose یا Overproject نہ کرنا ہی فراست ہے۔

☆ انسان کی کامیابی یا ناکامی کا آخری Test یہ ہے کہ اس نے دنیا کو کس حالت میں پایا اور جب چھوڑا تو کتنا بہتر چھوڑا۔ خواہ یہ فرق کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔

☆ زندگی کا Challenge ہر ایک کے لیے یکساں نہیں ہوتا۔ ہر ایک کی Limits اور Limitaions مختلف ہوتی ہیں۔

☆ معاف کر دینا انسان کے اختیار میں ہوتا ہے، بھلا دینا نہیں۔ خصوصاً کسی Traumatic experience کو۔ معاف کر دینا Moral descretion ہے، بھلا دینا Psychological Process ۔

؎ یاد ماضی عذاب ہے یا ربّ
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

☆ ناصح بننا آسان ہوتا ہے، غم گساری مشکل

؎ یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

☆ لیڈر کی پہچان ہے۔

Selflessness, truthfulness, vision and commitment.

لیکن Effective ہونے کے لیے Charismatic personality بھی چاہیے۔

☆ پسند و ناپسند کی جڑیں اکثر Emotions میں یا Conditioning میں ہوتی ہیں۔

☆ Jealousy عموماً Inferiority Complex کا نتیجہ ہوتی ہے۔

☆ ایک ہی واقعہ ایک شخص کو ایک طرح متاثر کرتا ہے، دوسرے کو دوسری طرح۔

☆ غلط امید رکھنا نادانی ہے اور غلط امید دلانے کی وجہ Moral Courage کی کمی ہوتی ہے یا پھر Sheer Dishonesty۔

☆ اگر انکار کے سوا کوئی اور Option نہ ہو تو شروع کا Blunt انکار، بعد کی بہت تکلیف دہ Embarrassment سے بچا لیتا ہے۔

☆ سیرت میں کوئی خامی رہ جاتی ہے تو تنگ دستی میں بالضرور اور بڑی شدت سے

اُبھرتی ہے۔

☆ دولت اور فراغت سے اشخاص بدلتے نہیں، بے نقاب ہوتے ہیں۔

(رشید احمد صدیقی)

☆ آگ سے آگ نہیں بجھتی، نفرت سے نفرت ختم نہیں ہوتی۔

(بھگت کبیر)

☆ دنیا با قاعدہ ہے، بے قاعدہ نہیں۔ Law of farm زندگی کے ہر شعبہ میں کام کرتا ہے۔

☆ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ دُنیا Principles کے تابع ہے، اس میں Humility آ جاتی ہے۔

☆ اچھے بُرے لوگ مر جاتے ہیں لیکن ان کے اچھے بُرے کام نہیں مرتے۔ ان کے کاموں میں اچھے بُرے اثرات باقی رہتے ہیں۔ جس طرح خیر جاریہ ہوتا ہے اسی طرح شر جاریہ بھی ہوتا ہے۔

☆ جس طرح ''Life is a whole'' اسی طرح ''Integrity is a whole'' اسے ٹکڑوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ یا تو زندگی میں Integrity ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔

☆ زندگی میں ہم جس شخص کے متعلق سمجھتے ہیں کہ اسے اپنے نفس پر اختیار حاصل ہے اس کی ہم بڑی عزت کرتے ہیں۔

☆ ''جس کا آج کل سے بہتر نہیں، وہ خسارے میں رہا۔''

(حدیث رسول حکیم ﷺ)

☆ خوب سے خوب تر کی جستجو اور

Quality quest, continuous quality improvement, total quality management

کے نئے Concept اسی حدیث نبوی ﷺ کی بازگشت ہیں۔

☆ ایک عظیم انسان اپنی شکست میں بھی زندہ رہتا ہے۔

☆ ماحول کا اثر اپنی جگہ، لیکن ماحول کا کوئی Constraint انسان کے Vision اور

Will سے بڑا نہیں ہوتا۔

☆ ماحول کا اثر ہر انسان پر یکساں نہیں ہوتا۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)

☆ ایران کی مہم میں سکندر اعظم نے کہا تھا:

I don't want to steal victory.

☆ ایران سے ہندوستان آتے ہوئے جب فارسی کے مشہور شاعر عرفی کے دیوان کا مسودہ دریائے کابل میں غرقاب ہوا تو اس نے کہا تھا:

''الحمدللہ! ناگفتہ باقیست!''

☆ Freedom کا مطلب ہے، Freedom to choose

☆ ایک نیا تصور حیات سیاسی اور معاشرتی زندگی کی بنیادوں تک کو ہلا دیتا ہے۔

☆ First Things First اس طرح شروع ہوتی ہے۔

To live, to love, to learn, and to legacy.

☆ آخر کار انسان Creature of Impulse ہی تو ہے۔

☆ بعض لوگ دوسروں کی عزت کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

(رشید احمد صدیقی)

☆ بیشتر خواب پرانی اور لاشعوری Conditioning کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

☆ لاشعوری خوف شعوری خوف سے زیادہ بے چین رکھتا ہے۔

☆ چونکہ بزرگوں کی ٹیکنالوجی Out-date ہو جاتی ہے۔ اس بنا پر نئی نسل کے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی قدریں بھی دور از کار ہو گئی ہیں اور زندگی کا تجربہ بھی Irrelevant ہو گیا ہے۔

☆ چھوٹے آدمی چھوٹی چیزوں کو بڑا سمجھتے ہیں۔

"These little things are great to little men."

(Goldsmith)

☆ وقت گزرنے کے ساتھ کچھ لوگوں کی قدر بڑھتی ہے اور کچھ کی گھٹتی ہے۔

☆ دیر تک پرکشش رہنے کا تعلق شخصیت سے ہوتا ہے۔

☆ سب سے مشکل آرٹ اور سب سے اچھا آرٹ زندگی گزارنے کا آرٹ، Art of living ہے اور اس کا بھی سب سے مشکل مرحلہ ہے۔

Growing old gracefully.

☆ شخصیت کی ایک جھلک آواز میں بھی ہوتی ہے۔

☆ ''لہجے کا اثر الفاظ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔''

(الغزالی)

☆ ''نام میں کیا رکھا ہے۔''

یہ قول بڑی حد تک صحیح ضرور ہے لیکن نام کی Image کے Impact سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

☆ ہنسی تازہ ہوا کا جھونکا ہے لیکن ہر آنسو کی اپنی داستاں ہوتی ہے۔

ے تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے کچھ ہنسی نہیں ہے

☆ جو تمہارے ساتھ ہنستا ہے تم اسے بھول سکتے ہو، لیکن جس نے تمہارے ساتھ آنسو بہائے ہیں اسے نہیں بھلا سکتے۔

(خلیل احمد جبران)

☆ مختلف انسانوں کو ملال، افسوس اور دُکھ مختلف حوالوں سے ہوتا ہے۔

☆ ایک Tense آدمی دوسرے کو Tense کر کے چھوڑتا ہے۔

ع افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

☆ Imagine کرنے سے لطف بھی ملتا ہے اور اذیت بھی ہوتی ہے۔ برسوں پرانی Situation کو بھی Imagine کرنے سے انسان پر وہی کیفیت طاری ہو سکتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ Sub-conscious mind حقیقت (Reality) اور تخیل (Mere imagination) میں فرق نہیں کرتا۔

☆ Self-image مثبت یا منفی، Positive or Negative Suggestions

سے۔

☆ ''جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے۔''

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)

☆ جو سوچ سمجھ کر اختلاف کرتا ہے وہ اتفاق سے قریب تر ہوتا ہے۔

☆ جو انکار یا اقرار کسی کے رویہ میں مضمر ہو وہ زبان کے اقرار یا انکار سے زیادہ قابل اعتبار ہوتا ہے۔

☆ تکلیف اٹھا لینا بہتر ہے ذلت اٹھانے سے۔

(حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ)

☆ مولانا روم رحمہ اللہ نے اپنے آئیڈیل Life style کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

ع دست بہ کار دل بہ یار

اور علم کی حقیقت یوں بیان کی ہے:

؎ علم را بر دل زنی یارے بود
علم را بر تن زنی مارے بود

☆ لوگ تبدیلی Change تو چاہتے ہیں لیکن خود کو Change نہیں کرنا چاہتے۔

☆ ''مچھلی جب سڑتی ہے تو سر سے سڑتی ہے۔''

(چینی کہاوت)

☆ زندگی انعام بھی ہے، آزمائش بھی۔

(رشید احمد صدیقی)

؎ زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)

☆ Commitment کی زندگی نام ہی آزمائش کا ہے۔

؎ غواص محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرہ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)

☆ Committed انسان بہت مضبوط انسان ہوتے ہیں۔

☆ جتنا بڑا Commitment ہو اتنا زیادہ Concentration چاہتا ہے۔

☆ صحیح عمل کی بنیاد صحیح علم ہے۔

☆ کسی بات کا صحیح ہونا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اس کی Timing بھی صحیح ہونی چاہیے۔

☆ بدنیتی سے کیا ہوا اچھا کام بھی بُرا ہی رہتا ہے۔

☆ کسی کام کی وجہ اس کا جواز نہیں ہوتی۔

☆ محض نیک نیتی کسی غلط اقدام کو صحیح نہیں کرسکتی۔

Good faith میں کیا ہوا غلط کام، غلط ہی رہتا ہے۔

☆ ہر انسان ہر حوالے سے کامیاب ہو، یہ مشکل سے ہوتا ہے۔ کسی کو اولاد کے حوالے سے کامیابی حاصل ہوتی ہے، کسی کا خاص Contribuution اس کے Profession میں ہوتا ہے۔ کسی کی پہچان اس کی Creativity بنتی ہے اور کوئی بحیثیت انسان باعث خیر کثیر بنتا ہے۔

☆ بعض لوگوں، خاص طور سے بعض Talented خواتین کی ساری زندگی چاند کی طرح کسی سورج کا Satellite بن کر زندہ رہتے گزر جاتی ہے حالانکہ خود ان کے اندر سورج بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

☆ اپنے Colleagues کی خوشی یا کامیابی پر دل سے خوش ہونا ایمان کا بڑا امتحان ہے۔

☆ Genius اور جنون کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ Genius کا جنون Purposeful ہوتا ہے Enlightened ہوتا ہے اور باعث خیر کثیر۔

☆ کوشش ہی سب کچھ ہے۔

ع زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

☆ جو جتنا زیادہ سمجھتا ہے اس کی ذمہ داری اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔

☆ خودشناسی، خودآگہی Self-Image کی بنیاد ہے۔

☆ تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)

☆ انسان کسی وقت بھی سنبھل سکتا ہے، بگڑ سکتا ہے۔

☆ آدمی کا شیطان آدمی ہے۔

(پریم چند)

☆ جب Role model مایوس کرتا ہے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔

☆ یہ معلوم ہو جانے سے کہ نیکی کیا ہے، آدمی نیک نہیں بن جاتا۔ نیک بننے کے لیے نیکی کرنا بھی لازمی ہے۔

☆ E.S.P یعنی Extra Sensory Perception یعنی کشف بھی ایک حقیقت ہے۔

☆ ہر گروپ میں ایک Peck order از خود بن جاتا ہے۔

☆ مذہبی آدمی ہونے اور اخلاقی آدمی ہونے میں فرق ہے۔

☆ عطا کا پہلا حق یہ ہے کہ انسان اس کا شکر ادا کرے۔ دل شکر سے لبریز ہو تو روشن ہو جاتا ہے۔ شکوہ کیجیے تو بجھ جاتا ہے۔ ناشکر گزار ہو تو پتھر بن جاتا ہے۔ شکر گزار ہمیشہ روشن ضمیر اور روشن دماغ ہوتا ہے۔ ناشکر گزار بے ضمیر اور بد دماغ ہوتا ہے۔

(مختار مسعود)

☆ شکر عطا لیکن کیسے..... جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی۔

☆ ہر آدمی اپنے عمل کے خیر و شر میں زندہ رہتا ہے۔

(رشید احمد صدیقی)

؎ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)

☆ زندگی کی سب سے بڑی قدر عدل ہے۔

(افلاطون)

☆ خدا دوست، انسان دوست!

☆ Vision اور Will سے کبھی کبھی بظاہر Impossible باتیں بھی ممکن ہو جاتی ہیں۔

ع بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)

☆ جس آبادی میں اہل احسان نہ ہوں اسے خانہ جنگی اور خانہ بربادی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

☆ جس تمدن کو اہل جمال کی خدمات حاصل نہ ہوں وہ خوشنما اور دیرپا نہیں ہوتا۔

☆ اہل شہادت اور اہل احسان میں فرق صرف اتنا ہے کہ شہید دوسروں کے لیے جان دیتا ہے۔ محسن دوسروں کے لیے زندہ رہتا ہے۔

(مختار مسعود)

☆ کسی کار خیر کی Logistic Support کرنا بھی کار خیر ہے۔

☆ پس منظر میں رہ کر کسی کار خیر کو Sustain کرنا بھی کار خیر ہے اور کم اہم نہیں۔

☆ They also serve who only stand and wait

(Milton)

☆ علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کے شعر

ے اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

کے حوالے سے مختار مسعود نے ''آواز دوست'' میں لکھا ہے:

''رزق ہی سے نہیں، بعض کتابوں سے بھی پرواز میں کوتاہی آتی ہے۔''

اسی طرح بعض تعلقات اور Roles سے بھی پرواز میں کوتاہی آتی ہے۔

☆ جس سے اٹوٹ تعلق ہو یا رکھنا ضروری ہو اسے شرمندہ کرنا اچھا نہیں ہوتا۔

☆ جب کوئی اپنا غلطی کرتا ہے تو اس میں کچھ غلطی اپنی بھی ہوتی ہے۔

☆ اپنوں کی مروّت اور محبت کو بھی حد سے زیادہ Strain نہیں کرنا چاہیے۔

☆ جو فاصلے قربت سے پیدا ہوں وہ بہت گھمبیر ہوتے ہیں اور بڑھتے ہی جاتے ہیں:

ے وہ جو قربتوں نے بڑھا دیئے
کبھی کم ہوئے نہ وہ فاصلے

☆ محبت ہو یا عزت، کبھی Static نہیں رہتی۔ بڑھتی نہیں تو گھٹتی ہے۔

☆ ایک وقت ہوتا ہے ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا اور ایک لمحہ ہوتا ہے عہد وفا نبھانے کا۔

ے آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)

☆ اکثر تعلقات اور معاملات Over-reaction سے بگڑتے ہیں۔ کامیاب انسان Proactive اور ناکام Reactive ہوتے ہیں۔

☆ اعتماد پربت کا پتھر ہے۔ ایک بار اکھڑ جائے تو نیچے ہی آتا ہے۔

(پریم چند)

☆ جس دل میں شک ہو یا آ جائے اس میں محبت نہیں رہ سکتی۔

One heart can not serve two.

(چینی کہاوت)

☆ کسی کی سوچ کے رخ کو سمجھنا اس سے بحث کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ دونوں کسی اٹوٹ رشتہ میں یا ایسے تعلق میں بندھے ہوں جس کو قائم یا باقی رکھنا کسی وجہ سے ضروری ہو۔

☆ بے رُخی بھی تعلق کی ایک صورت ہے:

ع لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ

(غالب)

☆ چپ رہنا بھی ایک جواب ہے۔

☆ وقت کے ساتھ شوق کی طرح Ideals اور Role Models بھی بدلتے رہتے ہیں۔
لیکن سب کے نہیں۔

☆ ایک اچھی کتاب جوانی میں پڑھنا ایسا ہے جیسے چودھویں کا چاند ایک بند کمرے کے دریچے سے دیکھا جائے۔ یہی کتاب ادھیڑ عمر میں پڑھنا ایسا ہے جیسے چودھویں کا چاند گھر کے آنگن سے دیکھا جائے اور بڑھاپے میں یہی کتاب پڑھنا ایسا ہے

جیسے چودھویں کا چاند کھلے میدان میں دریا کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھا جائے۔

(چینی کہاوت)

☆ جس طرح خوبصورتی یا بدصورتی دیکھنے والے کی نظر (ذہن) میں ہوتی ہے۔ اسی طرح کتاب کا مطلب پڑھنے والے کے ذہن (تجربہ) میں ہوتا ہے۔

☆ کام اچھا ہے وہی جس کا مآل اچھا ہے

(غالب)

☆ یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)

☆ سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

(آتش)

☆ بخش دو گر خطا کرے کوئی

(غالب)

☆ ......

دنیا بھی ایک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

☆ خاموشی کو سمجھنا ہی اصل سمجھنا ہے۔

☆ جو کسی کو غیر نہیں سمجھتا وہ کم سے کم Strain کا شکار ہوتا ہے۔

☆ ایک وقت آتا ہے جب بچے اپنے والدین اور شاگرد اپنے استادوں کو Critically evaluate کرنے لگتے ہیں۔

☆ عزت کرنے، محبت کرنے اور Merely Tolerate برداشت کرنے میں فرق ہے۔

☆ کسی کی ذاتی خوبیاں اس کے Social role کے Short fall کا جواز نہیں بن سکتیں۔

☆ We can control our choice but we can not.

Control the consequences of that choice.

☆ We have freedom of choice but not.
Freedom from choice.

☆ اپنے آپ کو Misunderstood محسوس کرنا کرب کی انتہائی کرب انگیز صورت ہے۔

☆ Seek to understand before seaking to be understood.

☆ اکثر Inter-personal تعلقات Over-reaction سے بگڑتے ہیں۔

☆ رویوں (Attitudes) کو بدلنا اس لیے مشکل ہوتا ہے کہ ان کی جڑیں Values یا Personality factors میں ہوتی ہیں۔

☆ A good man can afford to be good all the time, but a bad man can not afford to be bad all the time with all the people.

☆ Freedom of choice اور Freedom from choice میں فرق ہے۔

☆ Choice کو Control کرنے اور اس کے Consequences کو Control کرنے میں فرق ہے۔

☆ Freedom from fear اور چیز ہے اور Fear of freedom اور چیز۔

☆ اپنے فیصلے خود کرنے کے لیے Vision اور Will دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆ جس طرح "Life is a whole" اور "Luck is a whole"
اس طرح "Integritty is a whole"

☆ Intelligence تو خداداد ہوتی ہے، Maturity نہیں۔

☆ صورت تو خدا عطا کرتا ہے، شخصیت انسان کو خود بنانی پڑتی ہے۔ جس طرح کمہار چاک پر مٹی سے برتن کی صورت گری کرتا ہے۔ جس طرح سنگ تراش، سنگ مرمر سے مجسمہ تراشتا ہے۔ جس طرح مصور رنگوں، برش سے تصویر بناتا ہے۔

☆ There is a statue in every piece of marble.
(Aristotie)

☆ ہر انسان کی شخصیت کا ایک Message ہوتا ہے، اپنائیت کا یا اجنبیت کا، Trust کا یا Distrust کا۔

☆ Presonality کے خاص Components دو ہیں۔

ع عجم کا حسن طبیعت، عرب کا سوز دروں

(علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ)

☆ انسان کی اصل شخصیت وہی ہوتی ہے جو کسی Crisis میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ Confidence Values مزاج اور Optimism کے حوالے سے Expose ہوتی ہے۔

☆ زندگی میں Integrity ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ کردار کی دُنیا میں کوئی Exception نہیں ہوتی۔

☆ وقت کا فیصلہ بڑا بے رحم فیصلہ ہوتا ہے۔

ے یہ وقت کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا
یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجے میں

☆ جب کسی نے اپنے رول کو دل سے قبول نہ کیا ہو تو یہ صورت ہوتی ہے:

ے کعبے کو چلا ہوں تو نظر سوئے دیر ہے
مڑ مڑ کے دیکھتا ہوں کوئی دیکھتا نہ ہو

علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ نے اس صورت حال پر یوں تبصرہ کیا:

ع ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

☆ روسو Rousseau کا ایک فقرہ ہے:

"We believe much, know little."

☆ ...... ے

آوازہ خلیل از بنیاد کعبہ نیست
مشہور گشت زاں کہ در آتش نکو نشست

(خلیل اللہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شہرہ اس وجہ سے نہیں کہ انہوں نے کعبے کی بنیاد رکھی بلکہ اس لیے کہ آتش نمرود کو لبیک کہا۔)

☆ ع جو سمجھ میں آ گیا وہ خدا کیوں کر ہوا

(اکبر الہ آبادی)

☆ ''میرے آباواجداد برہمن تھے، انہوں نے اپنی زندگیاں یہ سوچنے میں گزار دیں کہ خدا کیا ہے۔ میں اپنی زندگی اس سوچ میں گزار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے۔''

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ، مکالمات اقبال)

☆ Alexander Pope کہتا ہے:

"Proper study of mankind is man."

☆ اگر دیئے کا تیل صاف نہ ہو تو روشنی بھی صاف نہیں ہوتی۔

☆ اگر نیت صاف نہ ہو، رزق صاف نہ ہو تو کچھ بھی صاف نہیں رہتا۔

☆ Determinism تین قسم کا ہوتا ہے:

☆ Genetic یا Biological۔ یعنی انسان وہی کچھ ہوتا ہے جو اسے Genes کے ذریعے ورثے میں ملا ہے۔

Psychological۔ یعنی انسان وہی کچھ ہوتا ہے جس طرح اسے بچپن میں اس کے والدین نے پرورش کیا۔ یہ نظریہ فرائڈ کا ہے۔

بعض لوگ تیسری قسم کے Determinism یعنی Environmental determinism میں Believe کرتے ہیں۔ یعنی انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس کا جواب اقبال رحمہ اللہ نے یہ دیا۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

☆ سب سے گھمبیر Crisis لیڈرشپ کا Crisis ہوتا ہے۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا رب!
اک آبلہ پا وادی پر خار میں آوے

(غالب)

☆ ....

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

(آتش)

☆ A want that is satisfied ceases to be a want.

☆ ''تیمور نامہ'' میں تیمور نے اپنے مرشد کا ایک خط نقل کیا ہے جس میں یہ فقرہ آتا ہے۔

''کفر سے حکومت قائم رہ سکتی ہے، بے انصافی سے نہیں۔''

(دراصل یہ قول حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کا ہے)۔

☆ دوسری جنگ عظیم میں سقوط فرانس کے بعد جب انگلینڈ جرمنی کے ہوائی حملوں کے شدید دباؤ میں تھا تو ونسٹن چرچل (وزیراعظم برطانیہ) نے کہا تھا:

''جب تک برطانوی عدالتیں انصاف دیتی رہیں گی اس ملک کو شکست نہیں ہو سکتی۔''

☆ Republic میں افلاطون کہتا ہے:

زندگی کا اصل الاصول Justice ہے۔

☆ فرد ہو، ادارہ یا Commodity اس کی ایک Attracting power ہوتی ہے اور ایک Holding power

ے رُخ روشن کے آگے شمع رکھ کے وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

(داغ)

☆ قائداعظم نے ایک موقع پر کہا تھا:

I follow my set priorities.

☆ Relationship دو قسم کی ہوتی ہے۔

Transactional اور Transformational عزت و محبت Transformational تعلق سے پیدا ہوتی ہے۔

☆ ہر قرب، قربانی سے حاصل ہوتا ہے۔

ع جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

(غالب)

☆ صورت پرستی انسان کی فطرت میں ہے۔

؎ کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

(علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ)

☆ گلاب میں کانٹے ہیں یا کانٹوں میں گلاب ہے، آدھا گلاس خالی ہے یا آدھا گلاس بھرا ہوا ہے، جو ہے وہ بہت ہے، جو نہیں ہے وہ کم ہے۔ یہ مسئلہ Attitude کا ہے۔

☆ ..... ؎
اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

(ذوق)

☆ تخلیقی انسان میں کچھ کرنے کی امنگ آخری وقت تک رہتی ہے:
؎ گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

(غالب)

☆ ...... ؎
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

(غالب)

☆ کوئی نہیں ترا تو میری جان خدا ہے

(غالب)

☆ ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

(غالب)

☆ پتنگے کے دل میں ستارے کی آرزو

The desire of the moth for the star.

(Shellay)

☆ انسان بھی ایک معمہ ہے۔ سر کہیں، تصور کہیں۔

ے تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دُھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

(انشاء)

☆ جب دل افسردہ ہو تو کچھ اچھا نہیں لگتا۔

ے نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

(انشاء)

☆ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔
Time management بھی کسی کسی کو آتا ہے۔

☆

ے حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

(حالی)

ے یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالہ جرس کارواں رہے

(حالی)

☆ .... ے
بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اِک قطرہ خون نکلا

☆ .... ے
تم نے تو منیر اپنی عادت سی بنا لی ہے
جس شہر میں بھی رہنا اُکتائے ہوئے رہنا

☆ وقت سے آگے نکلنے کی سزا
بندہ اکیلا رہ جاتا ہے۔

(منیر نیازی)

☆ .... ؎

حسرت پہ اس مسافر بیکس کی رویئے
جو تھک کے بیٹھ جاتا ہو منزل کے سامنے

(مصحفی)

☆ زندگی اے زندگی!

؎ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

(میر درد)

؎ عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

(بہادر شاہ ظفر)

؎ لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

(ذوق)

؎ قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

(غالب)

؎ زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے خدا رکھتے تھے

(غالب)

؎ فکر معاش، حسن بتاں، یاد رفتگاں
اس زندگی میں اب بھلا کیا کیا کرے کوئی

(سودا)

ع زندگی کاہے کو، اک خواب ہے دیوانے کا

(فانی)

ے تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

(شاد عظیم آبادی)

ے فقط ذوق پرواز ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

(علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)



دانائی کی تلاش

اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ

کیا تم لوگ سوچتے نہیں؟ (القرآن)

اصل مسئلہ

① اصل مسئلہ یہ نہیں کہ کوئی آپ کو نہیں جانتا مسئلہ یہ ہے کہ:

Are you worth knowing?

(چینی کہاوت)

② اصل مسئلہ یہ نہیں کہ کسی کی عزت نہیں کی جاتی، مسئلہ یہ ہے کہ:

Is one worth respecting?

③ اصلہ مسئلہ یہ نہیں کہ لوگ آپ کے مخالف ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ آپ میں وہ Vision وہ Character ہے کہ کچھ مفاد پرست لوگ آپ کی مخالفت کریں۔

④ اصل مسئلہ وہ لڑکا نہیں جو شرارتی ہے مسئلہ وہ لڑکا ہے جو کچھ بھی نہیں Listless، Unesponsive, اور Confidence کی کمی کا مارا ہوا۔

(فراق گورکھپوری نے اپنے کسی عزیز کے بارے میں لکھا ''وہ اچھا کیا ہوتا وہ تو بُرا بھی نہ ہو سکا۔'')

⑤ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ کوئی Commodity بکتی نہیں۔ کوئی ادارہ چلتا نہیں۔ کسی شخص کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس Commodity ادارہ یا فرد کی Holding power کتنی ہے؟

(جس کا تعلق C.Q.I یعنی Continuous Quality Improvement سے ہے)۔

⑥ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ کسی نے کسی کو بھلا دیا، مسئلہ یہ ہے کہ:

Is one worth remembering?

⑦ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ کسی کے Superordinates اسے کیا سمجھتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کے Subordinates اسے کیا سمجھتے ہیں۔

⑧ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ آپ کی کوئی محبت کوئی خدمت Effective نہیں ہو رہی، مسئلہ یہ ہے کہ وہ Effort وہ محبت، وہ خدمت دراصل Geniuine کتنی ہے، Sincere کتنی ہے؟

⑨ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ کسی نے آپ پر Trust نہیں کیا۔ مسئلہ یہ ہے کہ:

Are you worth of trust?

⑩ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ کوئی سمجھتا نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ سمجھنا بھی چاہتا ہے یا نہیں؟

⑪ "I won't do it" اور "Can't do it" میں فرق ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اصل صورت حال کیا ہے۔

I can't do it or I won't do it? (Mostly it is latter)

جب دل ہی نہ چاہے تو بہانے ہزار ہیں

⑫ اصل مسئلہ کسی کو سمجھانا نہیں، سمجھنا ہے۔

⑬ اصل مسئلہ To reach the top نہیں بلکہ To stay at the top ہے۔

⑭ اصل مسئلہ Attract کرنا نہیں Hold کرنا اور کرتے رہنا ہے۔

⑮ اصل مسئلہ کوئی بڑا کام (اچھا کام) شروع کرنا نہیں، اسے جاری رکھنا ہے۔

⑯ اصل مسئلہ جوانی کی خوب صورتی نہیں Forties، Fifties اور Sixties کی دلکشی اور Grace ہے۔ (جس کا تعلق صحت ہی سے نہیں، Values اور Attitudes سے بھی ہے)۔

⑰ اصل مسئلہ جوانی میں Handsome باوقار ہونا نہیں، مسئلہ Growing old gracefully ہے۔

⑱ اصل مسئلہ Impress کرنا یا Attract کرنا نہیں، شخصیت سے Inspire کرنا اور مسلسل Inspire کرتے رہنا ہے۔ (جو C.Q.I کے بغیر ممکن نہیں)۔

⑲ اصل مسئلہ محض زندگی نہیں، صحت کے ساتھ کارِخیر کی زندگی ہے۔

⑳ زندگی کا اصل مسئلہ Career کی Vertical Movement نہیں، شخصیت کی Horizontal Movement ہے۔



ہمیشہ یاد رکھنا

① Patience پتھروں کا سینہ شق کر دیتی ہے۔

② عبادت کی قضا ہے، خدمت کی نہیں۔

③ سب سے زیادہ تاثیر یک طرفہ قربانی میں ہوتی ہے۔

④ سزا خطاؤں کی ہوتی ہے نہ کہ خامیوں کی۔

⑤ خاموشی کو سمجھنا ہی اصل سمجھنا ہے۔

⑥ گلاب کو بھی پانی دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

(You don't have to take any relation taken for granted.)

⑦ کبھی اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ کوئی قریب ہے تو فاصلہ نہیں ہوگا۔

⑧ یہ نہ سمجھنا جو کم بولتا ہے وہ کم Sensitive یا کم Intelligent ہے۔

(It may be other way round)

⑨ انسانی تعلقات میں بھی کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی۔ جو دل توڑے وہ جوڑ بھی سکتا ہے۔

؎ تو چل تو سہی دل شکستہ لے کر
وہ جوڑ دیں ایسا کہ پتا بھی نہ چلے

⑩ ہمیشہ یاد رکھنا، Forgive کرنا کسی کے اختیار میں ہوتا ہے، Forget کرنا نہیں۔

⑪ ہمیشہ یاد رکھنا، کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے پر تمہارا اختیار ہے لیکن اس Choice

کے Consequences پر نہیں۔ (Consequences نیچرل Laws سے Govern ہوتے ہیں۔)

⑫ ہمیشہ یاد رکھنا، جو Message کسی کے رویے میں ہو وہ اس کے الفاظ سے زیادہ قابل اعتبار ہوتا ہے۔

⑬ اگر کوئی انکار Inevitable ہو تو شروع میں Bluntly کر دینا بعد کے بہت زیادہ Embarrassment سے بچا لیتا ہے۔

⑭ ہمیشہ یاد رکھنا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا یہ قول:

''نعمت کا تحفظ شکر سے اور تکلیف کا تدارک صبر سے۔''

⑮ ہمیشہ یاد رکھنا، Trust begets trust

(Trust کا Core Content جذباتی Emotional ہوتا ہے اور Integrity پر مبنی)۔

⑯ ہمیشہ یاد رکھنا

دل میں ایک دروازے سے بدنیتی داخل ہوتی ہے تو دوسرے دروازے سے دبے پاؤں بے چینی (اور بے برکتی) اندر آ جاتی ہے۔

⑰ ہمیشہ یاد رکھنا

To understand all is to forgive all.

⑱ ہمیشہ یاد رکھنا

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا یہ قول:

''مصیبت میں گھبرانا سب سے بڑی مصیبت ہے۔''

ایک چینی دانشور کہتا ہے:

Act in a crisis with calm and during a calm by thinking of the crisis.

⑲ ہمیشہ یاد رکھنا

ایک چینی کہاوت:

Do not condone a small evil and do not pass

by a small charity.

⑳ ہمیشہ یاد رکھنا

ایک چینی دانشور کا یہ قول:

An inch of time is like an inch of gold, but an inch of gold can not buy an inch of time.

㉑ کبھی مت بھولنا

ایک دل میں ایک وقت ایک محبت، ایک دلچسپی رہ سکتی ہے۔ایک چینی کہاوت ہے:

One heart can not serve two.

㉒ اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھنا

''جو اشارہ نہ سمجھا وہ بات کیا سمجھے گا۔''

ایک چینی کہاوت ہے:

If one word does not suffice a thousand are wasted.

㉓ ہمیشہ یاد رکھنا

اقبال رحمۃ اللہ کا قول کہ

''سوال سے خودی ضعیف ہوتی ہے۔''

㉔ ہمیشہ یاد رکھنا

جو پیچھے مڑ کے دیکھتا ہے اس کا اگلا قدم رُک جاتا ہے۔

㉕ یہ بھی ذہن میں رکھنا

کہ خود اپنے آپ کو کوئی Negative بات Suggest کرنا خود کردہ Tension کو دعوت دینا ہے۔(Sub-conscious mind کے لیے وہی Reality بن جاتی ہے)۔

؎ عادت سی بنا لی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اُکتائے ہوئے رہنا

㉖ ہمیشہ یاد رکھنا

بدگمانی کی بھی ایک عادت سی بن جاتی ہے۔

بدگمانی کا شکار Neurotic انسان Fantasize کرتا رہتا ہے اور یوں ایک Chain tension کے عذاب میں اپنے آپ کو خود مبتلا کر لیتا ہے۔

(بعض بدگمانیاں گناہ کے زمرہ میں آتی ہیں۔(القرآن)

㉗ کبھی سوچنا

Reactive ہونے اور Proactive ہونے میں فرق ہے۔

Reactive بندہ Circle of concern میں اُلجھا رہتا ہے اور Proactive انسان Circle of influence پر Focus کرتا ہے اور آخرکار Effective کامیاب رہتا ہے۔

㉘ ہمیشہ یاد رکھنا

کسی رول Role میں Effective ہونے کے لیے Will (قوت عمل) Vision اور Values تینوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن Values کی حیثیت Heart کی سی ہے۔

㉙ ایک چینی دانشور کہتا ہے۔

A tree depends upon the roots, a man depends upon his heart.

㉚ ہمیشہ ذہن میں رکھنا

Reactive اور Proactive ہونے میں فرق ہے۔ جو بندہ عادتاً Reactive ہو وہ Overreact کر کے اپنے Genuine interests کو بھی نقصان پہنچا لیتا ہے۔

㉛ کبھی نہ بھولنا

The only thing that does not change is change.

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں

㉜ کبھی نہ بھولنا

لفظ Love ناؤن Noun ہی نہیں Verb بھی ہے۔ محبت نام ہے کچھ کرنے کا۔ فرہاد کی طرح جوئے شیر نکالنے کا۔

(33) مت بھولنا

چونکہ اکثر و بیشتر مسئلوں Problems کا Core Content لاشعوری طور پر Unconsciously یا Subconsciously جذباتی Emotional ہوتا ہے۔ اس لیے سمجھانے کی Logic اور Reason based approach عموماً Effective نہیں ہوتی۔

(34) یاد رکھنا

Behaviour کی Roots رویوں Attitudes میں ہوتی ہیں۔ اس لیے کسی کے Attitudes اور Values کو بدلے بغیر اس کے Behaviour کو بدلنا مشکل ہوتا ہے۔

(35) واضح رہے

کسی سائنسی، علمی مسئلہ یا Concept کو سمجھنا یا سمجھانا اس لیے نسبتاً آسان ہوتا ہے چونکہ یہ Process بنیادی طور پر ذہنی Behaviour ہوتا ہے۔

(36) یاد رکھنا

ناکامی کا خوف ناکامی کا ایک Potent factor بن جاتا ہے۔

(37) کبھی دو چار لمحے فرصت اور سکون کے میسر ہوں تو شاعر کی یہ صدا بھی سن لینا:

دروازہ کھلا رکھنا (دل کا) اور
چوکھٹ پہ دِیا جلائے رکھنا (محبت کا)

(ابن انشاء)



خدا کے لیے

خدا کے لیے! مت کرنا کوئی غلط کام اس امید میں کہ یہ چھپا رہے گا۔
خدا کے لیے! مت کرنا زیادتی کسی کے ساتھ اس غلط فہمی میں کہ اس کی آنچ تم تک نہیں پہنچے گی۔
خدا کے لیے! نفرت کی آگ کو نفرت سے بجھانے کی کوشش کبھی نہ کرنا۔
خدا کے لیے! اپنی غلطیوں کو دوسروں کے سر تھوپ کر (Rationalize کر کے) اپنی اصلاح کے دروازے بند مت کر لینا۔
خدا کے لیے! لڑ جھگڑ کر، ڈرا دھمکا کر، مار پیٹ کر کسی کو بدلنے کی غلطی بھی نہ کرنا۔
خدا کے لیے! مت ضائع کرنا اپنا وقت ان لوگوں سے اُلجھنے میں جو تم سے مختلف ہیں۔
خدا کے لیے! مت تباہ کر لینا اپنا ذہنی سکون یہ سوچتے رہنے میں کہ دوسرے تمہارے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔
خدا کے لیے! ان لوگوں کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہ پہنچانا جو تم سے محبت کرتے ہیں۔
خدا کے لیے! زیادہ چالاک بننے کی بیوقوفی کبھی نہ کرنا۔
خدا کے لیے! اپنے آپ کو دوسروں کے Responses کا قیدی نہ بنا لینا۔
خدا کے لیے! جو نہیں ہے اس کی حسرت میں اس کے مزہ کو خراب نہ کر لینا جو حاصل ہے۔
خدا کے لیے! یہ کبھی نہ بھولنا کہ ہر کمی خلوص سے پوری ہو جاتی ہے لیکن خلوص کی کمی کسی چیز سے پوری نہیں ہوتی۔
خدا کے لیے! مت بھولنا کہ مظلوم کے دل سے نکلی آہ خدا کے ہاں از خود بددعا میں بدل

جاتی ہے اور تازندگی Gray hound کی طرح Ghase کرتی رہتی ہے۔

خدا کے لیے! خودغرضی کے زہر اور حسد کی آگ سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے سے کبھی غافل نہ ہونا۔

خدا کے لیے! انہیں جو آڑے وقت میں تمہارے کام آئے احسان فراموشی کا دُکھ کبھی نہ دینا۔
(احسان فراموشی ایک واضح سگنل ہے کہ بندے نے خودغرضی کی اندھی گلی میں پہلا قدم رکھ دیا ہے)۔

خدا کے لیے! مت بھولنا اس سے پہلے کہ پہلا لفظ تمہارے منہ سے نکلے تمہاری نیت کا Message دوسرے تک پہنچ جاتا ہے۔

خدا کے لیے! مت بھولنا کہ ہر غلط کام انسان کو سب سے پہلے اپنی نظروں میں گرا دیتا ہے۔ ہر Willful غلطی بندے کی Self-image کو Unconsciously ضرور Damage کرتی ہے۔

خدا کے لیے! دوسرے کی عزت کو اپنی توہین سمجھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔

خدا کے لیے! Communication gap کے Causes اور Consequences کو کبھی Underestimate نہ کرنا۔

خدا کے لیے! Suggestion کی Prepotency کو نظرانداز کرنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔

خدا کے لیے! کسی نعمت، محبت یا خدمت کی قدر کرنے کے لیے اس کے چھن جانے کا انتظار نہ کرنا۔



باب دوم

پہلا حصہ

پاکستانیات

شادباد منزل مراد

 نظریہ پاکستان، منزل بہ منزل
 قائداعظم اور نظریہ پاکستان
 اتحاد، ایمان، تنظیم
 تعمیر پاکستان
 قائداعظم اور طلبا
 قائداعظم اور تعلیم

نظریہ پاکستان، منزل بہ منزل

مارچ 1944ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم رحمہ اللہ نے کہا تھا:

''پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا جس دن ہندوستان میں پہلا فرد مسلمان ہوا۔''

قائداعظم رحمہ اللہ کے اس قول میں دوقومی نظریہ کی بنیادی توجیہہ ہے۔ یہاں اس نظریہ کی ارتقائی تاریخ مختصر طور پر پیش کی جاتی ہے۔

برصغیر ہند و پاک میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخ 712 عیسوی میں محمد بن قاسم کے جہاد سے شروع ہوتی ہے۔ مسلمان فاتحین یہاں رہے، بسے بھی۔ اسے انہوں نے وطن بھی بنایا۔ 1857ء میں سقوط دہلی تک تقریباً ہزار سال انہوں نے یہاں حکومت بھی کی لیکن مہاجر مسلمان اور مقامی مسلمان، جو ہندو سے مسلمان ہوئے تھے، سماجی اور معاشرتی اعتبار سے ہمیشہ ہندوؤں سے علیحدہ ہی رہے۔ وہ ہندو قومیت اور تہذیب میں کبھی جذب نہیں ہوئے۔ دو قومیتوں کے دھارے مذہبی اور تہذیبی سطح پر تیل اور پانی کی رووؤں کی طرح ساتھ ساتھ تو چلتے رہے لیکن ملے کبھی نہیں۔ جب تک مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی طاقت مضبوط رہی یہ معاشرتی اور تہذیبی علیحدگی کوئی مسئلہ بن کر سامنے نہیں آئی لیکن 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا شیرازہ بکھرتے ہی ہندوؤں نے مرہٹوں کی قیادت میں قومی بنیاد پر مسلمانوں کی حکومت کے خلاف پرانی سیاسی دشمن کو ایک منصوبے کے تحت منظّم کرنا شروع کیا۔ ہندو قومیت کی اس جارحانہ تحریک کا نشانہ براہ راست مسلمان بنتے

رہے۔

ہندو مسلم قومیتوں کے ٹکراؤ کے اثرات کو سب سے پہلے غالبًا شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے محسوس کیا۔ یہ پہلے مفکر جنہوں نے برصغیر میں مسلم قومیت کی ملی بنیادوں پر تنظیم کی ضرورت محسوس کی اور مسلمانوں کو اصل اسلام کی طرف لوٹنے کی دعوت دی اور اسلام کے معاشرتی اور معاشی اصولوں کی زمانے کے حالات کے مطابق وضاحت کی اور اسلام کو ایک متحرک قوت اور دین کے طور پر پیش کیا، انہوں نے یہ عملی سیاسی قدم بھی اٹھایا کہ ذاتی خطوط لکھ کر احمد شاہ ابدالی رحمہ اللہ کو مرہٹوں کی تاخت و تاراج اور مسلمانوں کی حالت زار سے آگاہ کیا اور اسلام کے نام پر مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ 1761ء اور بعد کے معرکوں میں ابدالی نے مرہٹوں کو عبرت ناک شکستیں بھی دیں۔ مرہٹے اور ہندو میدان جنگ میں تو ہار گئے لیکن ہندو اور مسلم قومیتوں کی جو جنگ کھل کر شروع ہو چکی تھی، وہ ختم نہیں ہوئی بلکہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہی چلی گئی۔

اٹھارہویں صدی کے وسط میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی فکری تحریک ہندوستان میں مسلمانوں کے علیحدہ قومی وجود کا پہلا اہم اشارہ تھی۔ پھر انیسویں صدی کے شروع میں سید احمد شہید کی تحریک جہاد اور بنگال میں تیتو میر اور حاجی شریعت اللہ کی تحریکیں مسلمانوں کے علیحدہ قومی وجود کی لہریں تھی۔

1857ء کے بعد مسلمانوں کے میر کارواں سر سید احمد تھے۔ وہ مسلمانوں کے قومی مفاد کے لیے تگ و دو کر رہے تھے لیکن ہندو مسلم اتحاد کے خلاف بھی نہیں تھے۔ تاہم بہت جلد انہیں اندازہ ہو گیا کہ ہندو مسلمان ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ حالی نے حیات جاوید میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ جب 1867ء میں بنارس کے ہندوؤں نے اُردو ہندی جھگڑا کھڑا کیا اور سخت متعصّبانہ رویہ اختیار کیا تو سر سید نے بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیئر سے صاف کہہ دیا کہ ہندو مسلمان متحد نہیں رہ سکتے۔ سر سید کے الفاظ یہ تھے:

''اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا دیکھے گا۔''

قابل غور نکتہ یہ ہے کہ سر سید نے دو قوموں کا لفظ استعمال کیا ہے اور ہندو مسلمان

میں مزید اختلافات کی پیشین گوئی کی ہے۔ جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ سرسید نے ہندو ذہن کو اچھی طرح پرکھ لیا تھا۔ چنانچہ اسی وجہ سے انہوں نے مسلمانوں کو 1885ء میں قائم کی گئی ہندوؤں کی انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت سے باز رکھا تھا۔

سرسید احمد خان نے اپنی زندگی کے آخری دور میں مغربی طرز کی جمہوریت کو مسلمانوں کے لیے مہلک قرار دیا اور ہندوستان کو برصغیر قرار دیتے ہوئے مختلف قوموں کا وطن قرار دیا بلکہ سرسید کی ایک تقریر تو ایسی بھی ہے کہ جس میں پاکستان کی نظریاتی ہیئت تشکیل پاتی نظر آتی ہے۔

1894ء میں جالندھر میں تقریر کرتے ہوئے سرسید نے کہا:

''ہماری تعلیم پوری اس وقت ہو گی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہو گی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ بغیر یونیورسٹی کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں گے..... فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہو گا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہٰ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔''

آخری جملے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید مسلمانوں کے لیے ایک ایسی مملکت کا خواب دیکھ رہے تھے جس کی بنیاد دین پر ہو گی۔ اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ نظریہ پاکستان کے پہلے معمار سرسید تھے۔ ان ہی کے مبارک ہاتھوں سے ہندوستان میں مسلمانوں کی نئی ذہنی اور سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ انہی نے علی گڑھ تحریک کی بنیاد ڈالی جو پاکستان کی اساس تھی۔

1982ء میں ہندوستان میں البرٹ بل نافذ ہوا۔ اس کے بعد سے ہندو مسلمان کے تعلقات کشیدہ رہنے لگے اور ایک دوسرے کی رسوم اور تہواروں پر جھگڑے ہونے لگے۔ اس صورت حال پر عبدالحلیم شرر نے رسالہ تہذیب 23 اگست 1890ء کے شمارے میں لکھا۔

''ہمارے خیال میں اگر ایسا ہی وقت آ گیا ہے کہ کسی فرقے کی مذہبی رسوم بغیر دوسرے کی توہین و دل شکنی کے پوری نہیں ہوسکتیں اور نہ اتنا صبر و تحمل ہے کہ دوسرا فریق ان باتوں کی طرف توجہ نہ دے تو بہتر ہے کہ ہندوستان کے اضلاع ہندو مسلمان باہم تقسیم کر لیں اور اپنی آبادی علیحدہ کر لیں۔''

مولانا عبدالحلیم شرر کا یہ آخری جملہ کہ ہندوستان کے اضلاع ہندو مسلمان آپس میں

تقسیم کرلیں، پاکستان کی منزل کی طرف واضح نشان دہی کرتا ہے۔

1905ء میں تقسیم بنگال کے بعد ہندوؤں نے جو مخالفانہ رویہ اختیار کیا اس سے مسلمان لیڈروں کو پہلی بار احساس ہوا کہ ان کا بھی علیحدہ سیاسی پلیٹ فارم ہونا چاہیے۔ پھر منٹو مارلے اصلاحات بھی آنے والی تھیں۔ چنانچہ اکتوبر 1906ء میں آغا خان کی سربراہی میں ایک وفد وائسرائے سے ملا اور جداگانہ حق انتخاب کا مطالبہ پیش کیا۔ دسمبر 1906ء میں ڈھاکہ نواب سلیم اللہ خان کے گھر میں مسلم لیگ قائم ہوئی۔ 1909ء میں منٹو مارلے اصلاحات نے مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب کا حق مان لیا اور دوسرے تحفظات بھی دیئے۔ یہ پاکستان کی طرف پہلا آئینی قدم تھا لیکن آزادی کا خیال ابھی کوسوں دور تھا۔

1914ء کے اوائل میں لندن کے اخبار ڈیلی ایکسپریس میں ایک نقشہ شائع ہوا جس میں قسطنطنیہ سے سہارنپور تک شمالی ہند کا علاقہ ایک تیر سے ملایا ہوا تھا۔ جس کو مسلم کاریڈور کا نام دیا گیا تھا۔ اس کا مصنف ٹائم آف انڈیا کا سابق ایڈیٹر لوول فریزر تھا۔ یہ بھی مسلمانوں کے ہندوستان سے علیحدہ امکانی وطن کی طرف اشارہ تھا۔

1915ء میں بزم شبلی سے خطاب کرتے ہوئے چوہدری رحمت علی نے کہا تھا کہ

''ہندوستان کا شمال مغربی حصہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ اسے مسلم ریاست میں بدلا جائے۔''

1916ء میں میثاق لکھنؤ ہوا۔ یہ مسٹر جناح کی کوششوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کی پہلی اور آخری ٹھوس کوشش تھی۔ اس میں جداگانہ انتخابات کا اصول کانگریس نے بھی مان لیا تھا لیکن بعض سیاسی مفکر اس وقت بھی اسی خیال پر مصر تھے کہ ہندوستان کو ہندو مسلم ریاستوں میں تقسیم کرنا ہی ہند کے سیاسی مسئلہ کا بہترین حل ہے۔

1917ء میں سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس سٹاک ہوم کے موقع پر علی گڑھ کے خیری برادران نے تقسیم ہند کا خیال پیش کیا تھا۔

1920ء میں بدایوں (یوپی) کے اخبار ذوالقرنین میں محمد عبدالقادر بلگرامی نے گاندھی کے نام ایک کھلا خط شائع کیا تھا۔ یہاں تک کہ اس میں اضلاع کی فہرست بھی دی گئی تھی۔

1921ء میں مولانا حسرت موہانی کے بیانات سے اور 1922ء میں نادل علی

ناگپوری کے کتابچے سے تقسیم ہند کی تائید ہوتی ہے۔

1923ء میں ڈیرہ اسماعیل خان کے سردار محمد گل خان نے فرنٹیئر انکوائری کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے۔ تقسیم ہند کی تجویز پیش کی کہ پشاور سے آگرے تک کا علاقہ مسلمانوں کو دیا جائے۔

14 دسمبر 1924ء کے اخبار ٹربیون میں خود کانگریسی رہنما لاج پت رائے نے تقسیم ہند کے حق میں لکھا۔

22 مئی 1925ء کے کامریڈ میں مولانا محمد علی جوہر نے صوبہ سرحد میں اصلاحات کی حمایت کرتے ہوئے لوول فریزر کے مسلم کاریڈور کا حوالہ بھی دیا۔ جس پر ہندوؤں نے بڑی لے دے کی۔

1926ء میں مولانا عبیداللہ سندھی نے تقسیم ہند کے خیال کا اعادہ کیا۔

اکتوبر 1928ء میں مولانا عبیداللہ نے لندن کے اخبار ٹائمز میں لکھا۔ پھر دسمبر 1928ء میں آل پارٹیز کنونشن، کلکتہ میں ہر صوبے کے لیے آزادی کی تجویز پیش کی۔ یکم جنوری 1929ء کو آل پارٹیز کانفرنس، دہلی میں آغا خاں نے پھر اسی تجویز کو دہرایا۔

لیکن اب تک یعنی دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس 1929ء تک تقسیم ہند کے جو خیالات سامنے آئے وہ بیشتر غیر سیاسی مفکروں کے ذاتی تاثرات کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی بہت زیادہ سیاسی اہمیت نہیں تھی۔

مارچ 1928ء میں ہندوستان کا آئندہ آئینی ڈھانچہ تیار کرنے کے لیے سائمن کمیشن آیا۔ جس کے مقابلے میں نہرو رپورٹ نے مسلمانوں کو سخت مایوس کیا۔ چنانچہ 1928ء کے آغاز اور 1929ء کے وسط میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں پھر مسلمانوں کے لیے آئینی تحفظات کی پختہ بنیاد تلاش کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔

اپریل 1930ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس نے انڈین کنفیڈریشن کے اندر رہتے ہوئے صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کیا۔

29 دسمبر 1930ء کو الہ آباد میں علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کی صدارت میں مسلم لیگ کا جو جلسہ ہوا اس کے خطبہ میں اقبال رحمہ اللہ نے پہلے تو وہی کہا جو مسلم لیگ کا سرکاری موقف تھا۔ ان کے یہ الفاظ تھے۔

''مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان کے وفاق کے اندر ان کو حکومت خود اختیاری دے دی جائے، بالکل جائز ہے۔''

لیکن اقبال رحمہ اللہ کا امتیاز یہ تھا کہ انہوں نے صرف لیگ کے نقطہ نظر کو بیان کرنے پر ہی بس نہیں کیا بلکہ اپنی ذاتی رائے کو بھی بڑے مدلل انداز میں ہندوستان کے آئینی مسئلہ کے واحد حل کے طور پر پیش کیا۔ اس لیے انہیں تصور پاکستان کا خالق کہا جاتا ہے۔ اقبال رحمہ اللہ کے اپنے الفاظ یہ تھے:

''میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک واحد آزاد مسلم ریاست تشکیل کی جائے خواہ سلطنت برطانیہ سے اس کا تعلق ہو یا نہ ہو۔ ایسی شمال مغربی ریاست کی تخلیق ہندوستانی مسلمانوں یا کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے لیے مقدر ہو چکی ہے۔''

1930ء میں ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک مکمل آزاد مسلم ریاست کے قیام کی تجویز اقبال کی ذاتی تجویز تھی۔ اس کو مسلم لیگ کی سرکاری سرپرستی حاصل نہیں تھی۔ 1931-32ء کی گول میز کانفرنس میں یک جہتی نہیں تھی۔ عام رجحان فیڈریشن یا کنفیڈریشن کی طرف تھا۔ خود اقبال نے تیسری گول میز کانفرنس نومبر 1932ء میں کہا تھا۔

''علیحدہ مرکز کی ضرورت نہیں، صوبے خود مختار اور آزاد ہوں۔''

اقبال نے جس آزاد شمال مغربی ریاست کا تصور پیش کیا تھا اس کا کوئی نام تجویز نہیں کیا گیا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ ایک خیال تھا، مطالبہ نہ تھا۔ جب بعض انگریزوں اور ہندوؤں نے ان کی تجویز کو تقسیم کے معنی پہنائے تو 10 اکتوبر 1932ء کے ٹائمز لندن میں اقبال نے وضاحت کی کہ یہ محض تجویز تھی، مطالبہ نہ تھا۔

لیکن 15 دسمبر 1932ء کو نیشنل لیگ، لندن کے جلسے میں اقبال نے ایک بار پھر مدلل انداز میں علیحدہ ریاست کے قیام کو بہترین امکانی عمل بتایا۔ گول میز کانفرنس میں ہندوؤں کے متعصّبانہ رویے سے مایوس ہو کر دسمبر 1932ء تک اقبال اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ

''اب الگ مطالبہ ملک کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔''

جنوری 1923ء میں کیمبرج کے چوہدری رحمت علی اور ان کے تین ساتھیوں نے

ایک کتابچہ شائع کیا۔ ''اب یا کبھی نہیں'' جس میں متحدہ ہندوستانی قومیت کو واضح طور پر مسترد کر دیا گیا تھا۔ گول میز کانفرنس میں زیرِغور آئین کی شدید مخالفت کی گئی تھی اور کشمیر، پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان پر مشتمل ایک آزاد مسلم مملکت کی تشکیل پر زور دیا گیا تھا۔ اس کتابچہ میں لفظ پاکستان بھی وضع کیا گیا تھا۔ بقول رحمت علی ''لفظ پاکستان فارسی لفظ بھی ہے اور اُردو بھی۔''

اس میں پ پنجاب سے، الف افغانیہ (سرحد) سے۔ کاف کشمیر سے، سین سندھ سے تان بلوچستان سے لیا گیا ہے۔ پاکستان کے لفظی معنی ہیں:

''پاک لوگوں کا وطن۔''

گول میز کانفرنس کے دوران چوہدری رحمت علی نے انگلستان میں اقبال سے ملاقات بھی کی تھی۔ اس سے بہت پہلے ایک گمنام طالب علم کی حیثیت سے انہوں نے 1915ء میں اسلامیہ کالج، لاہور کی بزم شبلی کی افتتاحی تقریر کے موقع پر بھی آزاد مسلم ریاست کا تذکرہ کیا تھا۔

1935ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ آیا۔ جس میں صوبوں کی محدود خودمختاری اور مرکزی وفاق کا اہتمام تھا۔ جو یکم اپریل 1937ء سے جزوی طور پر نافذ بھی ہوا۔ اس کے تحت صوبائی حکومتوں کے انتخابات ہوئے۔ کانگریس اور لیگ دونوں نے الیکشن لڑے۔ جناح 1937ء میں ایک بار پھر اور آخری بار مصالحت کے لیے تیار ہوئے لیکن ہندوؤں نے مفاہمت کرنے سے انکار کر دیا۔ کانگریس نے سات صوبوں میں وزارت بنائی اور جولائی 1937ء سے اکتوبر 1939ء تک حکومت کی۔ اس عرصے میں مسلم اقلیتوں پر وہ ظلم ڈھائے گئے کہ دنیا چیخ اٹھی۔ ہندو کانگریس کے عملی رویے سے ہندوستان بھر کے مسلمان اور ان کے لیڈر اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کی سیاسی مفاہمت ممکن نہیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے قومی مفادات کے تحفظ کے لیے واضح راہ عمل کی تلاش شروع کر دی۔

1938ء میں حیدرآباد سے سید لطیف نے چار منطقوں پر مشتمل وفاق کی تجویز پیش کی۔ ڈاکٹر لطیف کی کتاب کے دیباچے میں سر عبداللہ ہارون نے دو وفاقوں کی تجویز پیش کی۔

1939ء میں پنجابی کے نام سے پانچ ملکوں کی کنفیڈریشن کی تجویز پیش کی گئی۔ متحدہ ہندوستان کے تحت جولائی 1939ء میں سکندر حیات نے اپنی تجویز پیش کی۔ یہ سات حصوں

کے وفاق کی سکیم تھی۔

1939ء میں علی گڑھ کے دو پروفیسروں نے تین آزاد ریاستوں کی تجویز دی۔ پاکستان، بنگال اور ہندوستان۔ جو معاہدوں میں آپس میں اور برطانیہ سے منسلک ہوں۔

ہندوستان کی سیاسی فضا میں کسی نہ کسی شکل میں علیحدگی کے یہ خیالات آرہے تھے کہ اکتوبر 1938ء میں کراچی صوبائی مسلم لیگ نے اپنے جلسے میں ایک قرارداد کے ذریعے قرارداد پاکستان کی بنیاد ڈالی۔ اس قرارداد میں مکمل حق خودارادی کا عزم کیا تھا اور پہلی بار قوم کا لفظ استعمال ہوا تھا۔

ستمبر 1939ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے آئینی تجویز کی چھان بین کے لیے کمیٹی مقرر کر دی۔ 22 مارچ 1940ء تک قرار داد کے مسودے پر غور ہوتا رہا۔ 23 مارچ 1940ء کو یہ قرارداد اقبال پارک، لاہور کے ایک جلسے میں بنگال کے وزیراعظم اے کے فضل الحق نے پیش کی۔

چوہدری خلیق الزماں کی تائید کے بعد دوسرے صوبوں کے مندوبین نے تقریریں کیں۔ اس موقع پر بہترین تقریر قائداعظم نے کی تھی۔ جس میں قرارداد پاکستان کے پس منظر اور دوقومی نظریہ پر بڑی مدلل بحث تھی۔ اس قرارداد کو قراردادِ لاہور کا نام دیا گیا۔ اس میں ہند کے شمال مغرب میں دو آزاد مملکتوں کے قیام کی تجویز رکھی گئی تھی۔

اپریل 1941ء میں اس قرارداد کو مسلم لیگ کا باقاعدہ نصب العین بنا دیا گیا۔ ابھی تک اس میں ریاستوں کا لفظ موجود تھا۔ اپریل 1946ء میں دہلی میں ہندوستان بھر کے لیگی ممبروں کا کنونشن ہوا۔ جس میں حسین شہید سہروردی کی قرارداد پر ریاستوں کی بجائے ریاست کا لفظ کر دیا گیا۔ گویا ایک متحدہ پاکستان کا عہدنامہ بن گیا۔ اس قرارداد پاکستان کے مطابق 3 جون 1947ء کو تقسیم ہند کا اعلان کر دیا گیا اور پاکستان ایک آزاد خودمختار اسلامی مملکت کی حیثیت سے 14 اگست 1947ء کو وجود میں آ گیا۔ ہمیشہ قائم رہنے کے لیے۔ ان شاء اللہ!!



قائداعظم رحمۃ اللہ اور نظریہ پاکستان

نظریہ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ ہے۔ خوش قسمتی ہے کہ اس موضوع پر خود قائداعظم نے مختلف موقعوں پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ ان بیانات اور تقریروں کے منتخب ٹکڑے پیش کیے جاتے ہیں۔

مسلم قومیت کی بنیاد

''پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمہ توحید ہے، وطن نہیں اور نہ ہی نسل۔ ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا۔ وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آ گئی۔''

(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبا سے خطاب، 8 مارچ 1924ء)

اسی تقریر میں آگے چل کر آپ نے فرمایا:

''آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا محرک جذبہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔''

اس تقریر سے اس گمراہ کن خیال کی بھی تردید ہوتی ہے کہ پاکستان کے مطالبے کو ہندوؤں کی تنگ دلی نے جنم دیا یا یہ محض معاشی خوشحالی حاصل کرنے کا ذریعہ تھا یا صرف سیاسی

اقتدار کے حصول کا وسیلہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اقتدار کا حصول بھی ضروری تھا۔ معاشی اور اقتصادی خوشحالی بھی مدنظر تھی۔ لیکن اس سے بھی اہم تر مسئلہ اور اصل مسئلہ مسلمانوں کے قومی وجود، مسلمانوں کے بحیثیت مسلمان زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا مسئلہ تھا جو بغیر پاکستان کے حصول کے ممکن نہیں تھا۔

نظریہ پاکستان اور دوقومی نظریے کی وضاحت قائداعظم نے 23 مارچ 1940ء کو قرارداد پاکستان پر تقریر کرتے ہوئے ان الفاظ میں کی:

''مسلمان ایک اقلیت نہیں ہیں۔ مسلمان ایک قوم ہیں۔ قومیت کی تعریف جس طرح کی جائے مسلمان اس تعریف کی رو سے ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ ان کی اپنی الگ مملکت اور اپنی جداگانہ خودمختار ریاست ہو۔ ہم مسلمان چاہتے ہیں کہ برصغیر کے اندر ہم ایک آزاد قوم بن کر اپنے ہم سایوں کے ساتھ ہم آہنگی اور امن وامان کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ ہماری تمنا ہے کہ ہماری قوم اپنی روحانی، اخلاقی، تمدنی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کی کامل ترین نشوونما اور اس مقصد کے لیے وہ طریق عمل اختیار کر سکے جو اس کے نزدیک بہترین ہو اور ہمارے نظریات اور نصب العین سے ہم آہنگ ہو۔''

آپ نے مزید فرمایا:

''اسلام اور ہندو دھرم محض دو مذاہب نہیں، بلکہ درحقیقت دو مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ ان کے پیرو آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے اور نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ ان کا تعلق واضح طور پر دو مختلف تہذیبوں سے ہے اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں بلکہ متصادم رہتے ہیں۔

انسانی زندگی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات اور تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کے تاریخی وسائل اور ماخذ مختلف ہیں۔ ان کی رزمیہ نظمیں، ان کے قومی ہیرو اور قابل فخر تاریخی کارنامے سب مختلف اور الگ الگ ہیں۔ اکثر ایک قوم کا عظیم رہنما دوسری قوم کی بزرگ و برتر ہستیوں کا دشمن ثابت ہوتا ہے۔ ایک قوم کی فتح دوسری کی شکست ہوتی ہے۔ پس دونوں ہر اعتبار سے علیحدہ قومیں ہیں۔''



اتحاد، ایمان اور تنظیم

قائداعظم نے قوم کو جو ٹھوس نعرہ دیا ہے وہ ہے اتحاد، ایمان، تنظیم۔ یہ کوئی سیاسی نعرہ نہیں تھا۔ جو کسی وقتی مصلحت کے تحت کسی محدود وقتی مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے بلند کیا گیا ہو۔ یہ قائداعظم کی اپنی زندگی کے رہنما اصول تھے۔ جن پر وہ تمام زندگی خود کار بند رہے اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ انہی بنیادی اصولوں کو انہوں نے اپنے ورثے کے طور پر قوم کے سپرد کیا۔ آج قائداعظم خود دنیا میں موجود نہیں لیکن ان کے دیئے ہوئے اصول قوم کی رہنمائی کے لیے روشنی کے مینار کی طرح موجود ہیں۔ اتحاد، ایمان، تنظیم کا نعرہ ایک تکون ہے جس میں بنیادی اہمیت ایمان کو حاصل ہے۔ اتحاد اور تنظیم، ایمان کے بغیر ممکن نہیں۔ قائداعظم نے قوم کو اتحاد، ایمان، تنظیم کی بار بار تلقین کی۔

27 جون 1946ء کو مسلم لیگ کونسل، بمبئی سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

''میں محسوس کرتا ہوں کہ اب مسلم لیگ کے لیے وہ وقت آ گیا ہے جب ہمارا نعرہ اتحاد، ایمان اور تنظیم ہونا چاہیے۔ اگر ہماری قوم میں کافی طاقت نہیں ہے تو ہمیں کافی طاقت پیدا کرنا ہوگی۔''

25 جون 1947ء کو آپ نے فرمایا۔

''مسلمانوں کی نجات ان کے اتحاد، ایمان اور تنظیم میں پنہاں ہے۔''

7 جولائی 1947ء کو لندن مسلم لیگ کی دعوت کے جواب میں قائداعظم نے یہ تار دیا۔

''پاکستان بن گیا۔اس کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ آپ حصول پاکستان کی خوشی میں ایک ضیافت منعقد کر رہے ہیں اور اس میں مجھے بھی مدعو کیا ہے۔اب ہمارے سامنے پاکستان کی تعمیر و ترقی کا زیادہ بڑا اور مشکل کام ہے جو ہماری طاقت و توانائی کے ایک ایک ذرے کا تقاضا کرتا ہے۔ان شاء اللہ ہم اس نئی اور سب سے بڑی اسلامی مملکت کو مکمل اتحاد، ایمان اور تنظیم سے دُنیا کی ایک عظیم اور مثالی مملکت بنا دیں گے۔''

پاکستان بننے کے چند مہینے بعد 30اکتوبر 1947ء کو قائداعظم نے لاہور ریڈیو سے قوم کو یوں خطاب کیا۔

''اگرچہ افق پر تاریکی کے بادل چھائے ہوئے ہیں لیکن میں آپ سے اپیل کرتا ہوں اور قوم کے نام پیغام دیتا ہوں کہ اپنے اندر جذبہ اور جوش وخروش پیدا کرو اور حوصلے اور امید کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔ان شاء اللہ کامیابی ہماری ہے۔ان مشکل حالات میں کیا ہم مایوس ہو کر بیٹھ جائیں؟ ہرگز نہیں۔اسلام کی تاریخ اولوالعزمی، حوصلے اور مستقل مزاجی کی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے۔پس مشکلوں، رکاوٹوں اور مصیبتوں کے باوجود آگے بڑھتے جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ سات کروڑ افراد کی ایسی متحد قوم جو آگے بڑھتے عظیم ارادے کی مالک ہو، عظیم تہذیب رکھتی ہو، عظیم تاریخ کی وارث ہو، اسے کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہونا چاہیے۔اب یہ آپ پر ہے کہ کام کریں۔ کام، کام، کام۔ کامیابی ہمارا مقدر ہے اور اپنا یہ نعرہ کبھی نہ بھولیے۔اتحاد، ایمان، تنظیم!''

19فروری 1948ء کو آسٹریا کے لوگوں کے نام نشریاتی پیغام میں قائداعظم نے ''ایمان'' کی یوں وضاحت کی۔

''ہماری وحدت اور ہم آہنگی کا راز ہے ایمان، اللہ پر ہمارا ایمان، اپنی ذات پر ہمارا ایمان، اپنی تقدیر پر ہمارا ایمان۔''

28 مارچ کو ڈھاکہ کے جلسہ عام میں قائداعظم نے فرمایا۔

''پاکستان مسلمانوں کے اتحاد کا مظہر ہے اور ایسے ہی رہنا چاہیے۔ سچے مسلمانوں کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ آپ دل و جان سے اس کی پاسبانی اور حفاظت کریں۔اگر ہم یہ سمجھنے لگیں کہ ہم پہلے بنگالی، پنجابی، سندھی وغیرہ ہیں اور مسلمان، پاکستانی محض اتفاقیہ، تو جان لیجیے کہ پاکستان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔''

اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے 17اپریل1948ء کو پشاور میں قبائلی سرداروں سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے کہا:

''ہمیشہ سے میری کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو جائے اور مجھے امید ہے کہ اس عظیم مملکت پاکستان کی تعمیر و ترقی کا جو کام اس وقت ہمارے سامنے ہے اسے دیکھتے ہوئے سب کو اس بات کا پورا احساس ہوگا کہ اس وقت اتحاد کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔''

قائداعظم نے نہ صرف اتحاد کی تلقین کی بلکہ اتحاد کی بنیاد کی بھی نشاندہی کی۔ اس خطاب میں آپ نے فرمایا۔

> ''ہم مسلمان ایک خدا، ایک رسول ﷺ، ایک کتاب پر یقین رکھتے ہیں۔ پس لازمی اور ناگزیر ہے کہ ہم ملت کی حیثیت سے بھی ایک ہوں۔''

پاک فضائیہ کے حوالے سے تنظیم کی اہمیت اور ضرورت پر آپ نے فرمایا:

''ہوائی جہازوں اور ان کے عملے کی تعداد سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل چیز فضائیہ میں جذبہ شوق اور سخت نظم و ضبط ہے۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ صرف نظم و ضبط اور خود اعتمادی ہی پاکستان کی فضائیہ کو پاکستان کے شایان شان بنا سکتی ہے۔''

پاکستان بحریہ کے جہاز ''دلاور'' کے افتتاح پر قائداعظم نے ایمان، تنظیم کی اہمیت پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا۔

''پاکستان کے دفاع کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں ہر ایک کو اپنی جگہ الگ الگ انتہائی اہم کردار ادا کرنا ہے۔ اس کے لیے آپ کو نعرہ یہ ہونا چاہیے۔ ایمان، تنظیم، ایثار۔''



تعمیر پاکستان

اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل و کرم سے اور قائداعظم کی رہنمائی میں برصغیر کے مسلمانوں کی مسلسل و بے مثال جدوجہد اور بے دریغ قربانی و ایثار سے 14اگست 1947ء کو پاکستان بہت مشکل حالات میں وجود میں آ گیا۔لیکن تعمیر پاکستان کا مشکل تر مرحلہ باقی تھا۔ 17اگست 1947ء کو جمعۃ الوداع تھا۔قائداعظم نے اپنے پیغام میں کہا:

''مسلمانان ہند نے دنیا کو دکھا دیا ہے کہ وہ ایک متحد قوم ہیں۔ان کا نصب العین صحیح اور انصاف پر مبنی ہے۔آیئے، اس نعمت پر ہم عاجزی و انکساری سے خدا کا شکر بجالائیں اور دعا کریں کہ وہ ہمیں اس نعمت کے لائق بنا دے۔آج کے دن قومی تاریخ کا ایک صبر آزما دور ختم ہو رہا ہے اور ایک نئے قابل قدر دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ پاکستان کی سرزمین میں زبردست خزانے چھپے ہوئے ہیں۔مگر اس کو ایک ایسا ملک بنانے کے لیے جو مسلمان قوم کے رہنے کے قابل ہو، ہمیں اپنی قوت اور محنت کے ذخیرے کا ایک ایک ذرہ صرف کرنا پڑے گا۔ مجھے امید ہے کہ تمام پاکستانی پاکستان کی تعمیر میں دل و جان سے حصہ لیں گے۔''

دوسرے دن 18اگست 1947ء کو پاکستان کی پہلی عید تھی۔اپنے یوم عید کے پیغام میں قائداعظم نے پھر پاکستانیوں کو یاد دلایا۔

''اس میں شک نہیں کہ ہم نے پاکستان حاصل کر لیا ہے لیکن یہ تو محض آغاز ہے۔ اب بڑی بڑی ذمہ داریاں ہمارے کندھوں پر آ پڑی ہیں اور جتنی بڑی ذمہ داریاں ہیں اتنا ہی بڑا ارادہ۔اتنی ہی عظیم جد و جہد کا جذبہ ہم میں پیدا ہونا چاہیے۔ پاکستان حاصل کرنے کے لیے جو قربانیاں دی گئیں اور جو کوششیں کی گئی ہیں پاکستان کی تشکیل و تعمیر کے لیے بھی کم از کم

اتنی ہی قربانیوں اور کوششوں کی ضرورت پڑے گی۔ حقیقی معنوں میں تو اس کام کا وقت آ پہنچا ہے اور مجھے پورا پورا یقین ہے کہ مسلمانوں کی ذہانت اور فراست اس بارِ عظیم کو حوصلے سے اٹھا سکے گی اور اس بظاہر پیچیدہ اور دشوار گزار راستے کی تمام مشکلات کو آسانی سے طے کرے گی۔''

11 اکتوبر 1947ء کو حکومت پاکستان کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے تخلیق پاکستان کے نصب العین کی یوں وضاحت کی:

''کسی قومی ریاست کو معرضِ وجود میں لانا مقصد بالذات نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ کسی مقصد کے حصول کے ذریعہ کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کی تخلیق کریں جہاں آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں۔ جو ہماری تہذیب و تمدن کی روشنی میں پھلے اور پھولے اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور کو پوری طرح پنپنے کا موقع ملے۔''

اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے متواتر قربانی و ایثار کی ضرورت ہے۔ چنانچہ 24 اکتوبر 1947ء کو اپنے عیدالاضحیٰ کے پیغام میں قائداعظم نے پاکستانیوں کو یاد دلایا۔

''ہم جتنی زیادہ تکلیفیں سہنا اور قربانیاں دینا سیکھیں گے اتنا ہی زیادہ پاکیزہ، خالص اور مضبوط قوم کی حیثیت سے ابھریں گے۔ جیسے سونا آگ میں تپ کر کندن ہو جاتا ہے۔''

اگست 1947ء کے بعد کے مہینے پاکستانیوں کے لیے بہت صبر آزما تھے۔ ان نہایت مشکل حالات میں قائداعظم اپنی منصبی مصروفیتوں کے باوجود قوم کو رہنمائی فراہم کرتے رہے۔ 30 اکتوبر 1947ء کو لاہور کے جلسہ عام میں قائداعظم نے اعلان کیا۔

''اگر ہم ہر مرحلے میں رہنمائی قرآن مجید سے حاصل کریں تو مجھے یقین ہے کہ آخری کامیابی ہماری ہوگی۔''

اس دن ایک نشری بیان میں قائداعظم نے قوم کو یہ پیغام دیا۔

''آیئے، ہم اپنی عظیم قوم اور اپنی خودمختار مملکت پاکستان کی تشکیل و تعمیر کے لیے کچھ تدبیریں کریں۔ یہ ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے سنہری موقع ہے اور اس کی خوش قسمتی بھی کہ وہ اپنے حصے کا بھرپور کردار ادا کرے اور بڑی سے بڑی ذاتی قربانیاں دے اور پاکستانی قوم اور ملک کو دنیا کی عظیم ترین قوم اور ملک بنانے کے لیے دن رات انتھک محنت کرے۔ اب پاکستان کی عزت اور ترقی آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ بلاشبہ ہم میں بے پناہ

صلاحیتیں موجود ہیں۔ پاک سرزمین زبردست وسائل و ذرائع اور امکانات ترقی کی حامل ہے۔ باری تعالیٰ نے ہمیں قدرتی دولت بڑی فراوانی کے ساتھ عطا کی ہے۔ اب یہ کام انسانی ہاتھوں کا ہے کہ وہ اس دولت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

اس بار عظیم (تعمیر پاکستان) کی شدت اور سنگینی سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ تاریخ میں ایسی نئی اقوام کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ جنہوں نے محض قوت ارادی اور بلند کرداری سے خود کو بنایا اور عظیم کیا۔ آپ کا خمیر فولادی قوتوں سے اٹھا ہے اور ہمت کے معاملے میں آپ دنیا میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ پھر آخر آپ دوسروں کی طرح کامیاب کیوں نہیں ہو سکتے۔ خاص طور پر اپنے آباؤ واجداد کی طرح۔ آپ کا اپنی ذات میں فقط مجاہدوں کی تاریخ حیرت انگیز طور پر بلند کردار، باحوصلہ، شجاع اور اولوالعزم ہستیوں سے بھری پڑی ہے۔ اپنی روایات کی رسی مضبوطی سے تھام لیجیے اور اپنی تاریخ میں شان وشوکت کے ایک اور باب کا اضافہ کیجیے۔''

تعمیر پاکستان میں افواج پاکستان کو جو کردار ادا کرنا تھا اس کی نشاندہی یوں کی:

''ہم نے پاکستان کی آزادی کی جنگ تو جیت لی ہے لیکن اس آزادی کو برقرار رکھنے اور مستحکم اور مضبوط بنیاد پر تعمیر کرنے کی جنگ، سنگین تر جنگ، ابھی جاری ہے۔''

(افواج پاکستان سے خطاب، 21 فروری 1948ء)



قائداعظم رحمہ اللہ اور طلبا

بحیثیت قائد کے قائداعظم رحمہ اللہ کو خوب معلوم تھا کہ قوم کے کس حصے سے کیا کام لینا ہے اور کیسے لینا ہے؟ 1946ء کے الیکشن کے جیتتے ہی مسلم لیگ کی سیاسی جدوجہد ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوئی۔ قائداعظم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ملک کے دوسرے حصوں کے مسلم طلبا کو تحریک پاکستان سے روشناس کیا اور انہیں پاکستان کے حصول کی جدوجہد کے لیے تیار کرنا شروع کیا۔ تحریک پاکستان کو ولولے، جوش، قربانی اور ایثار کے ساتھ نئے ذہن، نئی فکر کی ضرورت بھی تھی تاکہ تحریک پاکستان کے مقاصد کی روشنی گھر گھر پہنچ جائے۔ نوجوان طلبا ہی اس کام کو بہتر طور پر انجام دے سکتے تھے۔ چنانچہ قائداعظم رحمہ اللہ نے طلبا کو تحریک پاکستان کا ہراول دستہ بنایا۔

لیکن طلبا کی قوت کو کام میں لانا کوئی سستا سیاسی کرتب نہ تھا۔ قائداعظم رحمہ اللہ سستی سیاست کے حربے استعمال کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ اعلیٰ مقاصد کو اعلیٰ طریقوں سے حاصل کرنے کے قائل تھے۔ انہوں نے طلبا کے جوش و خروش، ولولے اور ایثار کے جذبے ہی سے کام نہیں لیا بلکہ ان کی ذہنی اور جذباتی تربیت بھی کی۔ انہیں ان کی تعلیمی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔ نظم و ضبط کا پابند ہونے کی تلقین بھی کی۔ انہیں نوجوان طلبا پر اعتماد تھا کہ انہوں نے فرمایا:

”مجھے امید ہے کہ آپ ہی میں سے بہت سے جناح پیدا ہوں گے۔ مجھے مستقبل سے کوئی اندیشہ نہیں اگر یہ تمہارے ہاتھ میں ہو۔“

لیکن جناح بننا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس مشکل کام کو آسان کرنے کی راہیں بھی انہوں نے خود ہی بتائیں۔

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے وفد سے آپ نے فرمایا:

”آپ مستقبل کے معمار قوم ہیں۔ اس لیے جو مشکل کام آپ کے سر پر کھڑا ہے اس سے نمٹنے کے لیے اپنی شخصیت میں نظم و ضبط پیدا کیجیے۔ مناسب تعلیم اور مناسب تربیت

حاصل کیجیے۔آپ کو پورا پورا احساس ہونا چاہیے کہ آپ کی ذمہ داریاں کتنی زیادہ اور کتنی شدید ہیں۔ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے آپ کو ہر وقت تیار اور مستعد رہنا چاہیے۔''

مصروف عمل ہونے کی تاکید

''میں آپ کو مصروف عمل ہونے کی تاکید کرتا ہوں۔کام، کام اور بس کام۔ پرسکون طریقے سے صبر و برداشت اور انکساری کے ساتھ اپنی قوم کی سچی خدمت کرتے جائیے۔''

(آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس۔15نومبر 1942ء جالندھر)

اسی تقریر میں آپ نے مسلم طلبا کو روشن دماغ اور دانائے راز ہونے کی ضرورت سے بھی آگاہ کیا۔واضح رہے کہ یہ زمانہ تحریک پاکستان کا تھا۔آپ نے فرمایا:

''جب تک آپ طالب علم ہیں، آپ اپنی کوششوں کو محض تیاری تک محدود رکھیں اور عملی سیاست میں حصہ نہ لیں۔آپ کو چاہیے کہ آپ تمام ہندوستان کے مسلم طلبا کو منظّم کریں اور مسلمانان ہند کی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی نشوونما اور ترقی کے لیے ایک لائحہ عمل بنائیں اور اسے عملی جامہ پہنائیں۔آپ کا یہ فرض بھی ہے کہ آپ اسلامی تہذیب کو فروغ دیں۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ آپ عملی سیاست میں حصہ نہ لیں۔ میں اس امر کی بھی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے میرا اصل مطلب کیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے اندر وہ اوصاف پیدا کریں جن کے وسیلے سے آپ طالبعلمی کی زندگی ختم کرنے کے بعد عملی سیاست کی جدوجہد میں کامیاب ہوں۔ آپ اس وقت اپنے آپ کو تیار کریں اور ضروری ساز وسامان یعنی علم و آگہی اور توفیق عمل سے آراستہ کریں۔

آپ کی اوّلین اور اہم ترین ضرورت ہے۔ مطالعہ! مطالعہ! مطالعہ! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان طلبا اور عام طور پر مسلمانوں میں عظیم الشان بیداری پیدا ہوگئی ہے۔ترقی کی ضرورت کا احساس موجود ہے۔ جوش وخروش ہے، ولولہ ہے لیکن ساتھ ہی جذباتی نعرے بھی سنائی دیتے ہیں۔آپ اسی صورت میں دوسروں کے خیالات بدل سکتے ہیں جب کہ پہلے آپ خود روشن ضمیر ہوں۔ آج کل دانائے راز ہونے کی خصوصی ضرورت ہے کہ گمراہ کن باتیں زور و شور سے کی جارہی ہیں۔''

تعلیم، پہلا فرض

''آپ تعلیم پر پورا دھیان دیں۔ اپنے آپ کو عمل کے لیے تیار کریں۔ یہ آپ کا پہلا فریضہ ہے۔ آپ کی تعلیم کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ آپ دور حاضر کی سیاست کا مطالعہ کریں۔ یہ دیکھیں کہ آپ کے گرد دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔''

(کراچی۔ 26 ستمبر 1947ء)

لیکن پاکستانی طلبا کے لیے صرف علم کافی نہیں تھا۔ کردار، عزم، حوصلے کی بھی ضرورت تھی۔ 30 اکتوبر 1947ء کو لاہور میں طلبا سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''میں پاکستان کے ہر باشندے اور بالخصوص نوجوان طلبا کو یہ بات اچھی طرح بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ خدمت، ہمت اور برداشت کے سچے جذبے کا مظاہرہ کریں۔ بلند کرداری کی ایسی مثالیں قائم کریں کہ آپ کے ہم عصر اور آنے والی نسلیں آپ کی تقلید کریں۔''

قائداعظم رحمہ اللہ کی نظر میں طالب علم کا کام علم کی طلب وجستجو ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو جہاد کے لیے تیار کرنا بھی ہے۔ آپ نے اسی خطاب میں طلبا کو یہ تلقین بھی کی۔

''اپنے حوصلے کو ہر صورت میں بلند رکھیے۔ موت سے نہ ڈریئے۔ ہمارا مذہب یہی سکھاتا ہے کہ ہمیں موت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اسلام اور پاکستان کی عزت بچانے کے لیے ہمیں موت کا مقابلہ بہادری سے کرنا چاہیے۔ مسلمان کے لیے اس سے بہتر اور کوئی وسیلہ نجات نہیں ہوسکتا کہ وہ صداقت کی خاطر شہید کی موت مر جائے۔''



قائداعظم رحمہ اللہ اور تعلیم

قائد کی قیادت ہمہ گیر تھی۔ قومی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو ان کی رہنمائی کی روشنی سے روشن نہ ہو۔ تعلیم کے موضوع پر ان کے بیانات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

تعلیم زندگی اور موت کا مسئلہ

''ہماری قوم کے لیے تعلیم زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ دنیا اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کہ اگر آپ نے اپنے آپ کو تعلیم یافتہ نہ بنایا تو نہ صرف یہ کہ آپ پیچھے رہ جائیں گے بلکہ خدانخواستہ بالکل ختم ہو جائیں گے۔

تعلیم کی اشاعت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اس مقصد کی خاطر جتنی بھی مصیبتیں جھیلی جائیں کم ہیں۔''

(کراچی۔26 ستمبر 1947ء)

تلوار سے بھی زیادہ طاقتور

3 جولائی 1943ء کو بلوچستان مسلم لیگ کے اجلاس کے موقع پر طلبا نے تلوار کو روایتی تحفے کے طور پر پیش کیا تھا۔ قائداعظم نے اس کے جواب میں یہ معنی خیز فقرے کہے۔

''یہ تلوار جو آپ نے مجھے عنایت کی ہے۔ صرف حفاظت کے لیے اٹھے گی لیکن فی الحال جو سب سے ضروری امر ہے وہ علم ہے۔ علم تلوار سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ جایئے اور علم حاصل کیجیے۔''

لیکن وہ برطانوی دور کے پرانے طرز تعلیم کی خامیوں سے بھی خوب واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے کل پاکستان تعلیمی کانفرنس کراچی میں 27 نومبر 1947ء کو یہ پیغام دیا۔

''ہمیں اپنی تعلیمی پالیسی اور پروگرام کو ایسے خطوط پر چلانا ہے جو ہمارے لوگوں کے مزاج کے مطابق ہو۔ جو ہماری تاریخ اور ثقافت سے ہم آہنگ ہو۔ جو دنیا میں ہونے والی وسیع تر ترقیوں اور جدید تقاضوں کے مطابق ہو۔''

آپ نے زور دے کر کہا:

''پاکستان کی ترقی کا انحصار زیادہ تر طرز تعلیم پر ہے یعنی ہم کس طرح اپنے بچوں کو پاکستان کا سچا خدمت گار بناتے ہیں۔''

تعلیم کا مطلب محض کتابی تعلیم نہیں ہوتا اور ہمارے ہاں کتابی تعلیم بھی خیر سے بہت کمزور اور ناقص ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے لوگوں کی توانائیوں کو ایک راہ پر لگائیں اور آنے والی نسلوں کے کردار کی تعمیر ابھی سے کریں۔ اس امر کی فوری اور اشد ضرورت ہے کہ ہمارے جوانوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں تعلیم دیجیے کیونکہ اسی سے ہماری مستقبل کی معاشی زندگی کا معیار بلند ہوگا۔

تعلیم کے ساتھ کردار کی تربیت پر قائداعظم نے ہر موقعہ پر تاکید کی۔ انہوں نے فرمایا:

''بغیر کردار کے ڈگری کا حصول محض تضیع اوقات ہے۔''

تعلیم کے عمل میں ذہنی نشو ونما کی تربیت کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت اور مضبوطی کی جو اہمیت ہے اس کے بارے میں قائداعظم رحمہ اللہ نے فرمایا۔

''آپ کے لیے میرا پیغام یہ ہے کہ جسمانی قوت پیدا کیجیے۔ لڑائی جھگڑے زبردستی کے لیے نہیں بلکہ سپاہیانہ قوت پیدا کرنے کے لیے تاکہ آپ عمر بھر قومی زندگی کے ہر شعبے میں طاقت، توانائی کا سرچشمہ بنے رہیں۔''

(کل پاکستان اولمپک کھیل۔ 23 مارچ 1948ء)



دوسرا حصہ

قائداعظم رحمہ اللہ شخصیت و کردار

 قائداعظم رحمہ اللہ کی عظمت کا تجزیہ

 قائداعظم رحمہ اللہ کی شخصیت کا مطالعہ

 کردار قائداعظم رحمہ اللہ

قائداعظم رحمۃ اللہ کی عظمت کا تجزیہ

قائداعظم رحمۃ اللہ کی غیر معمولی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ اندھی عقیدت یا اندھی وفاداری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ نہ انہوں نے خود کسی کو بت بنایا تھا نہ انہیں خود بت بننا منظور تھا۔ وہ تجزیاتی اور تجرباتی ذہن رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ پاکستانی عوام و خواص بھی یہی غیر جذباتی ذہنی رویہ اختیار کریں تاکہ وہ موجودہ زمانے کے پیچیدہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل سے بہتر طور پر عہدہ برآ ہو سکیں۔

قائداعظم رحمۃ اللہ بلاشبہ اس دور کی عظیم شخصیت تھے۔ ان کی عظمت کا اعتراف ان کے دوستوں ہی نے نہیں، دشمنوں نے بھی کیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی عظمت کا راز کیا تھا؟ کس چیز نے قائداعظم رحمۃ اللہ کو قائداعظم بنایا۔ وہ کون سی صفات تھیں جن کی وجہ سے وہ تخلیق پاکستان کی جنگ اتنے نامساعد حالات میں جیت سکے۔

اس سلسلے میں ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ عظمت ذاتی نہیں اجتماعی ہوتی ہے۔ ایک لیڈر کو حالات اور تاریخی عوامل کا دھارا عظیم بنا دیتا ہے۔ لیڈر کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ان تاریخی عوامل کے دھارے کو خاطر خواہ رخ دے سکے اور اجتماعی طاقت سے اپنی فراست کے مطابق کام لے سکے۔ اس نقطہ نظر کا جواب یہ ہے کہ یہی تو عظمت ہے۔ تاریخی عوامل کی طاقت کو اپنے قومی مفاد کے مطابق زیر کر لینا ہی بڑائی ہے۔ حالات اور عوامل تو سب کے لیے یکساں ہوتے ہیں۔ جو ان سے خاطر خواہ کام لے سکے اسی کو تو ''میر کارواں'' کہتے ہیں۔

شخصیت کی تکون کے تین ضلعے ہوتے ہیں۔ وراثت، ماحول اور کردار۔ قائداعظم رحمۃ اللہ کی عظمت کو ان ہی تین گوشوں میں تلاش کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے نسلی اور

خاندانی خصوصیات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

''نقوش قائداعظم'' نامی کتاب میں اسد ملتانی کی روایت اور قائداعظم رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ قائداعظم رحمہ اللہ نسلاً پنجابی راجپوت تھے۔ پورا واقعہ یوں ہے کہ تحریک پاکستان کے زمانے میں جب قائداعظم رحمہ اللہ باغ پت ضلع میرٹھ کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے تھے تو نواب باغ پت نے قائداعظم رحمہ اللہ سے کہا:

''آپ کا خاندان تو تجارت پیشہ ہے، آپ میں یہ کڑک کہاں سے آئی؟''

اس پر قائداعظم رحمہ اللہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

''نواب صاحب! میں تو پنجابی راجپوت ہوں۔ کئی پشتیں گزریں میرے ایک جد کاٹھیاواڑ چلے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے ایک خوجہ لڑکی سے شادی کر لی اور انہی کے خاندان میں مل گئے۔ اس وقت سے ہم لوگ خوجوں میں شمار ہونے لگے۔ میرے جد جو کاٹھیاواڑ چلے گئے تھے ضلع منٹگمری (ساہیوال) کے رہنے والے تھے۔''

اس روایت کی تصدیق کسی اور سوانح نگار نے نہیں کی ہے۔ کتاب ''قائداعظم جناح'' کے معتبر مصنف جی الانہ نے جنہیں قائداعظم سے مدتوں ذاتی شرف نیاز حاصل رہا تھا، صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ محمد علی جناح رحمہ اللہ کے آبا و اجداد کاٹھیاواڑ کے راجواڑے گونڈل کے گاؤں پانیلی کے باشندے تھے۔ ان کے دادا پونجا میگھ جی کا کپڑا بننے کا چھوٹا سا کاروبار تھا اور ان کا شمار گاؤں کے شرفا میں ہوتا تھا۔ پونجا میگھ جی کے تین بیٹے تھے، والجی بھائی، نتھو بھائی، جناح بھائی۔ سب سے چھوٹے جناح پونجا سب سے زیادہ باہمت، باحوصلہ تھے اور تجارتی ذہن رکھتے تھے۔ اپنی تجارتی تگ و تاز کے لیے گونڈل کا میدان تنگ پا کر جناح پونجا کراچی منتقل ہو گئے اور اپنی تجارتی فراست و ذہانت اور محنت سے انہوں نے ایکسپورٹ امپورٹ اور بینکاری کے کاروبار کو خوب چمکایا۔

لیکن جناح پونجا محض کاروباری آدمی نہیں تھے۔ وہ کراچی کے چرچ مشن نامی ایک انگریزی سکول میں استاد بھی رہے تھے۔ خود بھی انگریزی جانتے تھے۔ سرسید کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے کراچی کے باشعور مسلمانوں کے ساتھ 1885ء میں سندھ مدرسہ الاسلام کی بنیاد رکھنے میں عملی مدد کی تھی۔ محمد علی جناح کے ننھیال کے بارے میں بھی کچھ نئی معلومات منظر عام پر آئی ہیں۔ جو ان کی وراثت کے مطالعہ میں اہمیت رکھتی

ہیں۔ محمد علی جناح رحمہ اللہ کی والدہ شیریں بائی جو سسرال میں اپنے حسن صورت و سیرت کی وجہ سے مٹھی بائی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ نسلاً ایرانی تھیں۔ وہ آغا خاں اول کے ایک وزیر موسیٰ جمعہ کی بیٹی تھیں۔ 1874ء میں ان کی شادی جناح پونجا سے ہوئی تھی۔

شیریں بائی کا خاندان اپنی نجابت، شرافت اور علم و فضل میں یکتائے روزگار تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ شیریں بائی فہم و فراست میں یگانہ ہونے کے ساتھ علم و فضل میں بھی کچھ نہ کچھ دخل تو ضرور رکھتی ہوں گی۔ فارسی عربی تو جانتی ہی ہوں گی۔ اسماعیلی عقیدہ تو خیر پونجا خاندان کا بھی تھا۔ اسماعیلی حاضر امام آغا خان سے اتنا قریبی تعلق رکھنے کی وجہ سے مذہبی قدروں سے ان کی وابستگی بھی زیادہ ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ محمد علی جناح کا نام ''محمد علی'' ان کے ماموں اسماعیلی امیر کبیر موسیٰ قاسم نے رکھا تھا۔ ان کی ماں پیار سے انہیں محمد کہتی تھیں۔ جناح پونجا کے گھرانے کے ماحول میں یقیناً یہ نئی چیز ہوگی۔ یہ تحقیق تو نئی ہے۔ لیکن اس سے پہلے بھی محمد علی جناح کی والدہ کے بارے میں کچھ معلومات تھیں۔ وہ پانیلی کے ایک اسماعیلی صوفی بزرگ حسن پیر سے عقیدت رکھتی تھیں۔ انہی کے اصرار پر محمد علی کے عقیقے کی رسوم ادا کی گئیں۔ ان حقائق سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ محمد علی جناح کے ماں باپ دونوں روشن ضمیر تھے۔

مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ باپ سے انہوں نے ہمت و حوصلے سے کام کرنا، محنت کرنا، اپنے اوپر اعتماد کرنا، نئی راہیں نکالنا اور جزرسی سیکھی۔ ماں کی طرف سے شائستگی، نفاست اور مذہبی و اخلاقی قدروں سے وابستگی انہیں ورثے میں ملی۔

لیکن قائداعظم رحمہ اللہ کی عظمت کو محض وراثت اور خاندان کے اثرات کے حوالے سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان کے پائے کے عظیم انسان اپنی دنیا آپ پیدا کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ لندن میں اپنی تجارتی فرم کی ناکامی پر انہوں نے خود ہی قانون پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ بھی ان کا اپنا تھا۔ ان دو فیصلوں کی راہ میں جو رکاوٹیں تھیں وہ بھی انہوں نے خود اپنی فراست، خود اعتمادی اور قوت ارادی سے عبور کیں۔

1896ء میں جب وہ بیرسٹر بن کر کراچی واپس آئے تو ان کے والد کا کاروبار مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ خاندان مالی بحران کا شکار تھا۔ بظاہر بہتر یہی نظر آتا تھا کہ وہ کسی قانونی فرم میں ملازم ہو جاتے اور اپنی مالی حالت کو مستحکم کرتے۔ ایسی ملازمتوں کے امکانات بھی موجود تھے بلکہ کہا جاتا ہے کہ ایسی جگہیں انہیں پیش بھی کی گئیں لیکن محمد علی نے اس جال میں

پھنسنے سے انکار کر دیا اور صرف اپنے حوصلے اور عزم کو ساتھ لے کر وسیع امکانات کے شہر بمبئی میں اپنے لیے نئی منزلیں تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے۔

نہ صرف انہوں نے اپنے آبائی پیشے تجارت کو خیر باد کہا بلکہ عقیدے میں بھی اپنی فہم اور رائے کے مطابق ترمیم کی۔ ان کے خاندان کے سب لوگ اسماعیلی شیعہ عقیدے کے تھے۔ آغا خان کو امام حاضر مانتے تھے۔ ابوالحسن اصفہانی کی روایت کے مطابق انہوں نے 21 سال کی عمر میں آبائی عقیدے کو چھوڑ کر اپنے سارے خاندان سمیت اثنا عشری مسلک اختیار کر لیا۔ بلکہ خود کو بھی ترغیب دی کہ وہ اثنا عشری مسلک کی طرف رجوع کریں۔ یہ ان کی خودنگری کی بہت واضح مثال ہے۔ مختصر یہ کہ انہیں والدین سے بھی بہت کچھ ملا۔ ماحول سے بھی انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ علم وتربیت نے بھی ان کے جوہر چمکائے لیکن وہ صفات، وہ قدریں، وہ رویے، وہ عادات، وہ اصول، وہ کردار اور وہ ذہن جس نے انہیں چمڑے کے ایک تاجر کے بیٹے سے ایک قوم کا قائداعظم رحمۃ اللہ اور ایک ملک کا خالق بنا دیا ان کے انفرادی کردار کا کارنامہ تھا۔ اس لیے ان کی عظمت کا سراغ ان کے کردار کے تجزیے سے مل سکتا ہے۔

اس لحاظ سے ان کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے کردار کی دو خصوصیتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں، ایک تو اپنے لیے خود سوچ سکنا، اپنے لیے خود فیصلہ کرنا اور پھر اک خود اعتمادی سے کیے ہوئے فیصلے کو بروئے کار لانے کے لیے ارادے کی غیر معمولی قوت۔

سب سے مشکل کام دوسروں کے مشورے اور حالات کے رُخ کے خلاف اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس فیصلے پر حوصلے سے عمل کرنے اور کرتے رہنے میں اپنے اوپر اعتماد کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اپنے مقصد پر اعتماد کی بھی اور محنت و جفاکشی کی عادت کی بھی۔ قائداعظم محمد علی جناح کے کردار میں یہ تینوں صفتیں، قوت فیصلہ، قوت ارادی اور بے انتہا اور مسلسل محنت کی صلاحیت، کمال کے درجے میں موجود تھیں۔ سندھ مدرسے کی طالب علمی کے زمانے میں وہ رات گئے تک پڑھتے رہتے تھے اور اس روز کا کام ختم کیے بغیر نہیں سوتے تھے۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار ایک رشتے دار خاتون نے انہیں صحت کی خاطر دیر تک پڑھنے سے منع کیا تو انہوں نے کہا:

''بائی جی! میں محنت نہیں کروں گا تو بڑا آدمی کیسے بنوں گا۔''

انہوں نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ خود کیا۔ وہیں لندن میں 18یا 19برس کی عمر میں انہوں نے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی اور خود فیصلہ کیا کہ وہ عملی سیاست میں حصہ لیں گے اور ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کریں گے بلکہ ایک موقعہ پر انہوں نے دادا بھائی نوروجی کی طرح انگلستان سے برابری کی سطح پر ٹکر لینے کے بارے میں بھی سوچا۔ سیاست میں حصہ لینے کا جو فیصلہ انہوں نے آغاز جوانی میں کیا تھا اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ، کوئی ذاتی فائدہ نہ آسکا۔

جب انہوں نے 1900ء میں بمبئی میں پریذیڈنسی کی عارضی جگہ قبول کی تو یہ فیصلہ بہت سوچ کر کیا تھا۔ جیسے ہی وکالت جمنے کے امکانات ہوئے انہوں نے اس جگہ کو اس زمانے کے 1500 سوروپے ماہوار پر مستقل طور پر قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اتنی رقم تو میں ہر روز کمانا چاہتا ہوں۔ انہیں اپنے اوپر اعتماد تھا۔ ان کی نظر مستقبل پر تھی۔ ان کے ارادے میں اتنی قوت تھی کہ وہ جو مشکل فیصلہ کریں اس کو آخر تک نبھائیں بھی۔ خواہ وہ بہن رحمت بائی کی برادری سے باہر شادی کا مسئلہ تھا یا چھوٹی بہن فاطمہ کو باندرہ کے کانونٹ سکول میں پڑھانے کا مسئلہ یا خود اپنی شادی اور پھر علیحدگی کی بات یا بیٹی دینا کو عاق کر دینے کا فیصلہ۔ یہ سب ان کے اپنے فیصلے تھے اور انہوں نے اپنی قوت ارادی اور فراست سے انہیں آخر وقت تک نبھایا۔ یہی حال سیاسی فیصلوں کا تھا۔

1894ء میں انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کا عہد کیا تھا۔ تمام عمر وہ اس پر قائم رہے۔ اس زمانے میں وہ آزادی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کے قائل تھے۔ اس معاملے میں وہ بیشتر کانگریسی ہندو لیڈروں سے زیادہ مخلص تھے۔

1916ء کے لکھنؤ ایکٹ، 1929ء کے 14 نکات، 1932ء کی گول میز کانفرنس، 1937ء کے انتخابات سے 1946ء کے کیبنٹ مشن تک انہوں نے نہایت ایمانداری اور سچائی سے مسلمانوں کے جائز مفادات کے تحفظ کے ساتھ اتحاد کی کوشش کی۔ یہ وفاداری بشرط استواری کی بہترین مثال تھی۔

1920ء میں گاندھی اور مولانا محمد علی جوہر کی تحریک عدم تعاون سے تعاون نہ کرنا ان کی قوت فیصلہ اور سیاسی فراست کا بہت سخت امتحان تھا۔ عوامی لیڈروں کے لیے عوام کے جذبات اور رجحان کے خلاف فیصلہ کرنا بہت دُشوار ہوتا ہے لیکن محمد علی جناح اس سخت امتحان

سے بھی کامران گزرے۔ اس سے پہلے وہ رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کے طور پر وائسرائے کی کونسل کی رکنیت سے استعفیٰ دے چکے تھے۔

1934ء میں انگلستان سے آ کر انہوں نے مسلم لیگ کو ایک فعال اور منظّم عوامی جماعت بنانے کا تاریخی فیصلہ کیا تو کم وبیش وہ تنہا تھے۔ اس زمانے کے بڑے مسلمان لیڈر مسلم لیگ میں نہیں تھے۔ مسلم لیگ کو منظّم کرنے کے سلسلے میں وہ اے کے فضل الحق، سہروردی، سرسکندر ایسے بااثر لیڈروں سے نبٹتے رہے اور جب 1937ء میں کانگریس کے رویے سے ان کو یقین ہو گیا کہ ہندو مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق دینے پر کسی قیمت پر تیار نہیں تو انہوں نے پاکستان سے کم تر کسی چیز پر راضی ہونے سے انکار کر دیا اور 23 مارچ 1940ء سے قرارداد پاکستان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔

1942ء کا کرپس مشن، 1945ء کی شملہ کانفرنس اور 1946ء کا کیبنٹ مشن، سارے سیاسی مذاکروں میں ان کی جرأت فیصلہ اور قوت ارادی کے بڑے بڑے سخت امتحان آئے لیکن وہ پہاڑ کی طرح جمے رہے اور آخرکار 3 جون 1947ء کے اعلان سے پاکستان کا قیام ممکن ہوا۔

ان کی قوت ارادی کا امتحان جسمانی سطح پر بھی ہوا۔ 1941ء سے ان کی صحت متاثر ہونے لگی تھی۔ 46-1945ء کے تین سالوں میں ان کی سینہ کی بیماری اثر کرنے لگی تھی لیکن صرف اپنی قوت ارادی اور جذبے سے انہوں نے اس بیماری کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیا۔ چنانچہ شدید علالت کے باوجود اگست 1948ء کے اواخر تک وہ فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔

یکم جولائی 1948ء کو سٹیٹ بینک کے افتتاح کے لیے وہ بستر علالت سے اُٹھ کے آئے تھے۔

ان کی جرأت کا ایک امتحان تو فروری 1943ء میں آیا تھا جب رفیق صابر نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ ان کے حوصلہ کے امتحان کا وہ وقت بھی کم اہم نہیں تھا۔ جب 5 اگست 1947ء کو ایک نجی ملاقات میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انہیں بتایا کہ سی آئی ڈی کی اطلاعات کے مطابق 14 اگست 1947ء کو کراچی میں آزادی کی تقریبات کے دوران سکھوں کی طرف سے ان پر قاتلانہ حملے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ یہ خفیہ اطلاع انہوں نے

سکون سے سنی اور پھر اعتماد سے کہا:

''آزادی کی تقریبات اپنے پروگرام کے مطابق منعقد ہوں گی۔''

جی الانہ نے لکھا ہے کہ قتل کے اس منصوبے کی اطلاع 70 برس سے زائد عمر میں بھی ان کی قوت ارادی، حوصلے اور اعتماد کو متزلزل نہ کرسکی۔ خوف وہ چیز تھی جس سے وہ واقف ہی نہیں تھے۔

صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کرنے کی فراست اور پھر اس فیصلہ پر پختہ عزم و حوصلے کے ساتھ قائم رہنے کی جرأت اور قوت، یہ قائداعظم کے کردار کی دو اہم خصوصیتیں تھیں لیکن ایک تیسری خصوصیت بھی جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے، کچھ کم اہم نہیں ہے۔ یعنی ان کا غیر جذباتی انداز نظر! وہ جذباتی فیصلے نہیں کرتے تھے بلکہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر تمام مضمرات پر نظر کر کے ذاتی اور سیاسی فیصلے کرتے تھے۔ وہ جذباتی تو تھے، حساس بھی بہت تھے لیکن جذباتیت کا شکار نہیں تھے۔

1917ء میں وہ سرڈنشا پینٹ کی اس تجویز پر راضی ہو گئے کہ وہ رتن بائی سے شادی کرنے کے ارادے کو ایک سال تک ملتوی کر دیں۔ اس سے ان کے دل کو ضرور تکلیف ہوئی ہو گی لیکن جیسا کہ جی الانہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ رتن بائی کو سال بھر بعد آزادانہ فیصلہ کرنے کے حق سے محروم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ خواہ وہ فیصلہ ان کے خلاف ہی کیوں نہ پڑتا۔ یہ تو ذاتی محبت کی بات تھی۔ 1920ء میں تحریک عدم تعاون سے اختلاف کرنے کا فیصلہ بالکل غیر جذباتی فیصلہ تھا۔ اصفہانی نے اپنی کتاب میں مولانا بھاشانی کے سلسلے میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

''بے کار جذباتی باتوں اور رقیق القلبی کے لیے سیاست میں کوئی جگہ نہیں۔ سیاست شطرنج کی بازی ہے اور بُرائیوں کا مداوا آنسوؤں سے نہیں بلکہ محنت و جرأت اور عزم سے ہی ہوسکتا ہے۔ شدید سیاسی بحران کے زمانے میں دماغ کو ٹھنڈا اور آنکھوں کو خشک رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ انسان صاف طور پر دیکھ سکے اور فیصلہ کر سکے۔ برصغیر کی سیاست کا روایتی انداز اور لب ولہجہ جذباتیت کا رہا ہے۔ عوام کا مزاج بھی یہی ہے۔ اس کے باوجود ان کی سیاست جذباتیت سے عاری تھی۔ وہ عوام کے سامنے سیاسی تقریروں میں بھی جذباتی ہونے کی بجائے اپنے نقطہ نظر کو مدلل، واضح اور پُر جوش طریقے سے پیش کرتے تھے۔ عام

لوگوں کو صرف خوش رکھنے یا وقتی طور پر ہم خیال کرنے کے لیے جذباتی خطابت کے ہتھکنڈوں سے کام نہیں لیتے تھے۔ وکالت میں بھی ان کا انداز یہی تھا۔ جذباتیت سے بلند ہونا قائداعظم کی شخصیت کا ایک اہم عنصر تھا۔''

قائداعظم کے کردار کی چوتھی اور سب سے اہم خصوصیت جو انہیں برصغیر کے تمام سیاست دانوں سے ممتاز مقام عطا کرتی ہے وہ ان کی دیانت ہے، نفسیاتی بھی، ذاتی بھی، اخلاقی بھی اور سیاسی بھی۔ ہر سطح پر ان کی دیانت بے نظیر و بے مثال تھی۔ ان کی عظمت کا یہ ایک عجیب رُخ تھا کہ وہ فراست ہی میں نہیں، دیانت میں بھی جواب نہیں رکھتے تھے۔ وہ ایک باشعور اور باضمیر سیاستدان تھے۔ لوگ محبت، جنگ اور سیاست میں سب کچھ جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے ہم عصر بھی ایسا کرتے تھے لیکن وہ ان میدانوں میں بھی جائز کو ہی جائز سمجھتے تھے۔ ان کا واسطہ انگریز اور ہندو، دو ایسی طاقتوں سے تھا جو کسی خانے بند نہیں تھیں لیکن قائداعظم پھر بھی ان سے سیاسی جنگ میں کبھی معیار سے نہیں اُترے۔ جو سوچا وہ کہا، جو صحیح سمجھا، وہ کیا۔ جو وعدہ کیا، پورا کیا۔

بمبئی میں 1896ء سے 1899ء تک تین سال تک کا عرصہ ان کے لیے بہت صبر آزما تھا۔ مقدمے تقریباً نہیں ملتے تھے۔ اخراجات جاری تھے۔ خاندان کی کفالت بھی ان کے ذمہ تھی۔ روپے کی اشد ضرورت تھی۔ اس زمانے میں بعض دلالوں نے کمیشن پر مقدمے دلانے کی پیشکش کی۔ لیکن انہوں نے ان تجویزوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اصفہانی نے اپنی کتاب میں ان کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں انہوں نے کہا:

''میں بھوکا مر جانے کو اس طرح کی تجاویز قبول کرنے پر ترجیح دوں گا۔''

تحریک عدم تعاون کا زور توڑنے کے لیے حکومت تحریک عدم تعاون کے رہنماؤں سے ان کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے ساتھ ملانا چاہتی تھی۔ وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے انہیں ججی، لاممبری، سر کے خطاب، غرض ہر قسم کے اعزاز کی پیشکش کی۔ انہوں نے ہر پیشکش کو مسترد کر دیا۔ ریمزے میکڈانلڈ نے گورنری کا جال بھی ڈالا تھا۔ اس سے بڑی بات یہ کہ تحریک عدم تعاون سے عدم تعاون کر کے بھی انہوں نے حکومت سے تعاون نہیں کیا۔ ان کا اختلاف بھی اصولی ہوتا تھا اور اتفاق بھی اصولی۔

جب وہ بمبئی کے مسلم حلقے سے انتخاب لڑ رہے تھے تو ان کے دو مخالفوں نے ان

سے درخواست کی تھی کہ وہ ان سے اپنے حق میں بیٹھ جانے کے لیے کہیں، رسماً ہی سہی لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور ووٹنگ جاری رہی۔

اصفہانی نے لکھا ہے کہ 1946ء کے انتخابات میں کلکتے کی ایک اہم سیٹ کے لیے مخالف امیدوار نے زرضمانت لے کر بیٹھ جانے کی پیش کش کی۔ چند سو روپوں کی بات تھی۔ عبدالرحمٰن صدیقی اور اصفہانی دونوں پیسے دینے پر راضی تھے۔ قائداعظم نے سنا تو حکم دیا کہ انتخاب لڑا جائے اور مخالف امیدوار کی دستبرداری کو کسی قیمت پر نہ خریدا جائے۔ پیسوں کی نہیں اصول کی بات تھی۔ بعد کو انہوں نے اصفہانی سے کہا:

''بیٹا! سیاست میں دیانت داری کی اہمیت نجی زندگی سے بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ اگر تم سیاسی زندگی میں کسی غلطی کے مرتکب ہو گے تو بے شمار ایسے لوگوں کو نقصان پہنچاؤ گے جو تم پر انحصار کرتے ہیں۔''

اسی طرح کا ایک واقعہ جی الانہ نے بھی اپنی کتاب ''قائداعظم جناح'' میں لکھا ہے:

''1946ء میں سندھ میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات ہو رہے تھے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی ساری سیٹیں جیتنا چاہتی تھی اور یہ بہت اہم تھا۔ ایک سیٹ سے مسلم لیگ کے امیدوار قاضی اکبر کا مقابلہ جی ایم سید کر رہے تھے۔ قائداعظم بہت فکرمند تھے۔ انہوں نے جی الانہ سے کہا:

''بیٹا! ایک بات یاد رکھیے! اگرچہ انتخابات اہم ہیں۔ تاہم انہیں جیتنے کے لیے نامناسب طریقے اختیار نہ کیے جائیں۔ مثال کے طور پر آپ کو جی ایم سید کے حلقے میں مسلم لیگ کے نمائندے قاضی اکبر کو ہر قیمت پر کامیاب کرانا ہے لیکن ووٹروں کو کسی قسم کی رشوت نہیں دی جائے گی۔ یہ میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ ووٹ خریدنے کے لیے کسی ووٹر کو ایک روپیہ بھی دیا جائے۔ یہ بددیانتی اور بے ایمانی ہے۔ میں اس بے ایمانی کے مقابلے میں ہار جانے کو ترجیح دوں گا۔''

اس پر جی الانہ کا تبصرہ یہ ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کی عظمت کا ایک اہم عنصر تھا۔ انہیں یقین تھا کہ قیام پاکستان جیسے اعلیٰ مقصد کے حصول میں صرف اخلاقی طریقوں سے ہی کامیابی ہوسکتی ہے۔''

سیاست میں بھی اخلاقی اصولوں کو برتنے کا ایک واقعہ قدرت اللہ شہاب نے لکھا ہے:

''شہاب صاحب بحیثیت آئی سی ایس، اڑیسہ کے سی پی میں ایک کانگریسی وزیر کے سیکرٹری تھے۔ کانگریسی وزیر ان پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ ایک بار انہوں نے کانگریس ہائی کمان کا ایک انتہائی خفیہ مراسلہ جو مسلمانوں کے خلاف تھا ان کی تحویل میں دے دیا۔ شہاب صاحب کی قومی عصبیت نے انہیں مجبور کیا کہ دلی جا کر وہ دستاویز قائداعظم کو دکھائیں۔ قائداعظم نے کاغذات دیکھے، مسکرائے، شانہ تھپتھپایا اور پھر فرمایا:

''بحیثیت ایک مسلمان کے تم نے ایک ہندو کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر اچھا نہیں کیا۔''

یہ تھے قائداعظم، جس شخص نے پاکستان بنایا اس کی قدریں یہ تھیں اور یہ کردار تھا۔ ان کی ساری زندگی بڑائی کا ایک طویل دن تھی۔ وہ زندگی کے ہر دور میں، ہر مرحلے میں، ہر منزل میں بڑے رہے اور یہ بڑائی بنیادی طور پر کردار کی بڑائی تھی، وکالت میں، تحریر میں، تقریر میں، خلوص میں، قربانی میں... فرداً فرداً تو ضرور ان کے حریف موجود تھے لیکن سیاسی فراست، فیصلہ کی قوت ارادی کے عزم اور سب سے بڑھ کر اخلاقی جرأت اور دیانت میں ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔ ان کے اندر قیادت کی وہ صفات بعینہٖ موجود تھی جن کی مسلم قوم کو تاریخ کے اس موڑ پر ضرورت تھی۔ ایک بڑے آدمی کے بارے میں سب سے معتبر گواہی دوسرے بڑے آدمی کی گواہی ہوتی ہے۔ مئی 1937ء کے ایک خط میں اقبال نے قائداعظم کو لکھا۔

''مسلمانوں کو آپ کی قیادت کی ضرورت ہے۔ آپ ہی ان کی کشتی کی پتوار سنبھالیں۔''

؎ ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز



قائداعظم رحمہ اللہ کی شخصیت کا مطالعہ

قائداعظم رحمہ اللہ کی سیاسی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن میں سب سے پہلے یہ سوال اُبھرتا ہے کہ قائداعظم کو ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے اپنا قائداعظم کیسے تسلیم کرلیا، ان پر اتنا مکمل اعتماد کیسے کرلیا، جب کہ برصغیر کے رہنماؤں کی روایتی خصوصیات ان کے اندر نہیں تھیں۔ مثلاً وہ روایتی معنوں میں مذہبی آدمی نہیں تھے۔ عقیدتاً اسماعیلی خوجے تھے جو مسلمانوں کی اکثریت کا عقیدہ نہیں۔ مسلمانوں کی خصوصی زبان اردو ان کی زبان نہیں تھی۔ رہنا سہنا ان کا عام مسلمانوں سے مختلف تھا۔ مزاج کے اعتبار سے جذباتی وہ نہیں تھے۔ کم آمیز وہ تھے، پھر وہ اجتماعی امنگوں کا مرکز کیسے بنے؟

یہ سوال بہت اہمیت رکھتا ہے اس سے مسلمانوں کے معیار قیادت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ ایک کلیہ ہے کہ عام مسلمان خود لاکھ معیار سے کم تر ہوں لیکن دل سے وہ اسی راہنما کی قیادت کے قائل ہوں گے جو اپنی زندگی میں کھرا ہو۔ جس کا کردار بے داغ ہو، جو دولت کی ہوس سے اور نفس پرستی سے بلند ہو۔ جو کچھ سامان درویشی بھی رکھتا ہو یا امارت کی صورت میں جس کا دل غنی ہو۔ عامۃ المسلمین خلوص اور بے لوثی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ قائداعظم میں یہ بنیادی صفت موجود تھی۔ نہ انہیں خریدا جا سکتا تھا نہ جھکایا جا سکتا تھا۔ مسلمانوں کا ان پر یہ اعتماد ایک روز میں نہیں ہوا۔ 1896ء سے 1947ء تک ان کی پچاس سال کی نجی اور سیاسی زندگی ان کے سامنے تھی۔ ان کی وفاداری اور استواری کو ہر اعتبار سے مسلم قوم نے پرکھا اور برتا تھا۔

قائداعظم رحمہ اللہ پر اعتماد کے معنی یہ تھے کہ مسلمان تمام تر فرقہ وارانہ، علاقائی، نسلی اور لسانی عصبیتوں کے تنگ دائرے سے بلند ہو کر صرف اصول اور نظریاتی سطح پر سوچنا چاہتے

ہیں۔ قائداعظم رحمۃ اللہ کی ذات میں مسلمانوں نے ایسی قیادت کو قبول کیا جو تمام تعصّبات، ذاتی خواہشات، علاقائی وصوبائی یا فرقہ وارانہ ذہنیت سے بالاتھی اور یہ کوئی حیرت کی بات بھی نہیں تھی کیونکہ توحید پر ایمان رکھنے سے مسلمانوں کا لاشعوری رجحان تمام حد بندیوں سے اوپر اٹھنے کی طرف ہوتا ہے۔ پھر قائداعظم رحمۃ اللہ میں ایک اور ایسی صفت بھی تھی جو مسلمانوں کی تاریخ کے اس دور میں بے حد اہم ہو گئی تھی یعنی ان کا تدبر اور سیاسی شعور، مشکل فیصلے کرنے کی صلاحیت اور ان کو بروئے کار لانے کا حوصلہ اور ہمت۔ ان کا غیر جذباتی مزاج بھی اس مرحلے پر کام آیا۔ ان کا مقابلہ دو چالاک، شاطر لیکن تنگ نظر، تنگ دل اور تعصب سے لبریز دشمنوں سے تھا۔ وہ ان دونوں کے لیے دو دھاری تلوار بن گئے تھے اور اقبال سمیت برصغیر کے مسلمانوں کو یقین ہو گیا تھا کہ اس منجدھار میں وہ مسلمانوں کی کشتی کے پتوار سنبھال سکتے ہیں۔ یہ الفاظ بھی علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ ہی کے ہیں جو انہوں نے مئی 1947ء کے خط میں قائداعظم رحمۃ اللہ کو لکھے تھے۔ قیادت کے لیے صرف خلوص اور ایثار ہی کافی نہیں ہوتا۔ اخلاق کے ساتھ کردار اور کردار کے ساتھ ذہن کی جودت کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ قائداعظم رحمۃ اللہ ان صفات سے بھی متصف تھے۔

ہیکٹر بولیتھو کی لکھی ہوئی قائداعظم کی سوانح عمری نے ایک غلط فہمی یہ پھیلائی ہے کہ قائداعظم سرد اور سخت گیر تھے اور ان میں انکسار کی کمی تھی۔ ایک کرائے کا مصنف ایک قوم کے ہیرو کے ساتھ کیسے انصاف کر سکتا تھا۔ ہیکٹر بولیتھو ان سے متاثر تو کیا ہوتا وہ تو ان سے براہ راست واقف بھی نہیں تھا۔ بہرحال، اس نے اپنی کتاب سے جو تاثر دیا وہ وہی ہے جو قائداعظم اور پاکستان کے مخالف ہندو اور برطانوی حلقے دیتے رہے ہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ قائداعظم بحیثیت مجموعی سنجیدہ دل و دماغ کے حامل تھے۔ کم آمیز، دلیر آدمی، حساس لیکن غیر جذباتی، ان کے دل پر ان کے دماغ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ جذباتیت ان کے اندر بالکل نہیں تھی۔ بظاہر وہ سرد نظر آتے تھے لیکن یہ سرد مہری بھی بامقصد اور قوم کی خاطر تھی۔ اصفہانی نے ایک واقعہ لکھا کہ لیگ کونسل کے اجلاس کے دوران جب خواجہ ناظم الدین یکایک بیمار پڑ گئے تو وہ ان کو دیکھنے ہسپتال نہیں گئے۔ استفسار پر کہا۔

''اگر میں ایک رُکن کو دیکھنے گیا تو ہر رکن کو دیکھنے جاؤں گا، تو پھر قوم کا کام کب کروں گا۔''

حقیقت میں عیادت کے لیے نہ جانا بھی اصول کی بات تھی اور قوم کی خدمت کی بھی۔ ویسے اس موقع پر بھی ان کی فراست کام آئی۔ خواجہ صاحب کو دل کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ صرف بدہضمی کی شکایت ہوگئی تھی۔ دوسرے روز وہ بھلے چنگے تھے۔ جو لوگ انہیں دیکھنے گئے تھے انہوں نے بھی وقت ہی ضائع کیا تھا۔ اب اس طرح کے واقعات سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ بے حس یا ہمدردی کے جذبات سے عاری تھے، غلط ہوگا۔ بڑے آدمیوں کو عام جذبات کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ سچی محبت شرک کو پسند نہیں کرتی۔ قوم کی محبت اور اصولوں کی محبت کے راستے میں ان کی بیوی اور بیٹی کی محبت حائل نہ ہوسکی۔

تحریک پاکستان کے زمانے سے پاکستان دشمن عناصر بانی پاکستان کے خلاف جو پروپیگنڈہ کرتے رہے ان میں سے ایک اعتراض یہ ہے کہ ان میں انانیت بہت تھی۔ عام لوگوں سے دور رہتے تھے اور شعائر اسلام سے بھی ان کی دلچسپی کم تھی۔

ان تینوں اعتراضوں کا جواب اس واقعہ میں ہے جو قائداعظم کے ایک معتمد کارکن، نیشنل بینک آف پاکستان کے منیجنگ ڈائریکٹر اور ممتاز دانشور ممتاز حسن نے دسمبر 1954ء کے ماہ نو میں بیان کی۔ وہ کہتے ہیں:

''عام غریب مسلمان جناح کو کیا سمجھتے تھے؟ مجھے اس کا اندازہ، 1946ء میں ہوا۔ جب جناح لندن کے مشرقی حصے کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز کے لیے تشریف لے گئے۔ لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی صفیں خالی کر دیں تاکہ وہ سب سے اگلی صف میں بیٹھ سکیں۔ لیکن خود انہوں نے آخری صف میں بیٹھنا پسند فرمایا اور کہا کہ میں دیر سے آیا ہوں کسی اور جگہ کا مستحق نہیں۔ نماز ختم ہوئی تو چھوٹے چھوٹے بچوں نے انہیں گھیر لیا۔ وہ قائداعظم کو قریب سے دیکھنا اور ان سے ہاتھ ملانا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایسے بھی تھے جو اپنی چھوٹی چھوٹی کاپیوں میں ان کے دستخط لینا چاہتے تھے۔ اس کے بعد ہر نمازی نے ان سے مصافحہ کیا۔ یہ خلوص اور عقیدت کا ایک بے مثال مظاہرہ تھا۔ ایک شخص پر رقت طاری ہوگئی اور اس نے دُعا مانگی کہ

''اے خدا! میری زندگی محمد علی جناح کو بخش دے۔ یہ سارے کا سارا مجمع غریب مسلمانوں کا تھا۔ کوئی ملاح تھا، کوئی چھوٹا دکاندار، کوئی خوانچہ فروش۔ قائداعظم کا ارشاد تھا کہ میں کسی ایسی مسجد میں جانا چاہتا ہوں جو کسی فرقے سے خاص نہ ہو اور جس میں غریب مسلمان

نماز پڑھتے ہوں۔‘‘

اس واقعہ سے جو اپنی نوعیت کا تنہا نہیں، انکسار، غریبوں سے محبت، بے تعصبی اور شعائر اسلام سے محبت ظاہر کرتی ہے۔ ان کے ڈرائیور فقیر محمد خان کا بیان ہے کہ ان کے ذاتی خدمت گار نے اسے بتایا کہ اکثر رات گئے صاحب نماز کے لیے سجدے میں ہوتے تھے۔

قائداعظم رحمہ اللہ کی ظاہری سرد مہری اور سخت گیری بھی بے وجہ نہیں تھی۔ انسان ایک وقت میں ایک ہی چیز سے محبت کر سکتا ہے۔ عام لوگ اپنی اور اپنوں کی ذات میں دلچسپی رکھتے ہیں اور ان سے جذباتی محبت کا اظہار کرتے ہیں لیکن کچھ غیر معمولی عظیم لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی اور دوسروں کی ذات سے وابستگی سے بلند ہو کر کسی عظیم نصب العین یا مقصد سے اپنی تمام دلچسپی، تمام جذباتی اور ذہنی زندگی مربوط کر دیتے ہیں۔ ان کی محبت، ان کی نفرت، ان کا جینا، ان کا مرنا اسی مقصد کے حوالے سے ہوتا ہے۔ ان کی توجہ کا مکمل ارتکاز ایک نقطے پر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے سطحی نظر کو وہ غیر جذباتی نظر آتے ہیں۔ قائداعظم کی تمام جذباتی ذہنی قوتیں ان کے قومی مشن میں اس طرح جذب ہو گئی تھیں کہ ان کے ذاتی احساسات اور جذبات نے ثانوی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اصولوں سے انحراف تو وہ نہ بیوی کی چاہت کے لیے کر سکتے تھے نہ بیٹی کی محبت کے لیے۔ دوسرے تو دور کی بات ہوتے ہیں۔

بنیادی طور پر وہ حساس اور ہمدرد تھے۔ 1948-49ء میں قائداعظم کے اسسٹنٹ سیکرٹری فرخ امین نے ان کے حساس اور انتہائی رحم دل ہونے کے بارے میں کئی واقعے نوٹ کیے ہیں۔ پریشانی کے ایسے موقعوں پر جب دوسرے اعصابیت کا شکار ہو جاتے ہیں، وہ ظاہری سکون اور توازن کو قائم رکھتے تھے۔ تقسیم کے بعد مہاجروں کے شدید آلام اور مصائب سے وہ اندرونی طور پر بے حد متاثر تھے۔ فرخ امین نے لکھا ہے کہ

’’میں نے ان دنوں انہیں رات کی خاموشیوں میں سونے کے کمرے میں اضطراب کی حالت میں ٹہلتے دیکھا۔‘‘

قائداعظم کی شخصیت کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ غم و فکر، محبت اور ہمدردی کے جذبات کا برملا اظہار کبھی نہیں کرتے تھے۔ منافقت ان میں نام کو بھی نہیں تھی۔ وہ ان معاملات میں گھر گئے تھے جہاں منافقت کو مصلحت کا نام دیا جا سکتا تھا۔ ممتاز حسن نے لکھا ہے کہ

’’جب تقسیم سے ذرا پہلے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھنے لگی اور ہندو سکھوں نے بھاری

مقدار میں اسلحہ جمع کرنا شروع کر دیا تو بعض لوگوں نے قائداعظم سے درخواست کی کہ مسلمانوں کو بھی مقابلے کے لیے ہتھیار اکٹھے کرنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ قائداعظم یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے کہ کیا تم لوگ مجھے منافق سمجھتے ہو کہ ایک طرف تو صلح کی اپیل کروں اور دوسری طرف تمہارے لیے ہتھیاروں کا بندوبست کروں۔ میں ہرگز کسی ایسی تحریک کی حمایت نہیں کرسکتا۔ خواہ وہ مسلمانوں کی طرف سے ہو یا غیر مسلموں کی طرف سے۔''

اس بے لاگ دیانت داری کا نتیجہ تھا کہ جائز سیاسی مقاصد کے لیے بھی وہ کسی کو پیسے دے کر اپنے ساتھ ملانے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ خواہ اس میں کتنا ہی بڑا سیاسی فائدہ مضمر ہو۔ ممتاز حسن ہی راوی ہیں کہ

''1937ء میں مسلم لیگ میں موثر سیاسی کارکنوں کی سخت کمی محسوس کرتے ہوئے شملہ مسلم لیگ کے ایک رکن نے بڑی دوڑ دھوپ کر کے ایک کانگریسی مسلمان ورکر کو توڑ کر مسلم لیگ کے لیے کام کرنے کو آمادہ کیا۔ وہ بہت اچھا مقرر بھی تھا۔ اس سے مسلم لیگ کو بہت فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اس نے معاوضے میں صرف سو روپے ماہانہ طلب کیے۔ پوری صورت بتانے کے بعد قائداعظم کی اجازت طلب کی گئی۔ قائداعظم نے دوٹوک جواب دیا، دیکھو! تمہاری تجویز کو میں اس لیے منظور نہیں کرسکتا کہ یہ مسلمانوں کا اپنا کام ہے اور اسے کرنے کے لیے کسی مسلمان کو کوئی رشوت دینا میرے نزدیک قطعاً ناجائز ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم ایک غریب قوم ہیں۔ اگر ہم یہ رقم دے بھی دیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہم سے زیادہ مالدار قوم اس سے زیادہ رقم دے کر اسے نہیں خرید لے گی۔''

اس مثال سے ان کی دیانت ہی نہیں، فراست اور اصول پرستی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ قائداعظم رحمۃ اللہ نے یہ بھی بتا دیا کہ پاکستانی سیاسیات کا اصل اصول کیا ہونا چاہیے۔

بعض اوقات انسان کی بڑائی کا اندازہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے ہوتا ہے۔ ابوالحسن اصفہانی نے اپنی کتاب ''قائداعظم میری نظر میں'' میں لکھا ہے کہ جب ان کے گھر کلکتہ میں ٹھہرے تو غیر ضروری بتیوں کو گل کر دیتے تھے اور ایسا کئی بار ہوا۔ اصفہانی نے کہا:

''آپ یہ زحمت کیوں کرتے ہیں؟''

تو ان کا جواب تھا۔ روپے کو ضائع کرنا گناہ ہے اور اگر روپیہ عوام کا ہو تو اور بھی بڑا گناہ ہے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ ایوان صدر میں اکثر غیر ضروری روشنیوں کو گل کرتے

دیکھے گئے۔

اصفہانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

''تحریک پاکستان کے سلسلے میں جو منی آرڈر آتے تھے ان کی دو آنے، چار آنے والی رسیدوں پر بھی وہ خود دستخط کرتے تھے۔ نیاز مندوں کے عرض کرنے پر کہ یہ خدمت کسی اور کے سپرد کی جائے چونکہ اس میں ان کا قیمتی وقت صرف ہوتا ہے، انہوں نے جواب دیا بات رقم کی مقدار کی نہیں، جذبے اور اصول کی ہے۔ جتنا جس کے پاس ہے وہ پاکستان کے لیے دے رہا ہے۔ میں خود دستخط کر کے اس کے جذبے کی قدر کرنا چاہتا ہوں اور اس کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس کا پیسہ پیسہ میرے علم میں ہے اور محفوظ ہے۔''

وہ قومی پیسے کے بارے میں غیر معمولی طور پر محتاط تھے۔ جو کارکن پیسے کا حساب رکھنے میں کوتاہی کرتا یا لاپرواہی سے صرف کرتا خواہ اس طرح نقصان زیادہ نہ بھی ہوا ہو پھر وہ اس پر کسی اور معاملے میں بھی اعتبار نہیں کرتے تھے۔

قائداعظم کسی کو خوش کرنے کے لیے خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہوتا یا محض عوام کو متاثر کرنے کے لیے نہ کچھ کہہ سکتے تھے اور نہ کر سکتے تھے۔ ان کی دوستی برملا ہوتی اور اصول کی خاطر ہوتی تھی۔

ان کی سخت گیری ان کی انتہائی دیانت کا ایک ظاہری پہلو تھا۔

جب کبھی ان کی دیانت داری کی تعریف کی جاتی تھی وہ کہتے تھے میرے نزدیک یہ بالکل فطری بات ہے۔ اصفہانی نے لکھا ہے کہ ان کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ ان کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہ تھا۔ کھانا، آرام، نیند، سب کو اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

دور سے وہ ضرورت سے زیادہ حقیقت پسند نظر آتے تھے۔ جذبات کے لیے ان کے پاس زیادہ وقت نہ تھا۔ اصل میں ان کی حالت اس جان باز سپاہی کی سی تھی جس کو میدان جنگ میں لڑنے کے سوا نہ کسی چیز کا ہوش ہوتا ہے نہ ضرورت ہوتی ہے۔ قائداعظم رحمہ اللہ پر علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

؎ نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز

کردارِ قائداعظم رحمۃ اللہ کی جھلکیاں

خود دار وکیل

قائداعظم کلکتہ میں مرزا اصفہانی کے یہاں مقیم تھے اور اس روز وہ خاص طور پرخوش تھے۔ کیونکہ انہیں بنگال کی یونائیٹڈ مسلم پارٹی کو اس امر پر راضی کرنے میں کامیابی حاصل ہوگئی تھی کہ وہ کل ہند مسلم لیگ میں ضم ہو جائے۔ اس طرح راتوں رات مسلم لیگ سب سے بڑی اور سب سے زیادہ فعال جماعت بن گئی تھی۔ یہ بہت بڑی سیاسی کامیابی تھی۔ قائداعظم اپنے بارے میں عموماً بہت کم گفتگو کیا کرتے تھے لیکن اس روز اصفہانی کے مکان کے جنوبی برآمدے میں بیٹھے وہ بہت مسرور نظر آ رہے تھے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے۔

قائداعظم: اصفہانی! انسان کو کامیاب لمحوں میں ناکام لمحے ضرور یاد آتے ہیں۔ آج اللہ نے مجھے سب کچھ دیا ہے اور بحیثیت وکیل میں نے اتنا کچھ پایا ہے لیکن میری وکالت کا ابتدائی زمانہ بڑی سختی کا تھا۔ ہر روز میں اپنے چیمبر میں جا کر بیٹھتا تھا اور اس انتظار میں صبح سے شام کر دیتا تھا کہ شاید کوئی مقدمہ ملے لیکن نہیں ملتا تھا۔ میں اتنا نووارد اور کم عمر تھا کہ بمبئی ایسے شہر میں جہاں بڑے بڑے تجربہ کار اور مشہور وکیلوں کی ریل پیل تھی، میری طرف کوئی توجہ نہ دیتا تھا۔ میری طرح کے نئے وکیلوں کو عموماً کسی نہ کسی بڑے وکیل کی سرپرستی حاصل تھی۔ بڑے وکیل اپنے رشتہ داروں اور واقف کاروں کو مؤکلوں سے متعارف کرا دیتے تھے لیکن مجھے یہ آسانی بھی میسر نہیں تھی اور میں نے مقدموں کو خریدنا بھی پسند نہیں کیا۔

اصفہانی: مقدمے خریدنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟
قائداعظم: جیسا کہ آپ کو معلوم ہو گا، مقدموں کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے۔ میرے پاس بھی دلال آتے رہتے تھے اور پیش کش کرتے کہ وہ مجھے مقررہ کمیشن پر چھوٹے موٹے مقدمے دلا سکتے ہیں۔ اگرچہ میری شدید خواہش تھی کہ میں کسی نہ کسی طرح کام شروع کر دوں اور کچھ کمانے لگوں۔ خواہ وہ کم ہی کیوں نہ ہو لیکن میرے ضمیر نے گوارہ نہ کیا کہ میں دلالوں سے کمیشن پر مقدمے لوں۔ چنانچہ ایک روز میں نے ایک دلال سے، جو بہت پیچھے پڑا ہوا تھا، صاف کہہ دیا:
''مسٹر! میں بھوک سے مر جانا پسند کروں گا لیکن دلالی پر مقدمے ہرگز نہ لوں گا۔''
خدا گواہ ہے، میں بہت پریشان تھا۔ وہ دن معاشی اعتبار سے میری زندگی کے مشکل ترین دن تھے۔ لیکن میرے لیے وہ کام کرنا مشکل تھا جس کو میں جائز نہیں سمجھتا تھا۔ خدا عزم راسخ کا صلہ ضرور دیتا ہے۔ شکر ہے کہ کچھ دنوں بعد بمبئی کے سرکاری وکیل میکفرسن نے مجھے کاغذات پڑھنے کی اجازت دے دی اور مجھے انہی کے توسط سے پریذیڈنسی مجسٹریٹی کی عارضی اسامی پر کام کرنے کا موقع مل گیا۔ اس دن سے گویا میرے دن پھر گئے۔ بعد کو مجھے یہ اسامی ایک معقول مشاہرے پر مستقل طور پر پیش کی گئی۔ لیکن جو راستہ میں نے منتخب کر رکھا تھا اس کی راہ میں میں نے اس ترغیب کو حائل نہیں ہونے دیا۔''

(یہ مکالمہ ایم اے اصفہانی کی کتاب ''قائداعظم رحمہ اللہ میری نظر میں'' سے ماخوذ ہے)۔

حوصلے اور عزم کی داستان

نوجوان بیرسٹر محمد علی جناح بمبئی پریذیڈنسی مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ یہ اسامی عارضی تھی۔ جو مستقل مجسٹریٹ ہوشنگ دستور کے چھٹی جانے پر خالی ہوئی تھی۔ تین ماہ کے بعد مزید تین مہینے انہیں اس جگہ پر کام کرنے کا موقعہ ملا۔ بحیثیت مجسٹریٹ کے جناح کی کارکردگی اتنی اچھی تھی کہ چیف مجسٹریٹ سر چارلس اولیونٹ نے ایک ملاقات میں ان سے کہا:
اولیونٹ: مسٹر جناح! پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی حیثیت سے آپ کی کارکردگی بہت ہی قابل قدر

رہی ہے۔اس کے لیے مبارک باد قبول کیجیے۔

جناح: سراولیونٹ! قدر افزائی کا شکریہ۔

اولیونٹ: جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، یہ اسامی عارضی تھی۔ جلد ہی یہ جگہ مستقل طور پر خالی ہونے والی ہے۔کیا آپ اس اسامی کو قبول کرنا پسند کریں گے؟

جناح: شکریہ! مجھے مزید اس نوکری میں دلچسپی نہیں۔

اولیونٹ: بمبئی کے تمام قانونی حلقوں میں آپ کی قانون دانی اور قوت فیصلہ کی شہرت ہے۔ آپ کے پہلے تقرر پر میکفرسن نے آپ کی سفارش کی تھی۔آج میں خود آپ کے تقرر کی سفارش کرنا چاہتا ہوں۔

جناح: میں اس عزت افزائی کے لیے آپ کا مزید ممنون ہوں لیکن جیسا کہ میں نے کہا، اس نوکری میں میری مزید دلچسپی نہیں۔اس ملازمت سے جو تجربہ اور معاشی استحکام میں حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ حاصل کر چکا ہوں۔

اولیونٹ: مسٹر جناح! سوچ لیجیے۔ جذبات کی رو میں بہہ کر فیصلہ کرنا درست نہیں۔

جناح: سراولیونٹ! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جذباتی فیصلے کرنا میری عادت ہی نہیں۔ میں نے بہت سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔

اولیونٹ: مسٹر جناح! اس آسامی کی تنخواہ پندرہ سو روپے ماہوار تک جاتی ہے۔

جناح: آپ کی عنایات کا بے حد شکریہ! لیکن میں یہ عرض کروں کہ ان شاء اللہ میری آمدنی پندرہ سو روپے روز ہو گی۔

(کچھ عرصے کے بعد ایک کلب میں سراولیونٹ مسٹر جناح سے دوبارہ ملے)۔

اولیونٹ: ہیلو۔مسٹر جناح! آپ کیسے ہیں؟

جناح: شکریہ۔خیریت سے ہوں۔

اولیونٹ: آپ کی پریکٹس کا کیا حال ہے؟

جناح: اللہ کا شکر ہے کہ ان دنوں میری آمدن دو ہزار روپیہ ماہوار سے زیادہ ہے۔

اولیونٹ: آپ نے اچھا کیا، میری تجویز نامنظور کر دی تھی۔آپ بڑے باصلاحیت اور پُرعزم ہیں۔

آخری صف میں جگہ

1946ء میں جب قائداعظم سیاسی مذاکرات کے لیے لندن گئے تو دوران قیام جمعہ آ گیا۔ انہوں نے اپنے سیکرٹری سے کہا:

''میں کسی ایسی مسجد میں جمعہ کی نماز کے لیے جانا چاہتا ہوں، جو کسی خاص فرقے سے متعلق نہ ہو اور جس میں غریب مسلمان نماز پڑھتے ہوں۔''

چنانچہ جب قائداعظم مشرقی لندن کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز کے لیے پہنچے تو خطبہ شروع ہو چکا تھا۔ لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی صفیں خالی کر دیں تاکہ وہ سب سے اگلی صف میں بیٹھ سکیں لیکن خود انہوں نے آخری صف میں بیٹھنا پسند کیا۔

''آپ آگے تشریف لائیے .... آگے آئیے۔''

''میں یہیں ٹھیک ہوں۔ میں دیر سے آیا ہوں کسی اور جگہ کا مستحق نہیں۔''

اس واقعہ کے عینی شاہد ممتاز حسن مرحوم نے ماہ نو 54ء کے شمارے میں مزید لکھا ہے کہ نماز ختم ہوئی تو چھوٹے چھوٹے بچوں نے انہیں گھیر لیا۔ وہ قائداعظم کو قریب سے دیکھنا اور ہاتھ ملانا چاہتے تھے۔ بچوں کے بعد ہر نمازی نے ان سے مصافحہ کیا۔ مصافحہ کرتے ہوئے ایک بوڑھا شخص رونے لگا اور کہنے لگا:

''اے خدا! میری زندگی محمد علی جناح کو بخش دے۔''

یہ سارا اجتماع غریب مسلمانوں کا تھا۔ کوئی ملاح تھا، کوئی مزدور تو کوئی بس کنڈیکٹر، اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ممتاز حسن لکھتے ہیں:

''اس واقعہ سے، جو اپنی نوعیت کا تنہا نہیں، مجھے اندازہ ہوا کہ غریبوں سے انہیں کتنا تعلق ہے۔ فرقہ بندی سے وہ کتنے بلند ہیں۔ شعائر اسلام سے انہیں کتنی محبت ہے۔ قائداعظم کی عظمت کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے انہیں بہت قریب سے اور مختلف مقامات پر دیکھا ہو۔''

یہ تو اعتماد شکنی ہوئی

یہ واقعہ مارچ 1947ء کا ہے۔ قدرت اللہ شہاب آئی سی ایس ہندوستان کے صوبہ

اڑیسہ کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری کے منصب پر فائز تھے۔ یہ محکمہ صوبہ کے چیف منسٹر ہری کرشن مہتاب کے چارج میں تھا۔ وہ قدرت اللہ شہاب پر بہت اعتماد کرتے تھے اور اکثر اپنے سرکاری اور سیاسی کاغذات ان کی تحویل میں دے دیتے تھے۔ ہری کرشن مہتاب آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ ایک بار وہ دہلی میں کسی میٹنگ سے واپس آئے تو جو کاغذات انہوں نے قدرت اللہ شہاب صاحب کے حوالے کیے ان میں ایک انتہائی خفیہ مراسلہ بھی تھا جو کانگریسی ہائی کمان کی طرف سے کانگریسی چیف منسٹروں کے نام اس ہدایت کے ساتھ جاری کیا گیا تھا کہ ہر چیف منسٹر اسے اپنی ذاتی تحویل میں رکھے۔ اس میں لکھا تھا کہ

"تقسیم ہند کا معاملہ تقریباً طے پا چکا ہے۔ اس لیے جن صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہیں وہاں پر مسلمان افسروں کو کلیدی عہدوں سے تبدیل کر دیا جائے۔ ڈی سی، آئی جی اور ایس پی عموماً ہندو ہوں۔ تھانوں کے انچارج بھی زیادہ سے زیادہ ہندو ہی ہوں۔ محکمہ پولیس اور ضلعی انتظامیہ میں مسلمانوں کو فیلڈ ورک سے ہٹا کر بے ضرر قسم کے دفتری کاموں میں لگا دیا جائے۔ پولیس کی نفری میں مسلمان سپاہیوں کو بتدریج غیر مسلح کر کے پولیس لائن اور تھانوں میں معمولی فرائض پر مامور کیا جائے۔ جن صوبوں میں سرحدی مسلمانوں سے بھرتی شدہ ملٹری پولیس ہے اسے فوراً توڑ دیا جائے۔"

وغیرہ......!!

ان ہدایات سے ظاہر ہوتا تھا کہ کانگریسی حکومتیں مسلمانوں کے خلاف بڑے خطرناک منصوبے بنانے میں مصروف ہیں۔ چنانچہ قدرت اللہ شہاب نے وہ دستاویز جیب میں ڈالی اور دہلی جا کر اسے قائداعظم کی خدمت میں پیش کر دیا۔

قائداعظم: (دستاویز پڑھ کر) ہاں، یہ دستاویز ہمارے لیے مفید ہو سکتی ہیں لیکن یہ تم نے کہاں سے حاصل کی ہیں؟

قدرت اللہ: میں اڑیسہ کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری ہوں۔ اس محکمہ کے سربراہ چیف منسٹر ہری کرشن مہتاب مجھ پر کافی اعتماد کرتے ہیں اور اکثر اپنے سیاسی اور غیر سیاسی کاغذات میری تحویل میں دے دیتے ہیں۔ یہ دستاویز انہوں نے ہی میرے حوالے کی تھیں۔

قائداعظم: ویل، ویل، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ تو اعتماد شکنی ہوئی۔

قدرت اللہ: جناب! فرائض منصبی اپنی جگہ، میں نے اپنا قومی فرض پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

قائداعظم: تم دیکھتے نہیں، ہر کاپی پر نمبر لگا ہوا ہے۔ اس کی گمشدگی کا آسانی سے پتا لگایا جا سکتا ہے۔ کیا تم ایسا کرنے کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو؟

قدرت اللہ! جی جناب! میں پوری طرح تیار ہوں۔

قائداعظم: (دستاویز اپنے پاس رکھتے ہوئے) آل رائٹ، اب تم جا سکتے ہو۔

جب قدرت اللہ شہاب واپس مڑ کر دروازے کے قریب پہنچے تو قائداعظم نے بلند آواز سے پکار کر کہا:

''نوجوان! آئندہ ایسا نہ کرنا۔''

(یہ واقعہ قدرت اللہ شہاب کی ایک قلمی تحریر سے لفظ بہ لفظ نقل کیا گیا ہے)۔

سیاست میں بھی اصولوں کی برتری

سیاست میں بھی اصول کی برتری قائم رکھنا قائداعظم ہی کا کام تھا۔ 1946ء کے اوائل کا ذکر ہے کہ بنگال میں قائداعظم کے خاص رفیق کار مرزا ابوالحسن اصفہانی کلکتے کی ایک سیٹ کے لیے مسلم لیگی امیدوار تھے اور خیال تھا کہ وہ بلا مقابلہ منتخب ہو جائیں گے۔ عین وقت پر ایک حریف نے کاغذات نامزدگی داخل کر دیے اور ترغیب اور دباؤ کے باوجود اس نے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا۔ اصفہانی کے قریبی دوست اور ایک ممتاز مسلم لیگی سیاست دان عبدالرحمٰن صدیقی نے بڑی کاوشوں سے اسے شیشے میں اتارا اور اسے نام واپس لینے پر آمادہ کر لیا۔ یہ اچھی خبر لے کر صدیقی، اصفہانی کے یہاں پہنچے اس زمانے میں قائداعظم بھی اصفہانی کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے ہی یہ گفتگو ہوئی:

صدیقی: اصفہانی! مبارک ہو۔ بالآخر بات بن گئی۔ وہ شخص اپنا نام واپس لینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ بڑے طویل مذاکرات کرنے پڑے۔

اصفہانی: خدا کا شکر ہے کہ یہ مرحلہ طے ہوا۔

صدیقی: لیکن اس کی ایک معمولی سی شرط ہے۔ وہ یہ کہ تم ڈھائی سو روپے زرضمانت اس کو دے دو جو اس نے نامزدگی کے کاغذات داخل کرتے وقت جمع کرایا تھا۔

قائداعظم: صدیقی! براہ کرم ذرا دہرائیے کہ آپ نے کیا کہا۔ میں نے ٹھیک طرح نہیں سنا۔

صدیقی: میں نے عرض کیا تھا کہ اصفہانی کا مدمقابل الیکشن سے اپنا نام واپس لینے کے لیے تیار ہو گیا ہے لیکن وہ اڑھائی سو روپے مانگتا ہے جو اس نے زرضمانت کے طور پر خزانے میں جمع کرائے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اگر ہم یہ روپیہ دے دیں تو جان چھوٹ جائے گی۔

قائداعظم: (تیزی سے) روپیہ دے دیں؟ کسی امیدوار کو نام واپس لینے کے لیے بالواسطہ رشوت دی جائے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ اس سے فوراً کہہ دو کہ اس کی یہ پیش کش رد کی جاتی ہے۔ اصفہانی انتخاب لڑیں گے۔ ایسا بھی کیا ہے۔

صدیقی: بہت بہتر جناب! میں ابھی جاتا ہوں۔

قائداعظم: بیٹا! آدمی یہی جواب دے سکتا ہے۔ سیاست میں اخلاقی استواری نجی زندگی کی نسبت زیادہ اہم ہے۔ اگر تم سیاسی معاملات میں کسی غلطی کے مرتکب ہو گے تو تم بہت سے ایسے لوگوں کو نقصان پہنچاؤ گے جو تم پر اعتماد کرتے ہیں۔

بددیانتی سے بہتر ہار جانا ہے

جنگ، محبت اور سیاست میں لوگ سب کچھ جائز سمجھتے ہیں لیکن قائداعظم کا کردار مختلف تھا۔ وہ سیاست میں بھی دیانت داری کو مقدم سمجھتے تھے اور اس اصول پر سختی سے عمل پیرا تھے۔ 1946ء کے انتخابات سر پر تھے۔ یہ انتخابات پاکستان کے لیے ریفرنڈم کی حیثیت رکھتے تھے۔ سندھ اسمبلی میں مسلمانوں کی 35 نشستیں تھیں۔ قائداعظم نے لیگ کے امیدواروں کی مدد کے لیے سات ممبروں کی ایک انتخابی کمیٹی مقرر کی اور جی الانہ کو اس کا سیکرٹری مقرر کیا۔ اس کے چیئرمین یوسف ہارون تھے۔ قائداعظم نے جی الانہ کو انتخابی مہم کے لیے کثیر رقم دی اور اراکین پر اس انتخاب کی اہمیت واضح کر کے خود دوسرے صوبوں میں انتخابی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے تشریف لے گئے۔ پولنگ سے تقریباً چار ہفتے پہلے قائداعظم کراچی تشریف لائے اور جی الانہ سے یہ گفتگو ہوئی:

قائداعظم: حصول پاکستان کی جدوجہد میں سندھ ایک اہم صوبہ ہے۔ اس صوبے میں مسلم لیگ کو مسلمانوں کی پینتیس کی پینتیس نشستیں حاصل کرنی چاہئیں تاکہ یہاں لیگی

وزارت بنائی جا سکے۔ الانہ! میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تم مجھے صحیح صورت حال سے آگاہ کرو۔ صوبہ کی انتخابی مہم کیسی چل رہی ہے؟

جی الانہ: جناب! میں آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق شاید ہم 35 میں سے 5 نشستیں نہ جیت سکیں۔

قائداعظم: سندھ اسمبلی میں کل 60 نشستیں ہیں۔ اگر ہم 35 نشستوں میں سے 5 نہ جیت سکے تو وزارت کس طرح بنا سکیں گے۔ یہ صورت حال تو بہت تشویشناک ہے۔

جی الانہ: انتخابی کمیٹی کو بھی یہی پریشانی ہے۔

قائداعظم: لیکن یہ پانچ نشستیں کون سی ہیں اور ان کو حاصل نہ کر سکنے کے کیا اسباب ہیں؟

جی الانہ: ہمارے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ روپے کی کمی ہے۔ سندھ کے ہندوؤں کے ہاتھ میں موٹر ٹرانسپورٹ اور پٹرول سٹیشن ہیں۔ جب تک ہم لیگ کے امیدواروں کے لیے پٹرول اور گاڑیاں مہیا نہ کریں ان کی کامیابی غیر یقینی رہے گی۔

قائداعظم: تمہیں اور کتنی رقم درکار ہے؟

جی الانہ: ہمیں کم از کم مزید ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔

قائداعظم: میرے پاس جو روپیہ ہے وہ میرا ذاتی نہیں بلکہ مسلمانوں کی امانت ہے۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ ہر روپے پر ہمیں سولہ آنے فائدہ ہو۔

جی الانہ: جی!!

قائداعظم: میں سودے بازی نہیں کر رہا ہوں۔ مزید پچاس ہزار لیجیے اور مجھے یقین دلا دیجیے کہ ہم تمام 35 نشستیں جیت لیں گے۔

جی الانہ: ہم ہر ممکن کوشش کریں گے اور ان شاء اللہ تمام نشستیں حاصل کر کے رہیں گے۔

قائداعظم: ہاں! ان مشکل نشستوں میں لیگ کے مقابل کون کون کھڑا ہو رہا ہے؟

جی الانہ: ان میں سے ایک نشست پر جی ایم سید سے مقابلہ ہے۔

قائداعظم: جی ایم سید؟

جی الانہ: جی ہاں!

قائداعظم: یہی ایک انتہائی نازک انتخاب ہے۔ لیگ کو مسلمانوں کی تمام نشستیں جیتنی چاہئیں۔

خاص طور پر سید کی نشست تو ہمیں بہر قیمت حاصل کرنی ہے۔ آخر اس حلقہ میں ہماری کامیابی کی راہ میں کیا مشکلات ہیں؟

جی الانہ: جی ایم سید اپنے ضلع کے انتہائی بااثر شخص ہیں۔ وہ ضلع دادو کے پیر ہیں اور ان کے مریدوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ ہم نے ان کے مقابل ضلع حیدر آباد کے قاضی اکبر کو کھڑا کیا ہے۔ جی ایم سید کے حامی اس سے فائدہ اٹھا کر لوگوں سے کہتے پھر رہے ہیں کہ قاضی محمد اکبر باہر کے آدمی ہیں۔

قائداعظم: میں جی ایم سید کی نشست کو انتہائی اہم سمجھتا ہوں۔ بہرصورت یہ نشست حاصل کرنی ہے۔ اس حلقہ میں لٹریچر کی بارش کر دو، ورکروں کی فوج بھیج دو، جلسے کرو اور قاضی اکبر کو ٹرانسپورٹ کے سلسلے میں ہر قسم کی امداد دو۔

جی الانہ: بہت بہتر۔

قائداعظم: الانہ! تم اپنا ہیڈ کوارٹر کراچی سے حیدر آباد منتقل کر دو تاکہ جی ایم سید کے انتخابی حلقے سے قریب رہ سکو۔ میں بہت جلد کل ہند اہمیت کے چند لیڈر اور علی گڑھ سے طالب علم رضا کار بھیجوں گا۔

جی الانہ: شکریہ...... خدا حافظ!

(جی الانہ کمرہ سے باہر جانے کے لیے مڑتے ہیں کہ قائداعظم دوبارہ طلب فرماتے ہیں۔ اپنے قریب کی کرسی پر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے)

قائداعظم: ایک بات یاد رکھیے! اگرچہ یہ انتخابات اہم ہیں۔ تاہم اس میں جیتنے کے لیے نامناسب طریقے اختیار نہ کیے جائیں۔ مثال کے طور پر آپ کو جی ایم سید کے حلقے میں مسلم لیگ کے نمائندے قاضی اکبر کو بہر قیمت کامیاب کرانا ہے لیکن ووٹروں کو کسی قسم کی رشوت نہیں دی جائے گی۔ میں یہ ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ ووٹ خریدنے کے لیے کسی ووٹر کو ایک روپیہ بھی دیا جائے۔ یہ بددیانتی اور بے ایمانی ہے۔ میں اس بے ایمانی کے مقابلہ میں ہار جانے کو ترجیح دوں گا۔

اس واقعہ کے راوی جی الانہ لکھتے ہیں:

''ان کا خیال تھا کہ قیام پاکستان جیسے اعلیٰ مقصد کے حصول میں صرف اخلاقی طریقوں ہی کو بروئے کار لانا چاہیے۔''

کرائے کے کارکن بھی نہیں

1937ء میں جب قائداعظم نے مسلم لیگ کی از سرنو تعمیر شروع کی اور اسے ایک تحریک کے طور پر ملک کے طول وعرض میں پھیلانا شروع کیا تو ہر جگہ باشعور مسلمانوں نے ان کے ساتھ تعاون کیا لیکن شروع میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ایسے منجھے ہوئے سیاسی کارکن تو اور بھی کم تھے جو اچھے مقرر ہوں اور عوام میں کام کر سکیں۔ یہی صورت حال 1937ء میں شملہ میں تھی۔ وہاں کے ایک دردمند مسلمان پیرزادہ محمد ذکاء اللہ نے مسلم لیگ کے لیے پُر جوش طریقے سے کام شروع کیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ عوام میں سیاسی کام کرنے کے لیے مسلم لیگ کے ساتھ دو ایک عوامی مقرر بھی ہونے چاہئیں۔ چنانچہ بڑی تگ و دو کے بعد انہوں نے ایک ایسے مسلمان کانگریسی ورکر کو مسلم لیگ کے لیے کام کرنے پر راضی کیا اور رسمی اجازت لینے کے لیے قائداعظم کی خدمت میں باریاب ہوئے۔

ذکاء اللہ: ہمیں شملہ میں مسلم لیگ کی تحریک کو عوام میں مقبول بنانے کے لیے ایک تجربہ کار سیاسی کارکن اور خوش بیان مقرر کی اشد ضرورت تھی۔ بڑی مشکل کے بعد ہم ایک ایسے شخص کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

قائداعظم: یہ تو اچھی خبر ہے۔

پیرزادہ: مگر اس کانگریسی مسلمان مقرر اور سیاسی کارکن کا ایک معمولی سا مطالبہ بھی ہے۔

قائداعظم: کیا؟

پیرزادہ: کہ لیگ اس کے گزارے کے لیے صرف سو روپیہ ماہانہ کا انتظام کر دے۔ اگر ضروری ہوا تو ہم لوگ خود اس رقم کا انتظام کر لیں گے۔ لیگ کے مرکزی فنڈ پر اس کا بار نہ ڈالیں گے۔ صرف آپ کی اجازت کی دیر ہے۔

قائداعظم: (قدرے ناخوشی کے ساتھ)
مجھے افسوس ہے کہ میں اس تجویز سے اتفاق نہیں کر سکتا، خواہ روپیہ کوئی دے۔

پیرزادہ: میں تو سمجھتا تھا کہ میں ایک اہم خبر لے کر آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں اور آپ میری تجویز کا خیر مقدم کریں گے۔ آخر ہمارے پاس کارکن ہیں ہی کتنے اور ان

میں سے بھی کتنے ایسے ہیں جو عام مسلمانوں پر اثر ڈال سکتے ہوں۔

قائداعظم: دیکھیے مسٹر پیرزادہ! میں آپ کی نیک نیتی سے پیش کی ہوئی تجویز کو اس لیے منظور نہیں کر سکتا کہ یہ کام مسلمانوں کا اپنا کام ہے اور اسے کرنے کے لیے کسی مسلمان کو رشوت دینا میرے لیے قطعاً ناجائز ہے۔ اگر آپ کے دوست واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں مسلم لیگ میں آ کر کام کرنا چاہیے تو اس کے لیے شرطیں ٹھہرانا کیا معنی۔ دوسرے، ہم ایک غریب قوم ہیں۔ آپ کے دوست ہم سے صرف ایک سو روپے مانگتے ہیں۔ اگر ہم ان کی شرط منظور بھی کر لیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہم سے زیادہ مالدار قوم ہم سے زیادہ دام دے کر انہیں ہم سے دوبارہ چھین نہ لے گی۔ تم ان کے پاس جاؤ اور کہو کہ اگر وہ آ کر ہم میں شامل ہو جائیں تو ہم دل و جان سے ان کا استقبال کریں گے، جو روکھی سوکھی ہمیں میسر ہے اس میں وہ بھی ہمارے حصہ دار ہوں گے لیکن وہ پیشگی شرط منوانا چاہتے ہیں تو بہتر ہو گا کہ جہاں ہیں وہیں رہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صاحب مسلم لیگ کا کام کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ لیکن قائداعظم نے سیاسی رشوت دینے کی اجازت نہیں دی۔

(اس واقعہ کا تذکرہ ممتاز حسن نے پیرزادہ ذکاء اللہ کے حوالہ سے دسمبر 1954ء کے ماہ نو میں کیا ہے)۔

پہلا سبق، میں مسلمان ہوں

اپریل 1945ء میں قائداعظم، خان آف قلات کی دعوت پر بحالی صحت اور آرام کے لیے بلوچستان تشریف لے گئے۔ پہلے انہوں نے کچھ وقت کوئٹہ میں گزارا۔ جب طبیعت کچھ سنبھلی تو مستونگ اور قلات کا دورہ کیا۔ اس موقع پر خان آف قلات نے ان سے ایک سکول کا معائنہ کرنے کی درخواست کی۔

قائداعظم ننھے منے چاق و چوبند بچوں سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ان سے گھل مل گئے:

قائداعظم: (ایک بچہ سے، خان قلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ کون ہیں؟

بچہ: ہمارے بادشاہ ہیں۔

قائداعظم: میں کون ہوں؟

بچہ: ہمارے بادشاہ کے مہمان ہیں۔

قائداعظم: تم کون ہو؟

بچہ: میں تو بلوچ ہوں۔

قائداعظم: (خان قلات سے) اب آپ ان کو پہلا سبق یہ پڑھائیے کہ میں مسلمان ہوں۔
(بچوں سے) بچو! تم پہلے مسلمان ہو، پھر بلوچ یا کچھ اور۔

یہ واقعہ خان قلات نے کئی محفلوں میں خود سنایا۔ قائداعظمیات کے معروف محقق رضوان احمد 31 اکتوبر 1981ء کے روزنامہ جنگ میں یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''قائداعظم کو بلوچستان بہت عزیز تھا۔ وہ ایک عرصہ تک بلوچستان کے آئینی حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔''

1942ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الٰہ آباد میں ہوا تھا۔ اس اجلاس میں قائداعظم کی صدارت میں بلوچستان کو دوسرے صوبوں کے مساوی آئینی حقوق دینے کی قرارداد منظور کی گئی۔ اس اجلاس کی ایک تاریخی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں قائداعظم نے واشگاف الفاظ میں فرمایا:

''میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا دل دراصل غریبوں کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جوں جوں ہم ساتھ ساتھ قدم بڑھائیں گے ہمارے غریب عوام محسوس کریں گے کہ میں ان کا خادم ہوں۔ اگر میں کامیاب ہو گیا تو یہ میرے لیے خوشی کا مقام ہوگا کہ میں نے غریب عوام کی خدمت کی اور ان کا معیار بلند کیا۔''

کوئی ازم نہیں

1944ء میں پنجاب یونیورسٹی کے جاٹوں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا تھا کہ ہندو جاٹ اور مسلم جاٹ ایک ہیں اور ان کے مفادات مشترک ہیں۔ ذات پات کے تعصّبات کو ابھار کر مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی یہ خطرناک سازش تھی۔ 19 مارچ 1944ء کو پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

قائداعظم: ہماری بنیاد کی چٹان اور ہماری کشتی کا لنگر اسلام ہے اور صرف اسلام ہے۔ ذات

بات کیا، شیعہ سنی کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم ایک ہیں اور ہمیں بحیثیت ایک متحد قوم ہی کے آگے بڑھنا ہے۔ صرف ایک رہ کر ہی ہم پاکستان کو قائم رکھ سکیں گے۔ میں یہاں کمیونسٹ پارٹی کو بھی خبردار کرنا چاہتا ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ کمیونسٹ، مسلمانوں پر ہاتھ نہ ڈالیں۔ ہمارے لیے صرف اسلام ہی کافی و شافی ہے۔ یہی ہماری زندگی کا مکمل آئین ہے۔ ہمیں کسی ازم کی ضرورت نہیں۔

پیسے پیسے کا حساب

قائداعظم بہت ہی محتاط طبیعت کے مالک تھے۔ عوام سے جو روپیہ انہیں وصول ہوتا تھا اس کا حساب دینے میں نہایت پابندی برتتے تھے۔ جب بھی انہوں نے مسلم لیگ کی طرف سے یا مصیبت زدہ مسلمانوں کی امداد کے لیے روپیہ کی درخواست کی، مسلم عوام کی طرف سے اس کا بڑا حوصلہ افزا جواب ملا۔ 1946ء کی انتخابی مہم کے لیے ہر روز ڈاکیہ چھوٹی بڑی سب طرح کی رقموں کے منی آرڈر کثیر تعداد میں لایا کرتا تھا۔ قائداعظم نے اپنے سیکرٹری کو حکم دے رکھا تھا کہ ساری رسیدیں خود ان کے دستخطوں کے لیے پیش کی جائیں اور پیسے پیسے کا باقاعدہ حساب رکھا جائے۔ چنانچہ رسید چار آنے کی ہو یا دس ہزار روپے کی، ان کے دستخطوں کے لیے پیش کی جاتی۔ اس طرح ان کا خاصا وقت ان چھوٹی چھوٹی رسیدوں پر دستخط کرنے میں صرف ہو جاتا۔ ایک روز ان کے سیکرٹری نے کہا:

سیکرٹری: جناب اس طرح چھوٹی بڑی رسیدوں پر دستخط کرنے میں آپ کا خاصا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ اگر رسیدوں پر دستخط کرنے کا کام کسی اور کے سپرد کر دیں تو کیا بہتر نہ ہوگا۔ حساب کا گوشوارہ آپ دیکھ لیا کریں۔

قائداعظم: ہرگز نہیں۔ رسیدوں پر مجھے خود دستخط کرنے چاہئیں۔ اس غریب شخص کے لیے جو مجھے چار آنے بھیجتا ہے، یہ رسید ایسی ہی ہوگی جتنی کہ دس ہزار یا بیس ہزار کے عطیے کی۔ اس غریب آدمی کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس کی مدد کی قدر کرتا ہوں اور اس کے عطیے کو قیمتی سمجھتا ہوں۔ علاوہ ازیں جب میں کسی رسید پر دستخط کرتا ہوں تو مجھے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے پیش نظر مقصد کے لیے ہمیں ایک اور خیر خواہ مل گیا ہے۔ اس مسرت سے بڑھ کر مجھے قوم سے اور کیا انعام مل سکتا ہے۔ بہرصورت

چند سو رسیدوں پر دستخط کرنے سے مجھے کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ عوام کی امداد و تائید سے لیگ کی اور میری قوت میں اضافہ ہو گا اور اپنی جدوجہد میں کامیاب ہونے کے لیے ہمیں اس قوت کی ضرورت ہے۔

(یہ واقعہ مرزا ابوالحسن اصفہانی نے اپنی کتاب ''قائداعظم محمد علی جناح'' میں بیان کیا ہے۔)

صرف ضروری خرچ

قائداعظم زیارت میں ڈاکٹر الٰہی بخش کے زیرِ علاج تھے۔ جولائی 48ء کے اواخر میں جب زیارت کا موسم ٹھنڈا ہونے لگا تو انہوں نے دیکھا کہ قائداعظم کے کپڑے کافی گرم نہیں ہیں۔ ان کو سردی لگ جانے کا اندیشہ تھا اس لیے انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح کی اجازت سے گرم کپڑوں کے لیے کراچی لکھ دیا۔ دوسرے دن ان کی قائداعظم سے یہ گفتگو ہوئی:

ڈاکٹر: جناب پاجامے جو پہنتے ہیں بہت ہلکے ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں آپ کو سردی نہ لگ جائے۔

قائداعظم: میرے پاس ریشمی پاجامے ہیں۔ خیال ہے کہ گاڑھے کے پاجامے بنوا لیے جائیں۔

ڈاکٹر: لیکن جناب سوتی کپڑے کے پاجامے مناسب نہیں ہوں گے۔ آپ کو اونی کپڑے پہننے کی ضرورت ہے۔

قائداعظم: لیکن میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میرے پاس اور پاجامے نہیں ہیں۔

ڈاکٹر: میرا خیال تھا کہ آپ کو اُونی پاجامے پہننے چاہئیں۔ اس لیے آپ کی اجازت کے بغیر ہی میں نے 30 گز ...... کے لیے کراچی لکھ بھیجا ہے۔

قائداعظم: ڈاکٹر! سنیے! میری نصیحت یہ ہے کہ جب آپ کچھ خریدنا چاہیں تو دوبارہ غور کر لیا کریں کہ کیا اس کے بغیر کام چل سکتا ہے یا نہیں یا واقعی اس کی ضرورت ہے۔

اصل میں مسئلہ تھوڑے سے فضول خرچ چند گز کپڑے کا نہیں تھا۔ ایک اصول کا تھا کہ قائداعظم تھوڑے سے فضول خرچ کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا مزاج منطقی تھا۔ جب ڈاکٹر الٰہی بخش نے انہیں اونی کپڑے کی ضرورت پر قائل کر لیا تو ان کی ناراضی جاتی رہی۔

ننھے منے بچوں کو تیرتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی

یہ واقعہ 1945ء کے بعد کا ہے۔ قائداعظم نے لاہور میں اپنی رہائش کے لیے ایک بنگلہ تین لاکھ پینتیس ہزار روپے میں میاں نذیر احمد ایڈووکیٹ سے خریدا تھا۔ یہ بنگلہ لینے کے بعد وہ اکثر و بیشتر لاہور آ کر اسی بنگلے میں ٹھہرتے تھے۔ ایک روز قائداعظم کی، اس زمانے کے مشہور مسلم لیگی لیڈر میاں امیر الدین سے یہ گفتگو ہوئی:

قائداعظم: میاں صاحب! میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ کی وساطت سے مجھے یہ بنگلہ مل گیا۔ قیمت بھی واجبی ہے۔

میاں: جی ہاں! یہ لاہور چھاؤنی کا سب سے اچھا بنگلہ ہے۔

قائداعظم: میاں صاحب! اب جب کہ میں زیادہ تر لاہور ہی میں رہنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ ایک ایسا بنگلہ ڈھونڈیں جو اس سے خاصا بڑا ہو اور ہو سکے تو اس میں تیراکی کا ایک تالاب بھی ہو۔

میاں: (حیرت سے) تیراکی کا تالاب؟

قائداعظم: جی ہاں، اگرچہ مجھے تیرنا نہیں آتا۔ مگر ننھے منے بچوں کو تیرتا دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔

میاں صاحب کہتے ہیں کہ ابھی ہم ایک ایسا بنگلہ ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ پورا پنجاب ہندو مسلم فسادات کی لپیٹ میں آ گیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔ پاکستان بننے کے بعد جب میں قائداعظم سے کراچی گورنر جنرل ہاؤس میں ملا تو وہ بنگلے کی بات بھولے نہیں تھے۔ انہوں نے مجھ سے پھر کہا:

''میاں صاحب! مناسب بنگلہ آپ ضرور تلاش کریں۔ اس منصب سے سبکدوش ہونے کے بعد لاہور میں رہنا چاہتا ہوں۔''

(یہ واقعات 11 ستمبر 1981ء کے مشرق میگزین میں عمر سلیم نے میاں امیر الدین اور میاں صلاح الدین کے حوالے سے لکھے ہیں)۔

تحریک پاکستان اور مسلمان بچے

قائداعظم کے سیکرٹری مطلوب الحسن سید نے اپنی کتاب ''ہمارے قائداعظم'' میں

23 مارچ 1940ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہونے کے چھ مہینے بعد قائداعظم سے اپنی ایک گفتگو نقل کی ہے۔

سید: سر آپ اجازت دیں تو میں کل کا ایک واقعہ بیان کروں۔ جس کا بالواسطہ تعلق تحریک پاکستان سے ہے۔

قائداعظم: ٹھیک۔

سید: سر! کل میں محمد علی روڈ سے گزر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک لڑکے نے جس کی عمر بمشکل دس سال ہوگی کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ اس کے سر میں چوٹ آئی اور خون بہنے لگا۔ لڑکے نے جب سر سے خون پونچھا تو اس کو دیکھ کر رونے لگا۔ وہاں سے ایک نوجوان گزر رہا تھا۔ اس نے اس لڑکے کو ملامت کی اور کہا کہ مسلمان ہو کر ذرا خون بہہ جانے پر روتا ہے۔ بچے نے کہا۔ میں اس لیے نہیں روتا کہ خون بہہ گیا بلکہ اس لیے روتا ہوں کہ یہ ضائع جا رہا ہے۔ میں نے تو یہ خون پاکستان حاصل کرنے کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔

قائداعظم: سید! جب قوم کے بچوں کا یہ جوش و جذبہ ہے تو کوئی طاقت پاکستان کو بننے سے نہیں روک سکتی۔ اگر ہمارے مخالفوں کو عقل آ گئی اور ان کی نیتوں میں فتور نہ ہوا تو ان شاء اللہ ایک قطرہ خون بہنے کی نوبت نہیں آئے گی اور اگر انہوں نے ہٹ دھرمی سے کام لیا تو دونوں طرف سے خون بہے گا۔

جب 1941ء میں مدراس میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے فارغ ہو کر قائداعظم جنوبی ہند کے ایک پُرفضا پہاڑی مقام اوٹا کمنڈ کی طرف کار سے روانہ ہوئے تو راستہ میں انہیں جگہ جگہ رُکنا پڑا۔ چونکہ وہاں کے دیہاتی مسلمانوں نے ان کے استقبال کا انتظام کیا ہوا تھا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں کے لوگوں نے، جس میں مشکل سے سو گھر ہوں گے، قائد اعظم کو اصرار سے روکا کہ وہ ان سے خطاب کریں، ان مخلص دیہاتیوں نے چائے کا بھی انتظام کیا۔ قائداعظم ان کے خلوص اور جذبے سے بہت متاثر ہوئے، رُکے، خطاب کیا اور پھر ان کے ساتھ چائے پی۔ ابھی چائے پی ہی جا رہی تھی کہ اس تقریب سے دور ایک لڑکا، جس کی عمر بمشکل سے 9 سال کی ہوگی، نعرے لگا رہا تھا۔

"مسلم لیگ زندہ باد، قائداعظم زندہ باد۔

لے کے رہیں گے پاکستان، بن کے رہے گا پاکستان۔''

اس کے بدن پر پھٹے پرانے چیتھڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ قائداعظم نے یہ دیکھا تو بہت متاثر ہوئے اور میزبان سے کہا:

''اس کو میرے پاس بلوایئے۔''

جب وہ کم عمر بچہ قائداعظم کے سامنے پیش کیا گیا تو یہ باتیں ہوئیں:

قائداعظم: بچے آؤ، میرے پاس بیٹھو، میں تم سے بہت خوش ہوں، تمہارا نام کیا ہے؟

لڑکا: (کچھ دیر چپ رہنے کے بعد ڈرتے ڈرتے) ابراہیم۔

قائداعظم: ابراہیم! گھبراؤ نہیں، بچے۔ یہ بتاؤ تم نعرہ لگاتے ہو کہ پاکستان لے کے رہیں گے مگر کیا تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ پاکستان کس چیز کو کہتے ہیں؟

لڑکا: (کچھ ہمت کر کے) مجھے اس کے سوا کچھ نہیں معلوم کہ جہاں ہندو ہوں وہاں ہندوؤں کی حکومت اور جہاں مسلمان ہوں وہاں مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیے۔

قائداعظم: شاباش! قرارداد لاہور کی اس سے بہتر کوئی اور وضاحت نہیں ہو سکتی۔

اوٹا کمنڈ پہنچنے کے بعد قائداعظم نے مطلوب الحسن سید سے کہا:

قائداعظم: سید! اس لڑکے کی بات تم نے سنی تھی؟

سید: جی میں پاس ہی تھا۔

قائداعظم: تعجب ہے کہ اس جگہ نہ کوئی اخبار آتا ہے نہ دیہاتیوں کے پاس ریڈیو ہے۔ پھر اس بچے کے ذہن میں پاکستان کے متعلق اتنی صحیح تعریف کیسے آئی۔

سید: جی۔

قائداعظم: اب پاکستان کو کوئی نہیں روک سکے گا۔

(قائداعظم کے سیکرٹری مطلوب الحسن سید نے یہ واقعہ اپنی کتاب ''ہمارے قائداعظم'' میں بیان کیا ہے۔)

پاکستان کا نقشہ

اوائل 1943ء میں وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے قائداعظم کو مذاکرات کے لیے

دعوت دی۔ ان مذاکرات کے دوران ایک مرحلہ پر یہ گفتگو ہوئی:

وائسرائے: اگر آپ یہ ضد چھوڑ دیں کہ پاکستان بننا چاہیے اور مسلمان علیحدہ قوم تسلیم کیے جانے چاہئیں تو میں فریق ثانی کو قائل کر سکتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کو بہت سی مراعات دے۔

قائداعظم: اس بات کا جواب میں آئندہ ملاقات میں دوں گا۔

چند روز بعد جب قائداعظم دوبارہ ملاقات کے لیے گئے تو ان کی جیب میں ایک ریشمی رومال تھا جس پر ہندوستان کا نقشہ کڑھا ہوا تھا اور جس میں مسلمانوں کے اکثریتی صوبے سبز رنگ سے دکھائے گئے تھے۔

قائداعظم: یہ ریشمی رومال دیکھیے۔

وائسرائے: بہت خوب، یہ کشیدہ کاری کا بہت اعلیٰ نمونہ ہے۔

قائداعظم: میں نے آپ کو دست کاری کے نمونے کے طور پر نہیں دکھایا۔ یہ نقشہ ایک 11 سال کی لڑکی نے کاڑھا ہے۔ جو پرانی وضع کے مسلمان گھر میں یوپی میں پیدا ہوئی۔ گھر میں پردہ کی سخت پابندی تھی۔ اس لیے یہ لڑکی کسی مدرسے میں پڑھنے کے لیے نہیں بھیجی گئی۔ اس نے نہایت محنت سے یہ نقشہ بنایا اور نہایت شوق سے اپنے ہاتھوں سے مجھے پیش کیا۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں لوگوں کو سکھاتا ہوں کہ وہ پاکستان مانگیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال اب نوخیز طبقے کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور جب میں اس پر زور دیتا ہوں تو فقط اپنی قوم کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہوں۔

(یہ واقعہ 1943ء میں کوئٹہ میں ایک چائے کی دعوت کے موقع پر سر عبدالقادر نے خود قائداعظم سے سنا اور بعد کو اپنے مضمون میں نقل کیا جو ''قائداعظم میری نظر میں'' نامی کتاب میں شامل ہے)۔

ایک طالب علم کی سوچ کا کرشمہ

11 جولائی 1947ء کو اعلان ہوا تھا کہ قائداعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل ہوں گے۔ دوسرے روز جو ملاقاتی قائداعظم کی خدمت میں سب سے پہلے پیش ہوئے ان میں

جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چوہدری حمیداللہ خان اور ایک سیاسی کارکن پروفیسر محمد اسحاق قریشی تھے۔

پہلے قائداعظم نے اس سازش کا تذکرہ کیا۔ جس کے ذریعے ماؤنٹ بیٹن پاکستان اور ہندوستان کا مشترکہ گورنر جنرل بننا چاہتا تھا۔ قائداعظم کا خیال تھا کہ اگر مسلم لیگ اس جال میں پھنس جاتی تو پاکستان اپنے قیام کے ابتدائی مرحلے میں ہی تباہ ہو جاتا۔ اس کے بعد قائداعظم نے اپنی سیاسی جدوجہد کے بعض دلچسپ واقعات سنائے اور اس ضمن میں انہوں نے فرمایا:

قائداعظم: میرا خیال ہے کہ فہم وفراست اور دانائی مخصوص آدمیوں کی میراث نہیں۔ اس لیے سیاسی امور میں بھی زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ساتھ مشورہ کرنا اور ہر طرح کے اور ہر طبقے کے لوگوں سے مشورہ کرنا مفید ہوتا ہے۔ بعض اوقات بظاہر ایک غیر اہم گمنام آدمی بھی کوئی کام کی بات سمجھا دیتا ہے۔ 1939ء میں کانگریسی وزارتوں کے خلاف یوم نجات منانے کا مشورہ آپ کا کیا خیال ہے مجھے کس نے دیا ہوگا۔

پروفیسر اسحاق: آپ فرمائیں۔

قائداعظم: یہ تجویز دسویں درجے کے ایک گمنام مسلمان طالب علم نے مجھے خط کے ذریعہ لکھ کے بھیجی تھی۔ میں نے اسے فوراً قبول کر لیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مسلم لیگ کی اس تحریک نے کانگریس کو سب سے پہلے سیاسی شکست دی تھی۔ اس تحریک نے ہمیں بھی اپنی قوت کا احساس دلایا اور ہم اعتماد اور عزم کے ساتھ آگے بڑھ سکے اور یہ کرشمہ سکول کے طالب علم کی سوچ کا تھا۔

(قائداعظم کے ان ملفوظات کو پروفیسر محمد اسحاق نے 25 دسمبر 1973ء کے نوائے وقت میں نقل کیا ہے۔)

بچوں کی دانائی

پاکستان بننے سے کئی سال پہلے قائداعظم بمبئی سے دہلی جا رہے تھے۔ جب رات کے ڈیڑھ بجے کے قریب ان کی گاڑی ایک غیر معروف ریلوے سٹیشن پر رُکی تو کسی نے زور سے اس ڈبے کی کھڑکی کو کھٹکھٹایا جس میں قائداعظم سفر کر رہے تھے۔ رات اور وہ بھی سردیوں

کی رات۔ قائداعظم کے ملازم کھڑکی کھولنا نہیں چاہتے تھے۔ قائداعظم کے کہنے پر انہوں نے کھڑکی کھولی تو دیکھا کہ دو کمسن بچے سردی میں ٹھٹھر رہے تھے۔ قائداعظم کو بڑا تعجب ہوا۔ پوچھا:

قائداعظم: تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟

بچے: ہم آپ کو دیکھنے آئے ہیں۔

قائداعظم: تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں اس گاڑی سے آ رہا ہوں۔

بچے: ہم نے اخبار میں پڑھا تھا اور پھر خود اندازہ لگایا کہ تقریباً اس وقت آپ کی گاڑی یہاں پہنچے گی۔

قائداعظم: تم مجھے کیوں دیکھنا چاہتے تھے۔

بچے: آپ ہمارے لیے پاکستان بنا رہے ہیں نا۔

قائداعظم: اچھا یہ بتاؤ کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟

بچے: وہ ملک جہاں مسلمانوں کی حکومت ہوگی۔

قائداعظم نے یہ واقعہ 11 جولائی 1947ء کو جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چوہدری حمیداللہ خان اور سیاسی کارکن محمد اسحاق قریشی کو سنایا اور آخر میں فرمایا:

''دیکھیے گاندھی اور نہرو کہتے ہیں کہ انہیں پاکستان کا مطلب سمجھ نہیں آتا۔ حالانکہ اگر سمجھنے کی نیت ہو تو سکول کے کمسن بچے بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔''

(حوالے کے لیے، نقوش قائداعظم، ص:428)

ایک بچے کا قومی احساس

1940ء میں قائداعظم دہلی سے لاہور تشریف لے جا رہے تھے۔ غازی آباد کے ریلوے سٹیشن پر گاڑی رُکی اور قائداعظم نیچے اترے تو دیکھا کہ دس برس کا ایک بچہ پھولوں کا ہار لیے کھڑا ہے۔ دوسرے استقبالیوں کو چھوڑ کر قائداعظم خود اس کی طرف بڑھے اور کافی جھک کر اسے اپنے گلے میں ہار ڈالنے کا موقعہ دیا۔ پھر یہ باتیں ہوئیں۔

قائداعظم: بچے! تم کیوں آئے ہو؟

بچہ: آپ کو دیکھنے کے لیے۔

قائداعظم: تم مجھے دیکھنے کیوں آئے ہو؟
بچہ: قوم کے لیے۔
قائداعظم: (بچے کی پیٹھ ٹھونک کر) شاباش۔
(پھر خوشی کے ساتھ حاضرین سے)
مسلمان بچوں میں بھی اب قوم کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔
(اس واقعہ کو محمد اظہار الحسن کے حوالے سے ''زندہ قائداعظم'' نامی کتاب میں نقل کیا گیا ہے۔)

نوجوان، قوم کا میگزین

1937ء میں قائداعظم مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے پٹنہ تشریف لے گئے۔ بڑا شاندار استقبال ہوا۔ مسٹر حسن امام کی کوٹھی کے میدان میں ایک جلسہ ہوا۔ قائداعظم نے تقریر کی اور سامعین کو مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دی۔ تقریر کے دوران انہوں نے کہا:
قائداعظم: ہم بغیر میگزین کے ایک جنگ لڑ رہے ہیں۔
ایک نوجوان: (کھڑے ہو کر) ہم آپ کا میگزین ہیں۔
قائداعظم: شاباش! میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔

اس واقعہ کا تذکرہ محمد انیس الرحمان نے جنگ کے 1975ء کے یوم پاکستان ایڈیشن میں کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کے حصول کی جنگ میں قائداعظم نوجوانوں کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔

بہت سے جناح

قائداعظم کو نوجوانوں سے بہت امیدیں تھیں اور ان پر بہت اعتماد بھی تھا۔ حصول پاکستان کی جنگ لڑنے کے لیے قائداعظم نے نوجوانوں، خاص طور پر نوجوان طلبا ہی کو آگے بڑھایا۔ 1937ء میں انہوں نے آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن منظّم کی۔ اس کا پہلا اجلاس قائداعظم کی صدارت میں 1937ء میں کلکتہ میں ہوا۔ انہوں نے کہا:
قائداعظم: آپ لوگ تحریک پاکستان کا ہراول دستہ ہیں۔ نوجوان نسل سے مجھے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ مجھے یقین ہے تم میں سے بہت سے جناح اٹھیں گے۔

طلبا: جناب! آئندہ کیا ہوگا؟
قائداعظم: مستقبل تمہارے ہاتھ میں محفوظ ہے۔

قومی کردار کی ضرورت

قائداعظم اسلامیہ کالج لاہور کے غیور طلبا کی خدمات کی بہت قدر کرتے تھے اور ان پر بہت مہربان تھے۔ ایک جلسہ کی ایک محفل میں جس میں حکیم آفتاب احمد قرشی بھی موجود تھی۔ قائداعظم مسلمانوں کے عروج وزوال پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کسی طالب علم نے پوچھ لیا:

طالب علم: آخر ہم میں سب سے بڑی کمی کیا ہے؟
قائداعظم: ہندی مسلمانوں میں قومی کردار کی کمی ہے۔ نوجوانوں کو اپنی سیرت کی تعمیر کرنا چاہیے اور قومی کردار پیدا کرنا چاہیے۔

یہ سن کر آفتاب قرشی نے کچھ کہا تو نہیں، لیکن ان کے چہرے سے قائداعظم نے ان کے جذبات کو پڑھ لیا اور کہا:

قائداعظم: تم نوجوان ہو، مخلص ہو اس لیے تم ہر شخص کو اپنے جیسا سمجھتے ہو۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ زمانے کے انقلابات سے گزرا ہوں مجھے مسلمان قوم کا خوب علم ہے۔ اب حالت پہلے سے بہتر ہو گئی ہے۔ مسلمان بیدار ہو رہے ہیں مگر اب بھی مسلمان قوم میں ایسے افراد موجود ہیں جو ذاتی مفاد کو ملی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ مسلمان قوم کی سب سے بڑی ضرورت، قومی کردار ہے۔

(یہ گفتگو حکیم آفتاب احمد قرشی نے 14 اپریل 1980ء کے جنگ میں اپنے ایک مضمون میں نقل کی ہے۔)

ترقی کے لامحدود امکانات

اگست 1948ء میں زیارت سے کوئٹہ آ کر قائداعظم کی صحت کچھ دنوں تک بہتر ہوئی۔ اس عرصے میں ان کے ایک معالج ڈاکٹر ریاض علی شاہ کو لاہور جانا پڑا۔ جب واپس آئے تو یہ گفتگو ہوئی:

قائداعظم: آپ خیریت سے واپس آ گئے؟

ڈاکٹر شاہ: جی ہاں، شکر ہے میں بال بچوں کو ساتھ لے آیا ہوں۔
قائداعظم: اچھا کیا۔
ڈاکٹر شاہ: اب آپ اندر سے کیا محسوس کرتے ہیں؟
قائداعظم: میں بہتر محسوس کر رہا ہوں (قدرے توقف کے بعد)

پاکستان کو خدا نے ہر چیز دے رکھی ہے۔ معدنیات و زراعت کے وسیع وسائل۔ اقتصادیات کی ترقی کے روشن امکانات، ملک کو صنعتی بنانے کے لیے ذرائع، غرضیکہ ہر چیز پاکستان میں موجود ہے۔ قدرت کی فیاضی نے اس ملک کو دولت سے مالا مال کر رکھا ہے۔

لیکن ضرورت محنت، خلوص او ردیانت داری کی ہے۔ اگر پاکستانی مسلمان اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کر سکے۔ ان شاء اللہ میری قوم میں یہ اوصاف پیدا ہو کر رہیں گی۔ میں مسلمانوں سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔ میرے ہادی اور آقا ﷺ کی تعلیمات میں مایوسی کا لفظ تک نہیں۔

زندہ قوموں کو انتہائی مصائب اور مشکلات میں بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمان کو تو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب وہ مصیبتوں، مشکلوں، طوفانوں اور آندھیوں میں گھر جائے تو غیر اللہ سے رشتہ توڑ کر اپنے خدا کی طرف رجوع کرے کیونکہ وہ مصیبتوں کو راحتوں میں بدلنے پر قادر ہے۔ تو پھر مسلمان کسی مصیبت سے خوفزدہ کیوں ہو۔ مسلمانوں کو دشمن کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ بلکہ پوری قوت سے ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

(قائداعظم کے یہ ملفوظات ڈاکٹر ریاض علی شاہ کے روزنامچہ سے اخذ کیے گئے ہیں۔)

پاکستان کا روشن مستقبل

جولائی 1948ء کے اواخر میں قائداعظم کی صحت قدرے بہتر ہو گئی تھی۔ تھوڑی بہت توانائی بحال ہوتے ہی وہ اکثر اپنے معالجوں سے مختلف موضوعات پر بحث کرتے۔ بیشتر تو ان کی گفتگو کا موضوع پاکستان ہی ہوتا۔ ایک روز جب ڈاکٹر ریاض علی شاہ ان کے انجکشن لگا

چکے تو کچھ دیر ان کے پاس ٹھہرے رہے۔ قائداعظم نے کہا:

قائداعظم: ڈاکٹر صاحب! اب آپ کی رائے میری صحت کے بارے میں کیا ہے؟

ڈاکٹر شاہ: جناب! اب آپ کی عمومی صحت پہلے سے بہتر ہے۔

قائداعظم: شکر ہے۔ میں بھی یہی محسوس کرتا ہوں۔

(تھوڑے توقف کے بعد)

آج پاکستان ایک زندہ حقیقت ہے۔ ایک ایسی حقیقت جس کا دوست اور دشمن سب ہی اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ پاکستان بن چکا ہے۔ پاکستان کا مستقبل تابناک ہے۔ میرے دل کو اطمینان ہے کہ برعظیم ہند میں مسلمان غلام نہیں بلکہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے آزاد مملکت کے مالک ہیں۔ جس کے وسائل و ذرائع لامحدود ہیں۔ جس کی ترقی کی شاہراہیں نمایاں ہیں اور ان شاء اللہ دنیا کا عظیم ملک بن جائے گا۔

ڈاکٹر!

جب میں محسوس کرتا ہوں کہ میری قوم آج آزاد ہے تو میرا سر عجز و نیاز کی فراوانی سے اللہ تعالیٰ کے آگے جھک جاتا ہے۔

ذرا سوچو!

یہ مشیت ایزدی نہیں تو کیا ہے کہ وہ قوم، جس کو برطانوی سامراج اور ہندو بنئے نے ہندوستان سے مٹانے کی سنگین سازش کر رکھی تھی، آج وہ آزاد ہے، اس کا اپنا ملک ہے، اپنا پرچم ہے، اپنی حکومت ہے، اپنا سکہ اور اپنا دستور ہے۔ کیا کسی قوم پر اس سے بڑھ کر خدا کا اور کوئی انعام ہوسکتا ہے؟ خدا کے اس انعام کی حفاظت اب مسلمانوں کا فرض ہے۔ پاکستان ایک تحفہ ہے اور اس خداوندی تحفے کا تحفظ ہر مسلمان کا ایمان ہونا چاہیے۔

اگر پاکستانی نیک نیتی سے، دیانت داری، خلوص اور ضبط و نظم سے دن رات کام کرتے رہے اور ان میں نفاق، جاہ طلبی اور ذاتی مفاد پرستی کے قابل مذمت رجحانات پیدا نہ ہوئے تو ان شاء اللہ چند سالوں میں ہی وہ دنیا کی بڑی قوموں میں شمار ہونے لگیں گے۔ ان کا ملک امن و آشتی، تہذیب و تمدن، ثقافت و شرافت

کا مرکز ہوگا اوراس کی حدود سے ترقی کی شعائیں نکل کر ایشیائی ممالک کی راہنمائی ورہبری کریں گی اوران کو ترقی وامن کا راستہ دکھائیں گی۔

میں اپنا کام ختم کر چکا ہوں

اپنی آخری علالت کے زمانے میں قائداعظم زیارت میں صاحب فراش تھے۔ ڈاکٹر الٰہی بخش ان کا علاج کر رہے تھے۔ ایک روز انہوں نے برسبیل تذکرہ کہا:

ڈاکٹر: جو پاکستان آپ نے اپنی طویل جدوجہد کے بعد حاصل کیا ہے اسے مضبوط بنانے کے لیے ہمیں ابھی مزید دس برس تک آپ کی ضرورت ہے۔

قائداعظم: میں اپنا کام کر چکا ہوں۔ اب مجھے مرنے کا ملال نہیں ہوگا لیکن میں زیارت میں مرنا نہیں چاہتا۔

(کچھ توقف کے بعد)

آپ کے پاس اب سب کچھ ہے۔ ایک آزاد اور خودمختار ملک، جس میں زندگی کی تشکیل آپ اپنی مرضی کے مطابق کر سکتے ہیں۔ قدرت نے آپ کو سب کچھ دیا ہے۔ آپ کے وسائل لامحدود ہیں سوائے کوئلے اور لوہے کے لیکن یہ چیزیں بھی آپ اپنی فاضل پیداوار کے تبادلہ میں دوسرے ملکوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اب یہ کام نئی نسل کا ہے وہ اپنے ملک کی تعمیر کرے اور مضبوط بنائے۔

(کم وبیش یہی وہ الفاظ ہیں جو قائداعظم نے اپنے 14اگست1948ء کے یوم استقلال کے پیغام میں ارشادفرمائے۔ گویا یہ آخری پیغام ہے۔)

ایک خدا، ایک رسول ﷺ، ایک کتاب اورایک قوم

1942ء میں قائداعظم مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے لیے الٰہ آباد آئے۔ سٹیشن پر مشتاق دید مسلمانوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ جس کی وجہ سے بدنظمی ہونا قدرتی بات تھی۔ قائداعظم نے اپنے سیلون کے دروازے پر کھڑے ہوکر بدنظمی کا مظاہرہ دیکھا تو انگشت اٹھا کر صرف اتنا کہا:

''ڈسپلن!''

اور یہ اشارہ پا کر جو جہاں تھا بیٹھ گیا۔ ان میں شہری مسلمان ہی نہیں، آس پاس کے ان پڑھ دیہاتی بھی تھے۔ سٹیشن پر یکا یک ایسا سکوت چھا گیا جیسے کوئی آبشار رُک گیا ہو۔ قائداعظم دوبارہ اپنے سیلون کے دروازے پر آئے:

قائداعظم: ایک خدا، ایک رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم، ایک کتاب اور ایک قوم۔ متحد ہو جاؤ۔ متحد!!

پاکستان قائم و دائم رہے گا

مرزا ابوالحسن اصفہانی جولائی 1948ء میں قائداعظم سے ملنے زیارت گئے:

اصفہانی: جناب میں دیکھتا ہوں کہ اس بیماری کی حالت میں بھی آپ کے اردگرد فائلوں کا انبار ہے۔ میں یہ عرض کروں گا کہ کام بھی ضروری ہے لیکن آپ کی جان اس کام سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

قائداعظم: میرے بچے! ایک وقت تھا جب واقعی مجھے تشویش رہتی تھی کہ کیا پاکستان ان مسائل ومصائب سے جانبر ہو سکے گا جو تقسیم کے بعد ہندوستان نے ہمارے لیے پیدا کر دیئے تھے۔ وہ غیر یقینی دور کم وبیش سال بھر اوائل جولائی 1948ء تک جاری رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ ان بحرانوں سے ہم کامیابی سے گزر آئے ہیں۔ اب مجھے کوئی اندیشہ نہیں۔ انسان آتے جاتے رہیں گے۔ لیکن پاکستان اللہ کا شکر ہے اب مضبوطی سے قائم ہو چکا ہے اور ان شاء اللہ ہمیشہ قائم و دائم رہے گا۔



تیسرا حصہ

اقبالیات

- ❁ اقبال رحمہ اللہ کا تعارف
- ❁ اقبال رحمہ اللہ کا پیغام نوجوانوں کے نام
- ❁ اقبال رحمہ اللہ اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
- ❁ کردار اقبال رحمہ اللہ

اقبال رحمہ اللہ

شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے دُکھ سُکھ یا خوشی وغم کو خوب صورت الفاظ اور خوب صورت انداز سے دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اس طرح کہ آپ بیتی جگ بیتی معلوم ہونے لگتی ہے۔ دوسری طرح کے شعرا اپنے دُکھ درد کی باتیں نہیں کرتے بلکہ زندگی کے بڑے بڑے بنیادی مسئلوں کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ پہلی طرح کے شاعر زندگی کو سنوارتے ہیں۔ دوسری طرح کے زندگی کو بناتے ہیں۔ رومی، سعدی، عبداللطیف بھٹائی، بابا فرید، بلھے شاہ اور علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا شمار دوسری قسم کے شاعروں میں ہوتا ہے۔

علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کو دو امتیاز حاصل تھے۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بڑے مفکر اور سیاسی مدبر بھی تھے۔ ان کی شاعری نے پورے مشرق کو جگا دیا اور ایک نئے شعور کے نور سے جگمگا دیا اور ان کی غیر معمولی سیاسی سمجھ بوجھ نے برصغیر کے مسلمانوں کو نہ صرف ایک وطن کا تصور دیا بلکہ اس وطن پاکستان کے لیے ایک واضح نصب العین کی نشاندہی بھی کی۔

اقبال کی شاعری پر بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے۔ میں بھی اس تقریر کے آخر میں کچھ عرض کروں گا لیکن اس سے پہلے میں اقبال کے بچپن اور لڑکپن کے چند واقعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بتانے کے لیے کہ بڑے آدمی آسمان سے نہیں اُترتے اچھے گھروں میں اچھے استادوں کے زیرِ سایہ پروان چڑھتے ہیں۔

اقبال نے اپنی فارسی کی نظم اسرارِ خودی میں اپنے بچپن کا یہ واقعہ لکھا ہے۔

جب وہ چھوٹے تھے تو دروازے پر ایک فقیر آیا جو بڑا ڈھیٹ تھا۔ اقبال نے غصے

میں آ کر اس کو دھتکارا اور پھر دھکا دے دیا۔ وہ گر پڑا اور اس کی جھولی کی بھیک کی چیزیں زمین پر گر پڑیں۔ اقبال کے والد شیخ نور محمد نے یہ نظارہ دیکھا تو تڑپ اُٹھے اور اقبال سے سخت ناراضی کے لہجے میں کہا:

''یہ تم نے کیا کیا؟ کیا یہ انسان نہیں؟ قیامت کے دن میں خدا کو کیا جواب دوں گا کہ میں ایک بچے کی تربیت بھی نہ کر سکا۔''

علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ

''اس واقعہ نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔''

اقبال نے اپنے والد سے ایک اور مکالمے کا ذکر بھی کیا ہے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کے والد شیخ نور محمد کا شمار سیالکوٹ کے پہنچے ہوئے بزرگوں میں ہوتا تھا۔ وہ ان پڑھ فلسفی کے لقب سے مشہور تھے اور قرآن حکیم پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان ہی کی تربیت سے اقبال روز صبح سویرے نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے اقبال سے کہا:

''بیٹے! قرآن اس طرح پڑھا کرو کہ یہ جیسے تم پر اُتر رہا ہے۔''

جب علامہ اقبال رحمہ اللہ نے اس قول پر تعجب کا اظہار کیا تو انہوں نے وضاحت کی کہ قاری پر قرآن اترنے کا مطلب کیا ہے۔ اسی بات کو بعد میں اقبال نے یوں بیان کیا:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

اقبال کے وہ استاد جنہوں نے اقبال کو اقبال بنایا۔ مولوی سید میر حسن تھے۔ اقبال بچپن میں بھی ان کا بے حد ادب کرتے تھے اور ان کی خدمت کو اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے۔ چنانچہ اقبال اکثر مولوی صاحب کے گھر کا سودا سلف لا دیا کرتے تھے۔ ایک بار مولوی صاحب کی نظر پڑی تو کہنے لگے: ''اقبال! میں نے کتنی دفعہ کہا ہے کہ میرے گھر کا سودا سلف نہ لایا کرو، تم میرے شاگرد ہو، نوکر نہیں۔'' اقبال نے ادب سے برجستہ کہا: ''جناب میں آپ کا شاگرد نوکر ہوں۔''

اسی طرح ایک اور قصہ ہے کہ

اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ چھٹی میں گھر آئے ہوئے تھے اور رحیما

عطار کی دکان پر کھڑے حقہ پی رہے تھے کہ مولوی میر حسن صاحب پر نظر پڑی۔ حقے کو وہیں چھوڑا اور بھاگ کر آداب بجا لائے اور پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ دکان سے بھاگتے ہوئے ایک جوتی وہیں رہ گئی تھی۔ اسی طرح چلتے چلتے مولوی صاحب کو ان کے گھر تک چھوڑ کر آئے۔

اقبال اپنے ایک اور انگریز استاد پروفیسر آرنلڈ کا بھی بہت احترام کرتے تھے۔ ان کی یاد میں اقبال نے ایک نظم بھی لکھی اور لندن میں انہی کے کہنے پر انہوں نے شاعری ترک نہیں کی۔ ان چند واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال ایک بہت بڑے شاعر اور مفکر ہی نہیں ایک بہت بڑے انسان بھی تھے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ اقبال کا تعلق شاعروں کے اس گروہ سے ہے جو زندگی کو بناتے ہیں، جو زندگی کو روشنی اور حرارت دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کا بہت سا کلام خاصا مشکل ہے۔ اسے بڑی عمر کے پڑھے لکھے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن ہماری خوش قسمتی سے اقبال نے چند نظمیں کم عمر طلبہ کے لیے بھی لکھی ہیں۔ جو ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں کہانی کے پیرائے میں انگریزوں اور ظالموں کی چالبازیوں کی قلعی کھولی گئی ہے۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح ظالم آدمی دھوکے اور فریب سے کام لیتا ہے۔

''ایک پہاڑ اور گلہری'' نظم کا سبق ہے۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

ایک اور نظم ہے ''ہمدردی'' اس کا پیام ہے۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

''ایک پرندے کی فریاد'' ہے۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

محض پرندے کی فریاد ہی نہیں۔ اگر اس کو انگریزوں کی غلامی کے پس منظر میں پڑھا جائے تو اس کے اور بھی معنی نکلتے ہیں۔

اور وہ لافانی نظم ''بچے کی دُعا''!

؎ لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنّا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

یہ بچوں کے ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس سے بہتر دُعا کسی نے نہ لکھی ہوگی۔

؎ دُور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

سبحان اللہ! کیسی پاکیزہ آرزو ہے۔ پھر وطن کی محبت سے بھرپور یہ شعر۔

؎ ہو مِرے دَم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

وطن کی محبت اسی وقت معنی خیز ہوسکتی ہے جب محبت کرنے والا روشن دماغ اور روشن ضمیر بھی ہو۔ اسی لیے کہا ہے:

؎ زندگی ہو میری پروانے کی صورت یاربّ
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یاربّ

چونکہ محبت بغیر خدمت کے بے معنی ہوتی ہے اس لیے دُعا میں ہے۔

؎ ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

اس دُعا کا آخری شعر......

؎ میرے اللہ بُرائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہے اسی رہ پہ چلانا مجھ کو

قرآن حکیم کی سورۂ فاتحہ کی آخری آیت یاد دلاتا ہے:

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ، صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ.

مختصر یہ کہ اقبال کی شاعری صراط مستقیم کی شاعری ہے اور یہی ان کی عظمت کا راز ہے۔



اقبال رحمہ اللہ کا پیغام نوجوانوں کے نام

اقبال نے کہا:

ع فقط ذوق پرواز ہے زندگی

حرکت، جدوجہد، تگ وتاز ہی زندگی کا راز ہے۔

ے چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

چونکہ

ع پوشیدہ قرار میں اجل ہے

اس لیے کوشش ہی سب کچھ ہے۔

ع زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

جہد مسلسل کلام اقبال کا ایک بنیادی تصور ہے۔

ع تو رہ نورد شوق ہے، منزل نہ کر قبول

اقبال کا پیغام عمل کا پیغام ہے۔

ع عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

اقبال کا پیغام سخت کوشی کا پیغام ہے۔

ع سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

اقبال نے بتایا۔

ع جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

زندگی کی ترجیحات (Priorities) کا تعین کامیاب زندگی کی پہلی شرط ہے۔ اس

سلسلہ میں اقبال نے واضح طور پر فیصلہ دیا۔

ع شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

اقبال نے نوجوانوں کی Self Image کو اُبھارا۔ انہیں ان کی اہمیت کا احساس دلایا۔

ع ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

جدوجہد کی زندگی میں مشکلات بھی پیش آتی ہیں۔ اقبال نے نوجوانوں کو حوصلہ دیا۔

ے شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پر دم ہے اگر تو، تو نہیں خطرہ افتاد

ماحول کی رکاوٹوں کے بارے میں اقبال نے نوجوانوں کو یاد دلایا۔

ے پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اقبال نے نوجوانوں کو غیرت مندی کا سبق دیا۔

ع غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں

پھر یہ مشہور شعر......

ے اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اور ایک خط میں لکھا:

''سوال سے خودی ضعیف ہوتی ہے۔''

اقبال نے زندگی میں ڈسپلن کی اہمیت کا اُجاگر کیا۔

ے صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

معلومات اور علم میں، تقلیدی تعلیم (Reproductive education) اور تخلیقی

تعلیم (Creative education) میں جوفرق ہے، اقبال نے اس کی نشاندہی بھی کی۔

؎ تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

اقبال نے تعلیم میں تخلیق (Creative education) پر زور دیا۔ ان کا مشہور قول ہے: ''علم حاصل کرو اور علم پیدا بھی کرو۔''
ان کے اصل الفاظ یہ تھے۔

Collect knowledge as well as create knowledge.

تحقیق (ریسرچ) کے سلسلہ میں اقبال نے کہا:

ع جہانِ تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود

افکار تازہ کے لیے کھلا ذہن چاہیے۔ اس لیے اقبال نے سمجھایا۔

؎ آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پر اَڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اقبال کا آئیڈیل تھا، ''مرد خود آگاہ و خدا مست'' حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

من عرف نفسه عرف ربه.
(جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے ربّ کو پہچانا۔)
سقراط نے کہا تھا۔

Know Thyself.

(اپنے آپ کو پہچانو)

جدید ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ Self Image ہی شخصیت (Personality) کی بنیاد ہے۔ اقبال کی تعلیم بھی خودشناسی، خودآگہی کی تعلیم ہے۔

؎ اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

اقبال نے نوجوانوں کو ملت سے رشتہ استوار رکھنے کی تلقین کی۔

ع پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

اور

ع فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

اقبال نے نوجوانوں کو یاد دلایا۔

؎ کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

اقبال کی نظر تعمیر حرم پر تھی۔

ع ہو تری خاک کے ہر ذرے سے تعمیر حرم

حرم (کعبۃ اللہ) ملت کے اتحاد کی علامت ہے۔ ضروری تھا کہ حرم کی پاسبانی کے لیے سارے مسلمان متحد ہوں۔

؎ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

یکجہتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ فرقہ پرستی بنتی ہے۔

؎ یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

اقبال دیکھ رہے تھے کہ

ع ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو

اس لیے انہوں نے کہا:

ع اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

اقبال چاہتے تھے۔

ع بے لوث محبت ہو بیباک صداقت ہو

بلند مقاصد ہی انسان کو بلند کرتے ہیں۔ اس لیے اقبال نے تلقین کی۔

ع رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر

اقبال نے نوجوانوں کو واضح طور پر بتایا کہ کردار کی بنیادیں کیا ہیں:

؎ یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال ملت کے نوجوانوں کو رول ماڈل (Role Model) دیکھنا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنے رول کے چیلنج کو قبول کرسکیں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اقبال فلسفی شاعر تھے۔ انہوں نے نہ صرف نوجوانوں بلکہ تمام دنیا کو اس حقیقت سے خبردار کیا کہ بے شک زمانہ حاضر کے انسان نے ٹیکنالوجی میں، ''خبر'' میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ لیکن اس کی ''نظر'' کی دنیا ابھی تک تاریک ہے۔ اسے آدمی سے انسان بننا ہنوز نصیب نہ ہوسکا ہے۔ دنیا میں کیریکٹر کا Crisis پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا!
اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا!
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا!
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا!

مسلمانوں کا کردار اس شعر میں کس قدر واضح ہے۔

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں نظر میں اذانِ سحر میں



اقبال رحمہ اللہ اور عشقِ رسول ﷺ

صدر گرامی، مہمان خصوصی اور حاضرین!
اقبال کی مشہور نظم ''جواب شکوہ'' کا آخری شعر

کی محمد ﷺ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یوں تو یہ شعر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے شکوے کے جواب میں ہے لیکن یہ اصل میں اقبال کے اپنے دل کی آواز ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے وفا کرنا تصورات اقبال کی بنیادی کڑی ہے۔
بالِ جبریل کا شعر ہے:

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰس، وہی طٰہٰ

یعنی حضور نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس عین اسلام ہے۔ بالِ جبریل ہی میں اقبال نے رسول کریم ﷺ کی شان میں کہا ہے۔

لوح بھی تُو، قلم بھی تُو، ترا وُجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

اور ایک جگہ اقبال کہتے ہیں کہ اگر عشقِ رسول ﷺ نہ ہو تو مسلمان کی نماز بھی بے

اثر رہتی ہے۔

؎ شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
مرا قیام بھی حجاب، مرا سُجود بھی حجاب

اقبال نے عشقِ رسول ﷺ پر اپنی نظم ہی میں نہیں، اپنی نثر میں بھی بہت زیادہ زور دیا ہے۔ کتاب ''سیرتِ اقبال'' میں اقبال کا یہ قول درج ہے۔

''عشقِ رسول ﷺ بھی ہے اور وسیلہ دنیا بھی۔ اس کے بغیر انسان نہ دین کا رہتا ہے نہ دُنیا کا۔''

ایک اور کتاب ''اقبالِ کامل'' میں اقبال کے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں۔

''ہمارا کوئی عمل و عبادت حدیث کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔''

اقبال نے عشقِ رسول ﷺ کو جو اسلام کی روح قرار دیا یہ آواز ان کے دل کی بھی تھی اور یہی فیصلہ ان کے فلسفی دماغ کا بھی تھا۔ اپنے انگریزی خطبات میں فرماتے ہیں:

''پیغمبرِ اسلام ﷺ کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے۔ بہ اعتبار اپنے سرچشمہ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے۔ یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم وحکمت کے دو تازہ چشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رُخ کے مطابق تھے۔''

اقبال نے اپنے خطبات میں ایک اور جگہ رسول ﷺ اور دینِ اسلام کے تعلق کو بہت ہی خوب صورت اور واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اسلام، بحیثیت دین، خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے، رسولِ کریم ﷺ کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔''

اسی لیے وہ کہتے ہیں:

؎ بہ مصطفیٰ ﷺ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی است

یعنی تم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک رسائی حاصل کرو کہ وہی تمام تر

دین ہیں۔ اگر تم ان تک نہیں پہنچے تو پھر بولہبی ہے، گمراہی ہے۔

اقبال نے عشقِ رسول ﷺ کی توجیہہ عام فہم انداز میں بھی کی ہے۔ اپنے عید میلاد النبی ﷺ کے خطبہ میں انہوں نے کہا:

''میرے نزدیک انسانوں کی دماغی اور قلبی تربیت کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ان کے عقیدے کی رو سے زندگی کا جو نمونہ بہترین ہو وہ ہر وقت ان کے سامنے رہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے اسی وجہ سے ضروری ہے کہ وہ اسوۂ رسول ﷺ کو مدنظر رکھیں تا کہ جذبہ تقلید اور جذبہ عمل قائم رہے۔''

نذیر نیازی کی روایت ہے کہ ایک محفل میں اقبال نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کا ارادہ عالم انسانیت کو جس معراج کمال تک پہنچانے کا تھا اس کا آخری اور کامل نمونہ حضور نبی کریم ﷺ کی ذات استودہ صفات میں سامنے پیش کر دیا۔''

عشقِ رسول ﷺ، اقبال کے لیے قال کی نہیں حال کی بات تھی۔ جو لوگ اقبال کی زندگی سے واقف ہیں وہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے اقبال کے عشق کا یہ عالم تھا کہ جب ان کا نام آتا تھا تو یہ ایک عاشقِ صادق کی طرح اشکبار ہو جاتے تھے۔ اس ضمن میں یہاں ان دو واقعات کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

''اوراق گم گشتہ'' نامی کتاب میں لکھا ہے کہ

''ایک بار پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورے کے لیے علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ سمیت پنجاب کے چند چوٹی کے وکیلوں کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی پر ان کے قیام کا بندوبست کیا۔ رات کو علامہ جب اپنے کمرے میں آ گئے تو عشرت کدہ پایا۔ آسائش و آرام کی قیمتی سے قیمتی چیز موجود تھی۔ ان کے لیے جو بستر لگایا گیا تھا وہ خاص طور پر نرم و نفیس تھا۔ اس پر لیٹتے ہی علامہ یکا یک اٹھ بیٹھے اور ساتھ والے غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ کر رونے لگے۔ پھر اپنے خادم علی بخش کو آواز دی۔ وہ باہر برآمدے میں تھا۔ جب وہ اندر آیا تو انہیں کمرے میں نہ پا کر حیران ہوا۔ علامہ نے پھر آواز دی۔ ادھر غسل خانے میں آؤ۔

اسے فکر لاحق ہوئی کہ کیا بات ہے۔ جب وہ اندر گیا تو دیکھا کہ یوں علامہ ٹھیک ٹھاک ہیں لیکن اشک بار ہیں۔ پوچھا کہ

''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ آپ کا کمرہ اور بستر تو بادشاہوں جیسا ہے۔نواب صاحب نے اپنی خواب گاہ میں آپ کو ٹھہرایا ہے۔''

علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ نے فرمایا:

''ہاں مجھے معلوم ہے یہ شاہانہ خواب گاہ ہے لیکن بستر پر لیٹتے ہی مجھے خیال آیا کہ جس رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ آسائشیں نصیب ہوئی ہیں اس نے کھجور کے بوریے پر سو کر ساری زندگی گزار دی۔ بس یہ خیال آتے ہی دل بھر آیا۔ اب اس ریشم اور مخمل کے بستر پر لیٹنا میرے لیے ممکن نہیں۔ جاؤ باہر سے کوئی معمولی سی چارپائی اُٹھا لاؤ اور اس پر میرا اپنا بستر بچھا دو۔''

یہ سن کر علی بخش نے عرض کیا:

''ڈاکٹر صاحب! ایک آدھ دن تو اس شان و شوکت کے مزے بھی اٹھائیے۔''

علامہ نے کہا:

''علی بخش! مجھے اپنے بوریے میں زیادہ آرام ملے گا۔''

یہ واقعہ علامہ کی زندگی کے آخری دور کا ہے لیکن رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت و عقیدت کے جذبے سے وہ اس وقت بھی سرشار تھے جب وہ نوجوان تھے۔ فلسفے اور بیرسٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ انگلستان جا رہے تھے۔ 12 ستمبر 1905ء کو جب علامہ کا جہاز ملوجا عدن کی بندرگاہ کے قریب پہنچا تو ساحل عرب کے تصور نے علامہ کو بے چین کر دیا اور سرزمین عرب کو مخاطب کر کے کہا:

''اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پتھر تھی، جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا۔ مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کے تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی ہے۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس قدم دیکھے ہیں اور

تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں رہروان حق کو تمازت آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیری ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیز دھوپ میں چلتا ہوا اور پاؤں کے چھالوں کی پروا نہ کرتا ہوا اس متبرک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں بلال رضی اللہ عنہ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔''

یہ الفاظ اقبال کے ایک خط سے لیے گئے ہیں۔ (جو مقالات اقبال میں شامل ہے) ان الفاظ کو کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ نثر میں نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس سے بہتر اور موثر شاید کوئی اور مثال موجود نہیں۔



کردارِ اقبال رحمہ اللہ

بے جی، آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا!

جب علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کی والدہ امام بی بی کا انتقال ہوا اور علامہ کے دوست احباب تعزیت کے لیے گئے تو علامہ بار بار کہتے:

''بے جی! آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔''

حاضرین حیران تھے کہ علامہ کس احسان کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔آخر کسی نے پوچھا:

یکے از حاضرین: حضرت! ہر ماں سراپا احسان ہوتی ہے۔آپ کا اشارہ کسی خاص احسان کی طرف ہے؟

علامہ: ہاں، ایک خاص احسان کی طرف۔

حاضرین: اگر بار خاطر نہ ہو تو ارشاد فرمائیں۔

علامہ: میں نے سنا ہے کہ جب میں چھوٹا سا تھا تو والد ڈپٹی وزیر علی بلگرامی کے یہاں کپڑے سینے پر ملازم تھے۔ چونکہ ڈپٹی صاحب انگریز سرکار کے ملازم رہ چکے تھے اور ان کی پنشن کھاتے تھے اس وجہ سے بے جی کو شبہ ہو گیا تھا کہ ان کی آمدنی کا ایک حصہ شرعاً مشکوک ہے۔اس لیے انہوں نے مجھے اپنا دودھ پلانا بند کر دیا۔ پھر اپنی محنت سے خریدی ہوئی بکری کا دودھ مجھے پلانے لگیں۔ بعد میں والد صاحب نے صورت حال کی وضاحت کی اور ڈپٹی صاحب کی ملازمت بھی چھوڑ دی لیکن اس واقعہ سے مجھ پر رزق حلال کی اہمیت واضح ہو گئی کہ رزق حلال ایمان کی جان ہے۔

اللہ اکبر، یہ تھی وہ ماں جس نے خالقِ پاکستان کی پرورش کی۔ کیا تعمیرِ پاکستان کے لیے رزقِ حلال کی ضرورت نہ ہوگی۔

کل میں رسولِ کریم ﷺ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟

اپنی فارسی مثنوی رموز بے خودی میں علامہ نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ ایک فقیر دروازے پر بار بار صدا لگا رہا تھا اور کسی صورت میں ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ ان کو غصہ آیا تو اس کے سر پر ایک ڈنڈا دے مارا۔ فقیر لڑکھڑایا اور اس کی جھولی میں جو کچھ تھا وہ نیچے گر پڑا۔ علامہ کے والد شیخ نور محمد رحمہ اللہ نے جب یہ دیکھا تو تڑپ اُٹھے۔ سخت آزردہ ہوئے۔

شیخ نور محمد: یہ تم نے کیا کیا؟

اقبال: یہ یہاں سے ٹلتا کیوں نہیں تھا؟

شیخ نور محمد: بیٹا! کل حضور نبی کریم ﷺ کی امت میدان حشر میں ہوگی اس میں ملت بیضا کے غازی، عالم، شہید، زاہد، عاشق، گنہگار سب ہی شامل ہوں گے تو اس مظلوم فقیر کے نالے بلند ہوں گے۔

بیٹا! جب تِرے لیے مرکب کے بغیر راستہ چلنا مشکل ہوگا اس وقت حضور نبی کریم ﷺ مجھے کہیں گے، اللہ نے ایک مسلمان نوجوان تیرے سپرد کیا تھا تاکہ تو اسے صحیح تعلیم و تربیت دے لیکن اس نوجوان نے میرے دین سے کوئی استفادہ نہ کیا اور تو ایک کام بھی نہ کر سکا۔ یعنی تو مٹی سے بنے ہوئے پتلے کو آدمیت کا سبق نہ دے سکا۔ تو میں اس کا کیا جواب دوں گا۔

بیٹا! ذرا خیال کر! اُمتِ خیر البشر ﷺ کے اجتماع کے سامنے میری کیا حالت ہو گی۔ خدا کے لیے میری سفید رِیش کالی نہ کر۔ میری اُمید و بیم کی کیفیت کا خیال کر۔ اپنے باپ پر اتنے ستم نہ ڈھا اور آقائے کُل ﷺ کے سامنے اس بندۂ عاجز کو رُسوا نہ کر۔

وہ اُجرت حرام ہے جو کام کو بڑھا کر لی جائے

علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کی کاروباری دیانت داری کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

مسٹر داس پٹنہ کے مشہور بیرسٹر تھے۔ ان کے پاس ریاست آرہ کا ایک مقدمہ آیا۔ اس سلسلہ میں فارسی کی قدیم دستاویزات کا انگریزی میں ترجمہ کر کے ان پر تبصرہ کرنا تھا۔ بیرسٹر داس نے ڈاکٹر اقبال کی خدمات حاصل کیں۔ علامہ پٹنہ گئے اور مقدمہ کے کاغذات تحویل میں لے لیے۔ دوسرے دن بیرسٹر داس اور علامہ میں یہ گفتگو ہوئی:

داس: ڈاکٹر صاحب! دستاویزات آپ نے دیکھیں؟

علامہ: جی ہاں، یہ لیجیے، میں نے خلاصہ تیار کر دیا ہے۔ دعوے کے دلائل ترتیب دے دیئے ہیں۔

داس: ارے اتنی جلدی؟

علامہ: مثل تو بہت ضخیم ہے۔ اصل متعلقہ کاغذات زیادہ نہیں تھے۔

داس: پھر بھی کچھ وقت لینا تھا۔ آپ کو ایک ہزار روپے روز کی فیس پر یہاں بلایا گیا ہے۔ دو چار ہزار تو بنتے۔

علامہ: مسٹر داس! میرے مالی فائدے میں جو آپ کی دلچسپی ہے اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میرے رسول ﷺ نے اس روزی کو حرام قرار دیا ہے جو کام کو بڑھا کر لی جائے۔

اس معاہدے سے ارتکاز میں کمی آ جائے گی

علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے۔ لیکن اس سلسلہ میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا کہ مقدمہ جھوٹا ہے تو اس کو ہاتھ نہ لگاتے۔ خواہ موکل کتنی زیادہ فیس دینے پر آمادہ ہوتا۔ صحیح مقدمے بھی صرف گزارے بھر کے لیے لیتے تھے۔ جوں ہی چھ سات سو روپے ہاتھ آ جاتے مزید لینا بند کر دیتے۔ 1935ء سے جب گلے کی تکلیف بڑھی تو آمدن کا یہ رہا سہا سہارا بھی نہ رہا۔ کچھ کتابوں کی رائلٹی ملتی تھی اور تھوڑا بہت پیسہ بینک میں جمع تھا۔ بس اسی طرح تنگی ترشی سے کام چل رہا تھا۔ دوستوں اور نیاز مندوں کو صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے اس سلسلے میں سلسلہ جنبانی شروع کیا۔

حیدرآباد کے وزیر سر اکبر حیدری نے علامہ کے ایک خاص دوست اور نیاز مند میاں امیر الدین کو لکھا کہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان کی خدمت میں ان کی یہ پیش کش

کریں:

میاں امیرالدین: ڈاکٹر صاحب! اب گلے کی تکلیف کا کیا حال ہے؟

علامہ: علاج جاری ہے، اللہ کرم کرے گا۔

میاں امیرالدین: سر اکبر حیدری نے مجھے لکھا ہے کہ میں ان کی ایک تجویز آپ کے سامنے رکھوں۔

علامہ: وہ کیا کہتے ہیں؟

میاں امیرالدین: تجویز یہ ہے کہ اگر سال میں صرف ایک ہفتہ عثمانیہ یونیورسٹی جا کر لیکچر دے دیا کریں تو یونیورسٹی اس کا معاوضہ دس ہزار روپیہ سالانہ ادا کرے گی۔

علامہ: آپ کو معلوم ہے کہ منجملہ اور چیزوں کے میرا تو گلہ ہی بیٹھا ہوا ہے۔ بولنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ لیکچر کس طرح دوں گا۔

میاں امیرالدین: اس کا علم انہیں ہے۔ اسی لیے انہوں نے کہا ہے کہ آپ صرف لیکچر لکھ کر دیا کریں۔ وہ کسی اور سے پڑھا لیا کریں گے۔

علامہ: (کچھ سوچ کر) پھر بھی اس تجویز کو قبول کرنا میرے لیے مشکل ہے۔

میاں امیرالدین: کیوں؟ میرے خیال میں تو یہ بہت معقول تجویز ہے۔

علامہ: مجھے اس کی معقولیت میں کلام نہیں۔ وجہ تردد کچھ اور ہے۔

میاں امیرالدین: کیا؟

علامہ: میں اسلامی فقہ پر ایک کتاب لکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اگر میں یہ کنٹریکٹ منظور کر لوں تو میں ذہنی طور پر مصروف ہو جاؤں گا اور کتاب مکمل نہ کر سکوں گا اس لیے یہ کنٹریکٹ مجھے منظور نہیں۔

میاں امیرالدین کی عمر اب کم و بیش نوے برس کی ہے۔ علامہ سے ان کی پہلی ملاقات 1900ء میں ہوئی تھی جب میاں صاحب چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے۔ اس وقت سے 1938ء میں علامہ کی وفات تک میاں صاحب علامہ کے قریب رہے۔ یہ واقعہ میاں صاحب کے حوالے سے خوشنود علی خان نے 10 نومبر 1980ء کے اخبار جہاں میں نقل کیا ہے۔

پچاس سال تک فاتحہ

انسان جو کچھ سیکھتا ہے ماں باپ سے سیکھتا ہے یا استادوں سے۔ علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ اس لحاظ سے بہت خوش قسمت تھے کہ ان کے والدین بھی سچے اور پکے مسلمان تھے، تقویٰ کی تصویر۔ اوران کے اساتذہ بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ خصوصاً ان کے استاد مولوی میر حسن حد درجہ متقی اور بااصول انسان تھے اور عزم و ثبات کا پیکر۔ مولوی میر حسن کی ایک بہن تھیں۔ 1875ء میں وہ ایسی بیمار ہوئیں کہ علاج معالجہ کچھ کارگر نہ ہوا اوران کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ مولوی میر حسن ان کی پٹی سے لگے دن رات تیمارداری میں لگے رہتے۔ لیکن افاقہ ہونا تھا نہ ہوا۔ ایک روز عصر کی نماز کے بعد مولوی صاحب نے پوچھا:

مولوی میر حسن: کیا حال ہے بہن؟

بہن: کیا بتاؤں۔

مولوی میر حسن: جو حال ہو بتاؤ، کیا بہت اُداس ہو، کچھ چپ چپ ہو۔

بہن: میں گھر میں ہوں تو آپ سب مجھے پوچھتے ہیں۔

مولوی میر حسن: کیوں مایوسی کی باتیں کرتی ہو۔

بہن: کل مر جاؤں گی اور قبر میں اکیلی ہوں گی تو کوئی دُعا کے لیے بھی وہاں نہ آئے گا۔

مولوی میر حسن: بہن! تم اپنا دل میلا نہ کرو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی میں جب تک مجھ میں چلنے پھرنے کی سکت رہے گی روزانہ تمہاری قبر پر فاتحہ پڑھنے آؤں گا۔

مولوی میر حسن کے بیٹے سید ذکی شاہ لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب نے اس عہد کو عمر بھر اس طرح نبھایا کہ کوئی کیا نبھائے گا۔ 1927-28ء تک جب تک ان کی بینائی زائل نہ ہوگئی وہ پچاس سال سے زیادہ عرصے تک ہر روز اپنی مرحومہ بہن کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتے رہے۔ سردی ہو یا گرمی، مینہ برسے یا آندھی آئے، وہ اگر سیالکوٹ میں ہوتے تو صبح کی نماز پڑھتے ہی قبرستان کی طرف روانہ ہو جاتے اور تلاوت کرتے جاتے۔ ہمشیرہ اور والدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے اور پھر اسی طرح تلاوت کرتے واپس آ جاتے۔ چونکہ یہ ان کا روز کا معمول تھا اس لیے جن لوگوں کو ان سے ملنا جلنا ہوتا وہ اکثر انہی اوقات میں قبرستان چلے جاتے یا آتے جاتے راستے میں مل لیتے۔''

جو کچھ مولوی میر حسن پچاس سال تواتر سے کرتے رہے وہ محض ایک بہن سے وعدے کا پاس ہی نہیں تھا بلکہ ایک طرز زندگی تھا۔ جس شخص نے پچاس برس تک یہ عہد نبھایا وہ اپنی زندگی کے دوسرے معاملات میں کتنا بااصول، کتنا پرہیزگار اور کتنا متقی ہوگا۔ اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مولوی میر حسن کے بعض شاگرد ان کا کتنا ادب کرتے تھے اس کا حال ذکی شاہ کی زبانی سنیے:

''ہمارے کپڑے ایک غیر مسلم دھوبن دھوتی تھی۔ اس کا لڑکا بھی ساتھ آیا کرتا تھا۔ مولوی صاحب نے اسے اپنے شوق سے پڑھانا شروع کیا۔ جب بڑا ہوا تو وہ اپنی خوشی سے مسلمان ہوگیا۔ اس کا اسلامی نام رکن الدین رکھا گیا۔ مولوی صاحب نے اسے اپنے خرچ سے پوری تعلیم دلوائی۔ اس کے ساتھ مولوی صاحب کا ایک شاگرد نہال سنگھ تھا۔ رکن الدین اور نہال سنگھ دونوں میٹرک، ایف اے، بی اے، ایم اے اور مقابلے کے امتحانوں میں برابر اول دوم نکلتے رہے۔ رکن الدین سیشن جج کے عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ نہال سنگھ پہلے ڈپٹی کمشنر بنے۔ پھر پٹیالہ میں انہیں وزارت کا عہدہ ملا۔

ان دونوں شاگردوں کا یہ حال تھا کہ رکن الدین مولوی صاحب سے ملنے آتے تو واپس ہوتے وقت پچھلے پاؤں چلتے۔ کبھی مولوی صاحب کی طرف پیٹھ کر کے نہیں چلے۔ نہال سنگھ کی کیفیت یہ تھی کہ گاڑی پر سوار جا رہے ہوتے، جہاں مولوی صاحب پر نظر پڑتی گاڑی روک کر اتر جاتے اور ادب سے ان کے قدم بہ قدم چلتے۔ ان کی موجودگی میں کبھی گاڑی پر سوار نہ ہوتے۔''

برہنہ پا استاد کے پیچھے پیچھے

علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کے بھانجے پروفیسر منظور احمد بیان کرتے ہیں کہ

''یہ اس زمانے کی بات ہے جب علامہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ چھٹیوں میں سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ رحیما عطار کی دکان کے سامنے کھڑے تھے۔ تختے پر حقہ دھرا ہوا تھا۔ علامہ حقہ پی رہے تھے۔ ایک پاؤں زمین پر اور دوسرا تختے پر تھا۔ طلائی کام کی جوتی پہنے ہوئے تھے۔ اتفاق سے مولوی میر حسن رحمہ اللہ ادھر سے گزرے۔ جوں ہی علامہ کی نظر

ان پر پڑی جھٹ مولوی صاحب کی طرف لپکے۔ جلدی میں تختے پر جو پاؤں تھا اس کا جوتا نکل گیا جو ذرا ڈھیلا تھا۔ وہ اسی طرح شاہ صاحب کے پیچھے ہو لیے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ علامہ کے ایک پاؤں میں طلائی کام کا جوتا تھا۔ دوسرا خالی۔ اور وہ سر جھکائے مولوی صاحب کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے اسی حالت میں شاہ صاحب کو ان کے دروازے تک پہنچا کے واپس آئے۔ جب دوسرا جوتا پہننے لگے تو رحیما نے کہا۔

رحیما: باؤ جی، تسی حد کر دتی۔

علامہ: رحیما، تجھے کیا خبر کہ شاہ صاحب کا مرتبہ کیا ہے۔

بیوہ کے بچوں کی خاطر

خوش معاملگی اور انسانی ہمدردی علامہ پر ختم تھی۔ 1922ء میں انارکلی سے اٹھ کر میکلوڈ روڈ کی جس کوٹھی میں منتقل ہوئے وہ ان کے شایان شان نہ تھی۔ نہایت بدنما اور بوسیدہ اور کرایہ پونے دوسو روپے ماہانہ، دوست، احباب اور نیاز مند انہیں اکثر اس طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔ ایک روز علامہ سے عبدالمجید سالک کی یہ گفتگو ہوئی۔

سالک: ڈاکٹر صاحب! یہ کوٹھی بدنما ہونے کے علاوہ بہت ہی خستہ حالت میں ہے۔

علامہ: جی ہاں! اس میں کھڑے رہنے کی کوئی بات نہیں (ہنس کر) صرف میری دُعاؤں سے قائم ہے۔

سالک: پھر پونے دوسو روپے کرایہ، حضرت۔ یہ تو پیسہ برباد کرنے والی بات ہے۔ اس کرائے میں اس سے کہیں بہتر کوٹھی مل سکتی ہے۔

علامہ: آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ دوسرے احباب کا بھی یہی خیال ہے لیکن شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ کوٹھی ایک بیوہ کی ہے جس کے بچوں کی گزران اسی کے کرائے پر ہے۔ مجھے یہ کوٹھی چھوڑتے یا کرایہ کم کرتے وقت شرم آتی ہے۔

سفارش، خودداری کے منافی

علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ مدت العمر مختلف امتحانوں کے ممتحن رہے۔ پرچے سیٹ بھی کرتے تھے، صدر ممتحن بھی ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں بھی انہوں نے بعض اصول وضع کر لیے

تھے جن پر وہ سختی سے کاربند رہے۔

ایک بار ایک مستحق مسلم امیدوار کے فارسی کے پرچے کا مسئلہ تھا۔ مسئلہ کی سنگینی اس حد تک تھی کہ حافظ محمود شیرانی اور سر عبدالقادر جیسے ثقہ حضرات، علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

شیخ عبدالقادر: ڈاکٹر صاحب! اگر یہ مسلمان طالب علم فیل ہو گیا تو سٹیٹ سکالرشپ کوئی ہندو لے جائے گا۔

محمود شیرانی: پرچہ کی طوالت کی وجہ سے اس ہونہار طالب علم سے ایک غلطی ہو گئی۔

عبدالقادر: ڈاکٹر صاحب! آپ پرچہ تو دیکھیے۔

علامہ: (پرچہ دیکھ کر) آپ کے امیدوار کے چھبیس نمبر ہیں۔ جو مستحق ہے، اسے یہ سکالرشپ ملنا چاہیے۔ میرے کچھ اصول ہیں جن پر میں کاربند ہوں اور اپنے افعال کا جواب دہ ہوں۔ اخلاقی اعتبار سے بھی میں ایسا کرنے سے قاصر ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔

اسی طرح ایک مولوی محمد شفیع نے کسی کی سفارش کرنے کے بارے میں استدعا کی۔

مولوی محمد شفیع: ڈاکٹر صاحب! اس معاملہ میں سفارش کر سکیں تو......

علامہ: آپ کو معلوم ہے کہ میں لوگوں کی سفارش نہیں کرتا۔ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ ایسی سفارشات شاذ و نادر ہی کارگر ہوتی ہیں۔ میں اس سلسلہ میں اپنے گزشتہ گناہوں پر پشیمان ہوں۔ تجربے نے یہ حقیقت مجھ پر واضح کر دی ہے کہ یہ خودداری کے منافی ہے۔ بلا نتیجہ سفارش کرتے جانا مجھے ذلت انگیز معلوم ہوتا ہے۔

انگریز کو رام کرنے کا نسخہ

1892ء میں جب علامہ اقبال انارکلی چھوڑ کر میکلوڈ روڈ پر کرائے کی ایک کوٹھی میں رہنے لگے تھے۔ اسی کوٹھی کے بارے میں ایک روز مرزا جلال الدین بیرسٹر نے علامہ سے کہا۔

مرزا: میکلوڈ روڈ کی یہ کوٹھی بہرحال انارکلی کی رہائش سے زیادہ مکانیت رکھتی ہے۔ اس کی آرائش کی طرف بھی توجہ دیجیے۔ کم از کم اس کے مردانہ کمروں کو ڈرائنگ اور ڈائننگ رومز میں ہی تقسیم کر دیجیے۔

علامہ: میں کسی قسم کے بے معنی تکلفات میں اُلجھنا نہیں چاہتا۔

مرزا: کبھی کبھی حکام کو اپنے ہاں مدعو کر لیا کریں۔ انگریز کو رام کرنے کا بہترین طریقہ دعوت ہے۔ انگریز اکثر بڑے بڑے وعدے ایسی ہی صحبتوں میں کیا کرتا ہے اور جو تعلقات کھانے کی میز پر قائم ہوتے ہیں اس کا احترام اسے ہمیشہ ملحوظ رہتا ہے۔

علامہ: میں ایسی تقریبات پر روپیہ ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ اوّل تو انگریز کو رام کرنے کا سوال ہی میری دلچسپیوں کے دائرہ سے باہر ہے۔ دوسرے اگر کھانا کھانے کے بعد بھی انگریز رام نہ ہوا تو اس دردسری کا کیا فائدہ۔

نوکروں کی دلداری

علی بخش کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب جو خود کھاتے تھے وہی نوکروں کو بھی کھلاتے تھے۔ نوکروں کے لیے کبھی الگ کھانا نہیں پکتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ نوکروں کے لیے گھر سے دال پک کر آئی جس میں گھی نہیں ڈالا گیا تھا۔ جب علامہ کو پتا چلا تو اندر گئے۔

علامہ: (سخت ناراضی کے لہجہ میں) یہ چیز تم نے نوکروں کو نہیں کھلائی مجھے کھلائی ہے۔ میں ایسی بات کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ نوکر ہمارے دست و بازو ہیں۔ ہم ان کے پروں پر اڑتے ہیں۔ ہمارے کام ان کے سہارے چلتے ہیں۔ یہ بات بہت بُری ہے کہ کھانے میں ان کو الگ رکھا جائے۔



باب سوم

ٹیچر ایجوکیشن

پہلا حصہ

 مٹی کا دیا اور دسمبر کا گلاب

Teacher's Role Description.

 بچوں کی تربیت

ٹیچر کی سیلف امیج

(Teacher's Self-image)

اور

Role Description

 مٹی کا دیا اور دسمبر کا گلاب

 خودکلامی (Self-talk)

 استاد کے تین رول

 اپنے جوہر (Potential) کی تلاش

 سر، آپ کا شکریہ

 مس/ میڈم آپ کا شکریہ

 شخص اور شخصیت

Person vs Personality

 مقام اور کام

Position vs Performance

مٹی کا دیا اور دسمبر کا گلاب

(ایک استاد کی Self-image)

میں
مٹی کا
وہ دیا ہوں
جس کی دھیمی لو
اندھیرے میں
کسی درماندہ مسافر کا
انتظار کرتی رہتی ہے

میں سرد ہواؤں میں
کھلا
دسمبر کا
وہ گلاب ہوں
جس کی خوشبو
خزاں میں بھی
باقی رہتی ہے
باوجود خزاں
بوئے یاسمن باقیست
مجھے خدا نے
ایسا
بنایا ہے

کہ
مجھ سے
بچے کی
کوئی کمی
نہیں دیکھی جاتی
مزہ تو جب ہے کہ
گرتوں کو
تھام لے ساقی

مجھے
کوئی بچہ
اجنبی نہیں لگتا
خواہ وہ
کسی گھر میں
پیدا ہوا ہو
میرے ربّ نے
میرے Self کے
دائرہ کو
بہت Extend
کر دیا ہے
لاتقنطوا (سورۃ الزمر، آیت 53

کبھی مایوس نہ ہو

میں
وہ انسان ہوں
جو کبھی
مایوس نہیں ہوتا
نہ
اپنے آپ سے
اور نہ
کسی اور سے
ان سے بھی نہیں
جو
بار بار
مایوس
کرتے رہتے ہیں
بعض
زمینوں میں
سونے کے ذرات
ذرا گہرائی میں
ملتے ہیں
بعض
تناور درختوں
کے بیج
ذرا دیر میں
پھوٹتے ہیں
میں سنگلاخ
چٹانوں میں
بیج
ڈالتا رہا ہوں
بارش کے
پہلے قطرے کے
انتظار میں
پتھروں کا سینہ
Patience
شق کر دیتی ہے
محبت
بہار کے موسم کی طرح
اپنے پھول
اپنے ساتھ لاتی ہے
میں کہ ہوں
چراغِ آخرِ شب
میرے بعد
اجالا ہے
اندھیرا نہیں



خودکلامی

(ایک استاد کی Self-Image)

استاد
دوقسم کے ہوتے ہیں
Impressive
اور Inspiring
میرا تجربہ ہے
جو استاد
دل میں اُتر جائے
آخرکار
Teaching بھی اسی کی
Effective ہوتی ہے
میں جانتا ہوں
کلاس میں
استاد کے قدم رکھتے ہی
اور پہلا لفظ
ادا کرنے سے پہلے
اس کے Attitude کا
Message
طالب علم تک
پہنچ جاتا ہے
طالب علم کے دل کا

ریڈار (Redar)
استاد کے
اندر کی
ہر تبدیلی کو
ریکارڈ
کرتا رہتا ہے
لمحہ بہ لمحہ
اور کبھی
غلطی نہیں کرتا
سچ ہے
علم کی کمی
خلوص سے پوری ہو جاتی ہے
لیکن
خلوص کی کمی
کسی چیز سے
پوری نہیں ہوتی
مجھے احساس ہے
آج کا طالب علم
جو
Knowledge کے

Explosion میں
سانس لیتا ہے
Mentally بڑا
Sharp اور
Acutely Sensitive ہے
وہ نہ صرف
استاد کی
Competencies کو
مسلسل
تولتا رہتا ہے
بلکہ اس کی نظر
استاد کی شخصیت
اس کے Life Style
اس کی Values
پر بھی رہتی ہے
اپنے مشاہدہ کی
روشنی میں
ہر روز
میں اپنے آپ کو
یاد دلاتا رہتا ہوں
کہ استاد کی کوئی خصوصیت
کوئی Quality
ذہانت، ذاتی وجاہت
Talent Glamour
Acadamic Excellence
Professional Expertise
تجربہ۔Experience یا
Seniority/rank/grade
اس کو
اس کے Students کی
نظروں سے
گرنے سے
نہیں بچا سکتی
اگر وہ انہیں
اپنی Performance سے
متاثر نہیں کرتا
اگر وہ انہیں اپنے
Commitment سے
Inspire نہیں کرسکتا
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے
ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا
تو پھر لہو کیا ہے
Achievement کی اہمیت
اپنی جگہ
لیکن
میں زیادہ اہمیت
Effort کو دیتا ہوں
کہ انسان کی ذمہ داری
کوشش ہے

کامیابی نہیں
زندہ ہر ایک چیز ہے
کوشش ناتمام سے
ماحول کے Constraints
اپنی جگہ
لیکن ماحول کا
کوئی Constraint
انسان کے
Conviction سے بڑا
نہیں ہوتا

رکاوٹ کی کوئی دیوار
انسان کے حوصلہ
سے زیادہ
اونچی نہیں ہوتی
پھر، ایک ہی طرح کے
Constraints میں بھی
ہر انسان کا Response
یکساں نہیں ہوتا
کرگس کا جہاں اور ہے
شاہیں کا جہاں اور



استاد کے تین رول (Role)

استاد
مدرس
Instructor
معلم
Educator
اور
مربی
Mentor
ہوتا ہے
بحیثیت مدرس
استاد
نصاب پڑھاتا ہے
معلم کی
حیثیت سے
استاد
طالب علم کو
سوچنا سمجھنا

معلومات اور علم میں
فرق کرنا
علم کو تلاش کرنا
سکھاتا ہے
اور
مربی کے
رول میں
استاد
طالب علم کو
آدمی سے
انسان
بناتا ہے
Character Building
کرتا ہے
اور اسے بناتا ہے
باعث
خیرِ کثیر!



اپنے جوہر (Potential) کی تلاش

(Self-actualization)

فرق ہے اچھے انسان
اور عظیم انسان میں
اچھی شاعری اور
عظیم شاعری میں
فرق ہے اچھے استاد
اور عظیم استاد میں
عظیم استاد
تعلیم کا
زندگی کا
ایک Vision رکھتا ہے
اس کی Creativity کا
ایک Focus ہوتا ہے
اس کے بھی کچھ اپنے
خواب ہوتے ہیں
وہ کسی جوئے شیر کی
تلاش میں
تیشہ زنی کرتا رہتا ہے
جوئے شیر و تیشہ و
سنگ گراں ہے زندگی
وہ جسے
اپنا Ideal
نہ ملے
دیر سویر
Reconcile کر ہی لیتا ہے
لیکن وہ
سفر نصیب جسے اپنی
Self-Image کی تعبیر
نہ مل سکے
جس کا
Creative Potential
بروئے کار نہ آ سکے
وہ زندگی بھر
ایک گھمبیر بے چینی
Divine Discontent
کے صحرا میں
بھٹکتا رہتا ہے
الجھ جاتا ہے
اور الجھاتا رہتا ہے
کوئی اور Pleasure
اسے

Pleasure نہیں لگتا
کوئی اور کامیابی
اس کی
کچھ Contribute
کرنے
کی پیاس
نہیں بجھا پاتی
میری پیاس
Self Actualization
کی پیاس ہے
میری پہچان
خوب تر کی
جستجوئے مسلسل
Quality Quest ہے
ہر صبح
میری اپنی Growth
کے لیے
ایک نیا پیام
لاتی ہے
ہر روز
میرے ذہن کا
ایک نیا دریچہ
کھلتا ہے
میں کوئی نئی بات
سوچتا ہوں
کوئی نیا
تجربہ کرتا ہوں
خبر سے
نظر کی طرف
میرا سفر
جاری رہتا ہے
قد افلح من زکّھا (سورۃ الشمّس، آیت:9)
بے شک وہ کامیاب ہے
جو اپنے نفس کے
امکانات
کو بروئے کار لایا
He is indeed successful
who causes it (the self)
to grow



سر، آپ کا شکریہ!

سر،
آپ نے ہمیں
Learning to Learn
Learning to Think
اور
Learning to Evaluate
کے معانی سے
آشنا کیا
سر،
آپ نے ہماری
Creativity
کو اُبھارا
آپ نے ہمیں
مطالعے،
مشاہدے،
تجربے،
تحقیق
Research
سے
علم کو
تلاش کرنا
سکھایا
Life long
Self-Learning
اور
Learning to Be
کی راہ پر
ڈالا
سر،
آپ کا شکریہ
بار بار شکریہ
God Bless You
Now and For ever
سر،
آپ نے اپنی زندگی سے،
اپنے لائف سٹائل سے
جو درس زندگی دیا
وہ کبھی پرانا
کبھی Irrelevant نہ ہوگا
اس کی قیمت

اس کی ضرورت
وقت کے ساتھ ساتھ
بڑھتی ہی جائے گی
اپنے رول ماڈل سے
درس زندگی دینا
جینے کا سلیقہ سکھانا
Art of Living سے آشنا کرنا
زندگی کی
Core Values
اور
Basic Life Skills
کی
Awareness دینا

پوری شخصیت کو
Build-up کرنا
پوری Self-Image کو
Positive
آب و رنگ دینا
کتنا ضروری
اور کتنا
بڑا کام ہے
میرے عظیم استاد
اور عظیم تر انسان
آپ کا شکریہ
آج بھی
اور تا زندگی!



مس/ میڈم آپ کا شکریہ!

مس/میڈم
آپ کے پڑھانے کے
سٹائل سے
ہمیں اندازہ ہوا
کہ
Creative Teaching
کیا ہوتی ہے
معلومات اور علم میں
کیا فرق ہے
اور کیا فرق ہے
علم حاصل کرنے میں
اور علم پیدا کرنے میں
مس/میڈم
آپ سے پڑھا
تو پتا چلا کہ
استاد کا رول ماڈل
Role Model
کیا ہوتا ہے
اور کیا فرق ہے
مدرس
Instructor
معلم
Educator
اور مربی
Mentor
میں
مس/میڈم
آپ کا شکریہ
آج بھی
اور تا زندگی
مس/میڈم
آپ کو دیکھا
تو ہم نے جانا کہ
حسنِ طبیعت
کیا ہوتا ہے
سوزِ دروں
کیا چیز ہے
خلوص کے
کیا معنی ہیں
Commitment

کسے کہتے ہیں
کیا فرق ہے
خبر میں اور
نظر میں
اور کیا
مطلب ہے
گرتوں کو تھام لینے کا
مس/میڈم
زندگی کے سفر میں
یہ آگہی
یہ Awareness
ہماری راہیں

مسلسل
روشن رکھے گی
کتنی بڑی بات ہے
ذہن کے دریچے کو کھولنا
کتنا عظیم احسان ہے
آدمی سے انسان بنانا
مس/میڈم
آپ کا شکریہ
God Bless you
God Bless you
Now and For ever



شخص اور شخصیت

(Person vs Personality)

فرق ہے
شخص
Person
اور شخصیت
Personality
میں
فرق ہے
ذاتی امتیازات
Personal
Attributes
اور شخصیتی
امتیازات
Personality
کی
Qualities
میں
ذاتی امتیازات
حسن صورت

ذہانت
Academic
Excellence
Professional
expertise
creative
talent
کی
Attraction
اور
ان کی اہمیت
اپنی جگہ
لیکن
teaching ہو
یا کوئی اور
دائرہ کار
Satisfying
ہونے کا تعلق

Personality
Profile
سے ہے
کسی کے ساتھ
زندگی
اس کے
Glamour
کسی
Personal
Social
Cultural یا
distinction
کے ساتھ
بسر
کی جاتی ہے
satisfying
personality
ہوتی ہے
کوئی اور
attribute
نہیں
خواہ وہ کتنا ہی
Impressive یا
attractive ہو
زندگی میں

سکون
ٹھہراؤ
روشنی
خوشبو
Personality
سے
آتی ہے
پھر
Personality
کو بھی
grow
کرنا
ہوتا ہے
گھر ہو
یا
دفتر
Career
کی
Vertical
movement ہو
یا
horizontal
movement
شخصیت یا
Personality

کی
growth
کے بغیر
بات نہیں بنتی
Personality
کی
growth کی
پہچان ہے
maturity
سمجھ
روشنی طبع
حسن طبیعت
سوز دروں
tolerance
patience
sence of
priorities
sense of

values اور
زندگی کا ایک vision
ہر دائرہ میں
effective
performance
اور
effective
role-model
بننے
کی
پہلی ضرورت ہے
Personality
ripeness کی
richness
روشنی!
اے روشنی!
personality
o, personality!



مقام اور کام

(Position vs Performance)

فرق ہے
مقام
Position
اور
کام
Performane میں
کسی
Social
System
میں
کسی کی
Low
یا
High
Placement
اسے
ازخود
چھوٹا

یا
بڑا
نہیں بنا دیتی
عہدہ/گریڈ/رینک
پہچان ہے
تقسیم کار کی
کسی سسٹم میں
ذمہ داری کی
نوعیت کی
it's an
Administrative
Arrangement
دراصل
All seniority
is
functional
انسان
چھوٹا

یا
بڑا
بنتا ہے
اپنی
Performance
کے
حوالے سے
اپنی
کارکردگی سے
اپنی سوچ سے
اپنے
رویوں سے
اپنی
شخصیت سے
جو اس کی
Performance
کے پیچھے
ہوتی ہے
آخرکار
انسان کی
پہچان
اس کی
Performance
بنتی ہے
Position
یا
Placement کی

ہر بلندی اور
ہر پستی
آخرکار
Level
ہو جاتی ہے
یاد
خوشبو
روشنی
صرف
Performance کی
باقی
رہتی ہے
عزت
آبرو
ذہنی سکون
Confidence
Competence
قوت
برکت
Performance
oriented
زندگی
میں ہے
جوئے شیر و
تیشہ و
سنگ گراں ہے زندگی!

بچوں کی تربیت

ہماری رنگا رنگ دنیا میں ایسی چیزوں کی کیا کمی ہے جنہیں دیکھ کر آدمی اچھنبے سے انگلی دانتوں میں دبائے مگر آدمی کے بچے سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والی شاید اور کوئی چیز نہیں۔ کسی اور جاندار کا بچہ شاید اتنا بے بس نہیں ہوتا نہ اتنے عرصے تک اپنے ماں باپ اور بڑوں کا منہ تکتا رہتا ہے۔ کوئی اور بچہ اپنی ساری قوتوں کو پوری ترقی دینے میں اتنی دیر نہیں لگاتا۔ پہلے تو اس کی بے بسی اور سست رفتاری پر ہنسی آتی ہے۔ پر ذرا سوچیے تو خیال ہوتا ہے کہ اپنی دنیا کا حاکم اور بادشاہ انسان کا بچہ ہے۔ شاید قدرت چاہتی ہے کہ بڑا ہوتے ہوتے اس بادشاہت کے کام کے لائق ہو جائے اس لیے اس کا نصابِ تعلیم اتنا لمبا رکھا گیا ہے۔ اس کے جسم کی ترقی تک میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے خاص اہتمام کیا ہے کہ کام خوب پکا ہو، جلد بازی میں خراب نہ ہو جائے۔ کچھ بڑھتی ہے پھر رکتی ہے گویا ہر قدم پر پختگی کا پورا پورا انتظام کرتی چلتی ہے۔ پہلے سال بچہ بڑی تیزی سے بڑھتا ہے مگر دو سال سے پانچ سال کی عمر تک قدرت رفتار کو سست کر دیتی ہے۔

پہلے سال کے کھنچاؤ کے بعد یہ بھراؤ کا زمانہ ہوتا ہے۔ پانچ سال سے سات سال تک بچہ پھر تیزی سے بڑھتا ہے یہ کھنچاؤ کا دوسرا زمانہ ہے۔ جس کے بعد سات سال سے گیارہ برس تک پھر بھراؤ کے لیے رکھے ہیں۔ اس کے بعد ایک بار پھر کھنچاؤ ہوتا ہے اور اسی سے متصل ایک بھراؤ کا دور آتا ہے جو اسے ترشا ترشایا ولولے اور امنگ والا نوجوان بنا دیتا ہے۔ غرض قدرت اپنا کام خوب ٹھوک بجا کر کرتی ہے۔ اس لیے کہ یہی تو اس کے خزانوں کا مالک ہے اور یہی اس کی دنیا کا سردار۔

ہاں، غریب قدرت بہت کچھ کر دیتی ہے مگر سب کچھ تو نہیں کر سکتی۔ اس ننھی سی جان کو دنیا میں خدا کے خلیفہ کے رتبے تک پہنچانے کے لیے اس کے ماں باپ رشتہ دار اور ساری اردگرد کی انسانی دنیا کو بھی بہت کچھ کرنا ہوتا ہے اور اکثر اسی حصے میں کسر رہ جاتی ہے اور آدمی کے سپرد اپنے بچوں کی تربیت اور دیکھ بھال کا جو کام ہے اس میں وہ ایسی ایسی حماقتیں کر گزرتا ہے کہ اکثر قدرت کا منشا پورا نہیں ہو پاتا اور منشا پورا ہونا تو رہا دور ہمارے دیس میں تو لاکھوں بچوں کو پیدائش کے سال بھر کے اندر ہی اندر اس دنیا سے رخصت کر دیا جاتا ہے اور لاکھوں کو پانچ سال تک پہنچنے سے پہلے پہلے۔ جو بچ رہتے ہیں وہ ابا جان کی نادانی، نانی اماں کے لاڈ پیار کا تختہ مشق بنتے ہیں۔ ذہن میں طرح طرح کی گتھیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ جو عمر بھر سلجھائے نہیں سلجھتیں۔ ان سے بھی کوئی بچ نکلے تو مدرسوں میں ایک سے ایک بقراط استاد پڑا ہوا ہے۔ وہ انہیں بنانے کی کوشش میں، جانوروں سے بدتر درجہ پر پہنچا دیتا ہے۔

جب یہ دنیا میں خدا کی خلافت کا کاروبار سنبھالنے نکلتے ہیں تو نہ تن درست ہوتا ہے نہ من، نہ ولولہ نہ امنگ، نہ ہمت نہ یقین، ڈرے ڈرے سہمے سہمے، ہر چیز سے خوف، ہر چیز کا شبہہ، نہ کسی سے لگاؤ نہ کسی پر بھروسہ، نہ کام کا شوق، نہ تفریح کا سلیقہ، کچھ کرتے بھی تو غلاموں کی طرح سزا کے ڈر سے یا انعام کے لالچ سے۔ نہ اپنے اردگرد کی حقیقتوں سے آشنا، نہ ان سے دو چار ہونے کی قابلیت، خیالی پلاؤ پکاتے ہیں اور ہوائی منصوبے گانٹھتے ہیں، جنہیں قدم قدم پر زندگی کی سخت حقیقت پاش پاش کر دیتی ہے۔ یہ زندگی کو بیکار جاننے لگتے ہیں اور زندگی ان سے بیزار رہتی ہے۔ دنیا ان کے لیے قید خانہ اور یہ دنیا کے لیے عذاب۔

اس بدحالی کو اور بڑوں کی مداخلت سے چھوٹوں کی زندگیاں تلخ اور بے اثر ہوتے دیکھ کر، بعض نیک دل لوگ تو یہ تک کہنے لگے ہیں کہ بچوں کی تربیت کے لیے کچھ کرنا ہی نہ چاہیے۔ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو کہ کچھ نہ کچھ ہو ہی رہیں گے۔ اس خیال میں کچھ تو ماں باپ اور استادوں کی غفلتوں اور غلطیوں پر بجا غصے کی آمیزش ہے۔ مگر ساتھ ہی آزادی کے فلسفے کی، نظروں کو چکا چوند کرنے والی چمک کا بھی تھوڑا بہت میل ہے۔ جس کی تیز روشنی کبھی کبھی غریب تاریکی میں رہنے والوں کی رہی سہی نظر کو بھی ختم کر ڈالتی ہے اور یہ بیچارے بے سمجھے الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنس کر نہ اِدھر کے رہتے ہیں نہ اُدھر کے۔

بچوں پر طرح طرح کی پابندیوں کے یہ نتائج دیکھ کر بہت سے اچھے سمجھ دار لوگوں نے ان پابندیوں کو کم کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے جو اپنی جگہ پر ٹھیک بات ہے۔ مگر اس سے ہمارے یہاں کے خیالوں کے اچکے نہ جانے کیا سمجھ لیتے ہیں اور لگتے ہیں تلقین کرنے کہ بس بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ ہاں چھوڑ سکتے ہیں تو ضرور چھوڑ دیجیے۔ مگر آپ کا ننھا ایک تندرست بچے کی ساری قوتیں لے کر دنیا میں آیا ہے۔ یہی کوئی بیس بائیس ہزار سال کی عمر پاتے پاتے تہذیب و شائستگی کے اس مرتبہ پر پہنچ جائے گا جس پر خیر سے آپ ہیں کہ اپنی موجودہ حالت پر پہنچنے کے لیے کہتے ہیں کہ انسانیت کو کم و بیش اتنا ہی زمانہ لگا ہے۔

اس مدت پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ آپ جانتے ہیں کہ امریکہ کے لوگ دنیا کے سارے نو دولتیوں کی طرح ہر چیز کی قیمت بہت پوچھا کرتے ہیں۔ ایک امریکی کروڑ پتی ایک مرتبہ آکسفورڈ پہنچے۔ کہتے ہیں کہ آکسفورڈ کے ہرے ہرے لان بہت ہی اچھے ہیں۔ امریکن کروڑ پتی صاحب ان پر چلے تو ریجھ گئے۔ فوراً جیسے کسی نے بٹن دبا دیا ہو، یہ سوال منہ سے نکلا:

''ایسے لان کتنے میں یہاں تیار ہو جائیں گے؟''

ساتھ جو پروفیسر صاحب تھے انہوں نے کہا:

''میں تو علم الانسان کے شعبے کا صدر ہوں، ان تفصیلات سے بالکل ناواقف ہوں، آپ کہیں تو مالی کو بلا دوں۔ آپ اس سے دریافت فرما لیں۔''

''بلائیے۔''

مالی آیا۔ کروڑ پتی صاحب نے کہا:

''ہم بالکل ایسا ہی لان اپنے یہاں چاہتے ہیں۔ کتنے میں تیار ہو جائے گا؟''

مالی نے کہا:

''صاحب! اس میں کتنے کا کیا سوال ہے، کوڑیوں میں تیار ہوتا ہے، کوڑیوں میں۔ زمین تو آپ کے پاس ہو گی ہی، ذرا اچھی طرح ہموار کرا لیجیے گا، اس پر گھاس جما دیجیے گا۔ جب گھاس ذرا بڑھ جائے تو اسے کاٹ کر اوپر سے رولر پھیر دیجیے گا اور بس یہی کوئی سمجھیے پانچ سو برس کرتے رہیے گا۔ ایسا لان تیار ہو جائے گا۔''

ہاں تو اسی طرح اگر بچوں کو آزاد چھوڑ کر کوئی صاحب ان کی صحیح تربیت کرنا چاہیں تو

ان بچوں کو بیس ہزار سال زندہ رکھنے کی تدبیر کر لیں۔ حالات موافق ہوئے اور اللہ نے چاہا تو اس عمر کو پہنچتے پہنچتے خاطر خواہ نتیجہ نکل آئے گا۔ اس وقت تو ہمارا خیال یہی ہے کہ بچوں کو مدد کی ضرورت ہے۔ ہدایات کی ضرورت ہے۔ ہمدردی اور محبت کی ضرورت ہے۔ سمجھنے سمجھانے کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کام مشکل ہے پر صرف سہل کام ہی تو کرنے کے نہیں ہوتے۔ پچھلے دنوں بچے کی جسمانی نشو و نما، اس کی ذہنی ترقی اور نفسی حالت کے متعلق بہت کچھ چھان بین ہوئی ہے۔ اگر والدین اور استاد اپنے کام کی اہمیت کو سمجھیں اور سوچیں کہ انسان کی تھوڑی سی توجہ سے دنیا میں کتنی مصیبت گھٹ سکتی ہے اور کتنی خوشی بڑھ سکتی ہے تو وہ ضرور ان تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر اپنا کام سمجھ بوجھ کر انجام دیں گے۔

اس وقت ان تحقیقات کا موقع نہیں ہے۔ مختلف عمر کے بچوں کی صحت کے لیے کیا تدبیریں کرنی چاہئیں۔ ان کے لیے غذا کون سی مناسب ہے۔ ان میں سونے جاگنے، کھانے پینے، پیشاب پاخانے کے اوقات کی پابندی کی عادتیں کس طرح ڈالنی چاہئیں۔ یہ معمولی باتیں آپ جانتے ہی ہیں۔ میں تو اس وقت صرف ان ہی گتھیوں کا ذکر کرتا ہوں جو اکثر والدین اور سرپرست بے چارے اپنے بچوں کے ذہن میں ڈال دیتے ہیں اور اس میں بھی بس چند موٹی موٹی باتیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ننھا بچہ بھی ایک شخصیت رکھتا ہے۔ وہ کوئی بے جان چیز نہیں۔ جب لوگ اسے گڑیا یا کھلونے سے زیادہ نہیں سمجھتے ہیں تو یہ اسی وقت سے چپ چاپ اپنے لیے کوئی مقصد کوئی منزل مقرر کر لیتا ہے اور اس تک پہنچنے کی برابر کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ساری دنیا کو اس مقصد کی روشنی میں دیکھتا ہے اور اگر اپنے اردگرد کے حالات کو غلط سمجھ کر یہ مقصد مقرر کر لیتا ہے تو ساری دنیا کو غلط سمجھنا پڑتا ہے۔ اپنے چھوٹے ہونے، کمزور ہونے، بڑے بھائی سے چھوٹے ہونے یا چہیتے بھائی کی بدصورت بہن ہونے، ماں باپ کے حقیر سمجھنے، غرض طرح طرح کی کمیوں کا اسے احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس اس کے تخیل کو حرکت دیتا ہے۔ وہ اپنی حالت کو سدھارنے اور اپنی حیثیت کو ابھارنے لگ جاتا ہے۔ کمی کا احساس اور اس کی تلافی کی کوشش، یہ دو چیزیں اس کی زندگی کا مرکز ہوتی ہیں۔ ان میں غلطی ہوتی ہے تو ساری زندگی غلط راہ پر پڑ رہتی ہے۔

ماں باپ کی طرف سے تربیت کی بنیادی غلطیاں یہ ہوتی ہیں کہ وہ یا تو بچے میں کمی اور گھٹیا پن کا احساس غیر ضروری شدت سے پیدا کر دیتے ہیں یا تلافی کی کوششوں میں حائل

ہوتے ہیں، انہیں غیر معمولی طور پر اُکسا کر غلط راستے پر جانے دیتے یا ڈال دیتے ہیں۔ کمیوں کا صحیح احساس ہو اور تلافی کی مناسب تدبیر...... تو بچے کی تربیت ٹھیک ہو مگر ان میں سے کسی میں زیادتی ہوئی اور توازن بگڑا۔ مثلاً ماں باپ کی بات چیت سے، ان کے عمل سے، ان کی سختی، لعنت ملامت سے، اگر بچے میں اپنے گھٹیا اور کم درجہ ہونے کا احساس زیادہ قوی ہو جائے تو وہ اس سے بچنے کی نت نئی تدبیریں کرتا ہے۔ آگے بڑھنا چاہتا ہے، بہتر بننا چاہتا ہے، توجہ اپنی طرف منعطف کرانا چاہتا ہے۔ یہ سب اپنی جگہ پر ٹھیک ہے لیکن اگر حد مناسب سے بڑھ جائے تو اسی سے بچے میں کینہ اور حسد پیدا ہو جاتا ہے۔

ایسے بچے اپنے مقابلے والوں کی، بھائی کی، بہن کی، دوسرے بچوں کی بُرائی چاہنے لگتے ہیں۔ اپنی قدر بڑھانے کے لیے دوسروں کی چغلیاں کھاتے ہیں، ان پر جھوٹے الزام لگاتے ہیں، ان کے راز فاش کرتے ہیں اور بعض صورتوں میں تو یہ جذبہ مجرمانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے اور ننھے منے بچے دوسرے بچوں کو جسمانی نقصان پہنچانے سے بھی نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ ماں باپ اور عزیز بچے کی آگے بڑھنے کی خواہش کو بے جا طور پر اُبھار کر، اس کے حوصلے کی شدت کو اور دوسروں سے بڑھ کر رہنے کی خواہش کو مرض کے ہر درجے تک پہنچا دیتے ہیں۔ اپنے بچے کو درجے کے امتحان میں اوّل نمبر پر دیکھنے کی بے معنی خواہش نہ جانے کتنے بھلے مانسوں سے یہ کراتی ہے۔ اس مصنوعی اکساؤ سے بچے کی ذہنی حالت میں ایک تناؤ پیدا ہو جاتا ہے جس کو وہ زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کر سکتا۔ اس جزوی مقصد کے حصول کے لیے جس پر بڑوں نے توجہ جما دی ہے اور جس کامیابی سے ان کو آفریں و تحسین مل سکتی ہے۔ یہ بچہ اپنی ساری قوت اسی پر صرف کرتا ہے۔

امتحان میں اوّل آنا ہے تو بس کتابیں ہیں اور یہ ہے۔ نہ کھیل کی سدھ نہ ورزش کا دھیان۔ ساری دنیا تج دی جاتی ہے۔ کچھ دن دوسروں کی امیدوں کو پورا کرنے میں لگا رہتا ہے۔ مگر ان کی بوجھل اور یک طرفہ توقعات کا بار اس کے کمزور شانوں کے لیے ضرورت سے زیادہ ثابت ہوتا ہے لیکن دوسروں سے داد لینے کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ اس لیے چھوٹی چھوٹی فرضی باتوں میں کامیابی حاصل کر کے ان کا اشتہار کرتا ہے۔ جب یہ امکان بھی ختم ہو چکتا ہے تو بسا اوقات بالکل نئی راہ امتیاز کی اختیار کرتا ہے کہ بغیر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیے اسے چین نہیں آتا۔ سوچتا ہے بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا۔ گھر سے غائب رہنے لگتا ہے۔

مدرسہ سے بھاگتا ہے، مار پیٹ ہونے لگتی ہے۔ اسے بھی شہرت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس جیسی مصیبت میں مبتلا اور لڑکے بھی ہوتے ہیں، ان کے گروہ میں جا ملتا ہے۔ ان کی سرداری کے لیے مجرمانہ کارروائیوں تک اتر آتا ہے اور یہ سب کیوں؟

اس لیے کہ والد صاحب کو سخت اصرار تھا کہ بچہ اوّل نمبر پاس ہو، لطف یہ ہے کہ اکثر معلموں، ڈاکٹروں، وکیلوں، غرض تعلیم یافتہ باپوں کے بچے اس مصیبت میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔ غالباً اس لیے کہ ان علمائے وقت کو اوّل نمبر پاس ہونے والے بیٹے کا باپ ہونا بہت پسند ہوتا ہے۔

اس کے بالکل مخالف ایک غلطی والدین اور بڑوں سے یہ ہوتی ہے کہ وہ بچے کو حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ اپنی بزرگی جتانے کے لیے انہیں بے چارہ بچہ ہی ملتا ہے۔ ''احمق ہے''، ''گدھا ہے''، ''نکما ہے''، ''کسی مصرف کا نہیں''۔ غرض بات بات پر بچے پر برسے پڑتے ہیں، اسے شرمندہ کرتے ہیں۔ سب کے سامنے اس کے عیب گنواتے ہیں۔ اسے ذلیل کرتے ہیں۔ یہی بچے جن پر بزرگوں کی یہ توجہ ہوتی ہے بڑے ہو کر کسی چیز کو اچھا نہیں سمجھتے۔ ہر ایک کو اٹکاتے ہیں۔ نہ کسی کی تعریف کرتے ہیں نہ سن ہی سکتے ہیں۔ بچپن میں انہیں ذلیل کیا گیا تھا اب یہ اس کا بدلہ لیتے ہیں اور سب کو بُرا سمجھتے ہیں۔ دنیا سے ان کی ان بن رہتی ہے۔ بچے کو بچپن میں ذلیل اور مایوس کر کے بزرگ اس کی ساری زندگی کو تلخ بنا سکتے ہیں۔

بچپن میں بعض مواقع ایسے آتے ہیں کہ بچے میں اپنی کمیوں کا، دوسروں سے ادنیٰ ہونے کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہی وقت بچے کو سہارا دینے کا ہوتا ہے۔ اس وقت ذرا سی غفلت سے اس کی نفسی زندگی کو اکثر ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

میری یہ باتیں سن کر شاید کوئی صاحب فرمائیں کہ یہ عجیب معاملہ ہے۔ بچے کی ہمت بڑھائیے تو آپ خفا، اسے بُرا کہیے تو آپ ناخوش۔ آپ بھی خوب ہیں۔ ہاں! کیا کیجیے، معاملہ کچھ یوں ہی ہے۔ نہ ضرورت سے زیادہ تعریف بچے کے لیے اچھی ہے نہ بے جا مذمت۔ نہ اتنا گرائیے کہ پھر قدم ہی نہ اٹھا سکے۔ نہ اتنا چڑھائیے کہ زمین پر قدم ہی نہ رکھے۔

مختصر سی بات ہے بشرطیکہ ذہن نشین ہو جائے۔ بچے کو خدا کا بندہ سمجھیے۔ نہ وہ آپ کی ملکیت ہے نہ آپ کا کھلونا۔ آپ کے پاس خدا اور انسانیت کی امانت ہے۔ اس میں جو

صلاحیتیں قدرت نے رکھی ہیں انہیں نہ بہت اکسا کر خراب کیجیے نہ دبا کر اور ہاں اس بات کا دوسرا پہلو بھی یاد رہے کہ اگر بچہ آپ کا کھلونا نہیں ہے تو آپ بھی بچے کا کھلونا نہیں ہیں۔ آپ بھی خدا کے بندے ہیں۔ بس ذرا زیادہ تجربہ کار۔ نہ آپ اس پر ظلم کریں نہ وہ آپ پر۔ نہ آپ اس سے کھیلیں نہ وہ آپ سے۔ دونوں میں ایک دوسرے پر بھروسہ ہو، محبت ہو اور اگر خدا دے تو آپ میں ذرا تھوڑی سی زیادہ سمجھ اور بس!

بچے کی ذہنی زندگی میں دو چیزوں پر خاص دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ ایک اس کے احساس پر کہ وہ اوروں سے کم ہے اور دوسرے اس کمی کو دور کرنے کے لیے اس کی کوششوں پر۔ ان ہی دو چیزوں سے اس کی ذہنی زندگی کا سانچہ بنتا ہے۔ ان ہی میں اسے سہارے اور مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور اس میں ماں باپ سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ ماں سے یہ غلطیاں عام طور پر خاص خاص موقعوں پر ہوتی ہیں۔ ماں باپ ان سے آگاہ ہو جائیں تو شاید ان غلطیوں سے بچنے میں آسانی ہو۔

سب سے پہلے تو ان غلطیوں سے بچنے کی ضرورت ہے جو ماں باپ اس وجہ سے کرتے ہیں کہ انہیں یا تو اپنے بچے کی ان جسمانی خرابیوں کا علم نہیں ہوتا جو وہ ساتھ لے کر پیدا ہوا ہے۔ یہ علم ہوتا بھی ہے تو وہ ادھر توجہ نہیں کرتے اور ان کمیوں کی وجہ سے بچے کو جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان کا ذرا خیال نہیں کرتے۔ کتنے بچے ہیں جو آنکھ کی پیدائشی خرابیوں کی وجہ سے کبھی بلا تکلیف لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ کسی کو دوہرا دکھائی دیتا ہے۔ کسی کے سر میں پڑھنے سے درد ہونے لگتا ہے۔ یہ بچے جب پڑھنے لکھنے میں اوروں سے پیچھے رہتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ان کی اصلی مشکل کو حل کیا جائے، انہیں بُرا بھلا کہا جاتا ہے، سزا دی جاتی ہے۔ بچہ اپنے قصور کو سمجھتا نہیں۔ سزا کو ظلم جانتا ہے اور مقدور بھر اس سے بچنے کی کئی نئی تدبیریں نکالتا ہے۔ یا اپنی نا اہلی کا یقین کر کے محنت اور توجہ سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔

آپ کو تعجب ہوگا کہ بچوں میں بہت بڑی تعداد خلقی طور پر بائیں ہتھوں کی ہوتی ہے۔ آپ کا جی آزمانے کو چاہے تو بچوں کی کسی جماعت سے کہیے کہ اپنے پنجے میں پنجہ ڈالو۔ جن بچوں کا بایاں انگوٹھا سیدھے انگوٹھے کے اوپر ہو وہ خلقی بائیں ہتھے ہوں گے۔ یہ طریقہ سو فیصدی سچا نہیں لیکن تقریباً ٹھیک نتیجے بتا سکتا ہے۔ ان بے شمار بائیں ہتھے بچوں کو رہنا سہنا دائیں ہتھوں کی دنیا میں ہے۔ گزر کرنے کو تو کرتے ہی ہیں لیکن ان کی دشواری کا کچھ اندازہ

کرنا چاہیے اور ان سے کچھ تو ہمدردی ضروری ہے۔ اگر آپ ہندوستان سے جہاں سڑک پر بائیں ہاتھ کو بچتے ہیں جرمنی جائیں جہاں داہنے کو بچنا ہوتا ہے تو آپ کو ان غریب بچوں کی دشواری کا کچھ اندازہ ہوگا۔ جہاں قدم قدم پر کسی نہ کسی سے معافی مانگنی پڑے گی یا ڈانٹ سننی ہوگی۔ اگر خود اپنی موٹر کار چلا رہے ہوں تو خدا جانے کیا گزرے گی۔ مگر اس سے بہت زیادہ مصیبت ان بائیں ہتھے بچوں کو آپ دائیں ہتھی دنیا میں اُٹھانی پڑتی ہے۔

سیدھے ہاتھ لکھنا سکھایا جاتا ہے۔ جب اچھا نہیں لکھتے تو بُرا بھلا سننا پڑتا ہے۔ کیا تعجب کہ بہتیرے بھلے مانسوں کا خط ایسا خراب ہوتا ہے کہ تحریر بھی بعض لوگوں کی تقریر کی طرح رازوں کو چھپانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ یہ بچے کوشش سے سیدھے ہاتھ سے لکھنے کی پوری مشق بہم نہیں پہنچا سکتے۔ بعض مشہور مصور جو سیدھے ہاتھ سے کام کرتے تھے خلقی بائیں ہتھے تھے۔ مگر ضرورت اس کی ہے کہ دشواری کو سمجھ کر بچوں کی ہمت افزائی کی جائے۔ الٹی ڈانٹ سے انہیں ضد یا کم ہمتی کا سبق نہ دیا جائے۔ یہی حال آنکھ کان کے بہت سے نقائص کا ہے۔ پیدائشی نقائص کے بعد بچے کی آئندہ ذہنی نشو ونما کے لیے خطرے کا ایک وقت وہ ہوتا ہے جب اس کا دودھ چھڑاتے ہیں۔ عموماً جس طرح دھوکا دے کر، ڈرا دھمکا کر دودھ چھڑاتے ہیں۔ ماں اس زمانے میں جس طرح بچے سے چھپی چھپی الگ الگ رہتی ہے۔ وہ بچوں میں ماؤں کی دنیا کی طرف سے ایسی بے اعتباری پیدا کرنے کا سامان ہوتا ہے جو اکثر ساری عمر ساتھ نہیں چھوڑتا۔ ماں کی گود اور ماں کا دودھ یہی تو بچے کی ساری لذت ومسرت کی کائنات تھی۔ ان چالوں سے ان سے محروم کیا جاتا ہے تو جس پر بچہ سب سے زیادہ بھروسہ کرتا تھا اس پر شبہ کرنے لگتا ہے۔ دودھ چھڑانے کے ساتھ یہ ضروری نہیں کہ ماں بچے سے الگ الگ دور دور بھی رہے اور اسے اپنی محبت سے اور اپنی گود کی روح پرور حرارت سے بھی محروم کرنا چاہیے۔ اس زمانے میں تو بچے سے اور زیادہ محبت کی ضرورت ہے تاکہ بچہ اپنی زندگی کے اس پہلے انقلابی تجربے کے اثرات پر سے آسانی کے ساتھ گزر سکے۔

ایک اور خطرے کا وقت وہ ہوتا ہے جب بچہ بولنا شروع کرتا ہے۔ بولنا جماعتی فعل ہے اور بولنے کی صلاحیت جماعتی احساس سے فروغ پاتی ہے۔ جو بچے دوسروں سے بلا جھجک ملتے ہیں وہ جلد بولنا سیکھتے ہیں۔ جو ٹھٹکے ٹھٹکے اکیلے رہتے ہیں وہ دیر میں اور بچوں کا یہ ٹھٹکنا اور جھجکنا بے وجہ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ بھی بھروسہ کی کمی ہوتی ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس

زمانہ میں بچوں کو ملنے جلنے کا موقع دیا جائے۔ ان کی ہمت بڑھائی جائے اور خود مختاری کے ساتھ رہنے کی عادت ڈالی جائے۔ کھیل کود اور سہل سہل کام کرنے کے موقعے نکالے جائیں تاکہ ان میں کامیابی سے ان کی ڈھارس بندھے اور اپنے اوپر بھروسہ بڑھے اور اپنے گھٹیا رہنے کے خیال اور اوروں سے کم رہنے کے احساس پر غالب آسکیں۔

بعض ماں باپ خصوصاً مال دار اپنے بچوں کے اوپر اتنے خدمت گار مسلط کر دیتے ہیں اور لاڈ پیار میں وہ اہتمام فرماتے ہیں کہ غریب کو اپنی ضرورتوں تک کے اظہار کا موقع نصیب نہیں ہوتا۔ اظہار سے پہلے ہی کوئی نہ کوئی اسے پورا کرنے پر آمادہ ملتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ اکثر بہت دیر میں بولنا سیکھتے ہیں اور وہ بھی واجبی واجبی۔ بدایوں کے وہ مشہور للا جو خاصی بڑی عمر تک اپنی انا کی انگلی تھامے باہر نکلتے تھے انہی باثروت کم نصیبوں میں تھے۔ یہی بات تھی کہ سِنِ شعور کو پہنچ گئے تھے اور تتلاتے تھے۔ کسی نے پوچھا:

''میاں صاحبزادے کیا پڑھتے ہو؟''

تو شرمائے، چہرہ لال ہو گیا، انا کے لہنگے سے منہ آدھا چھپا لیا اور بولے جی ہاں بولے:

''انا ٹو ہی بولے ٹھ دے ویلل ٹل پلتھا ہوں۔''

ہکلانے کی عادت بھی، اکثر بلا کسی عضوی خرابی کے بچپن میں اسی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسروں سے تعلق پیدا کرنے میں کسی کمی کے احساس سے، دوسروں کے اٹکانے سے، ماں باپ کے بُرا کہنے سے جھجک پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گفتگو کے ذریعے دوسروں سے تعلق پیدا کرنے میں کوئی سہولت پیدا ہو جائے مثلاً کسی لکھی ہوئی یا یاد کی ہوئی نظم کو پڑھنا ہو اور اس طرح خود سوچنا نہ پڑے اور مخاطب کی طرف سے توجہ ہٹا لینا ممکن ہو تو ہکلانے میں بہت کمی ہو جاتی ہے۔ اکثر ہکلانے والے غصہ میں بالکل نہیں ہکلاتے۔ خوب رواں رواں سناتے ہیں۔ عشق اور محبت کی خلوتوں میں بھی کہتے ہیں کہ ہکلاہٹ جاتی رہتی ہے۔ لیکن دوسروں سے تعلق پیدا کرنے کی دشواری کے علاوہ ایک اور وجہ ہکلاہٹ کی عادت پڑ جانے کی یہ ہوتی ہے کہ بچہ ہمیشہ دوسروں کی توجہ اپنی طرف کھینچنا چاہتا ہے۔ جو بچے شروع سے صاف بولتے ہیں ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا لیکن جن بچوں کی بولی میں کوئی نقص ہوتا ہے ان کی طرف سب توجہ کرنے لگتے ہیں۔ اسے چھیڑتے ہیں، اس پر ہنستے ہیں، اس کی نقل

کرتے ہیں۔ ناچار بچہ بھی اپنی بولی کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگتا ہے اور اس توجہ سے بولنا اور مشکل ہو جاتا ہے۔ بہت سے کام آدمی عادت کے طور پر بے تکلف کرتا ہے۔ اگر اس کی طرف توجہ ہو جائے تو کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس بات پر مجھے ایک دوست کا قصہ یاد آیا۔

یہ ناروے کے رہنے والے بہت بڑھے آدمی تھے۔ کوئی سترّ، پچھترّ کی عمر تھی۔ کئی سال ہوئے انتقال فرما گئے۔ کہیں گے، کہ کاہے کو یاد کیا۔ ان کی ڈاڑھی بڑی شاندار تھی۔ ایسی ویسی نہیں، پوری ناف تک اور نہایت گھنی سفید جیسے براق۔ ایک دن ریل میں بیٹھے جا رہے تھے۔ سامنے ایک خاتون بیٹھی تھیں اور ان کی آٹھ برس کی لڑکی۔ بچی پہلے تو کوئی منٹ تک ہرنیلزون کی طرف دیکھتی رہی پھر ماں کے کان میں کچھ کہا۔ ماں مسکرا کر چپ ہو رہی۔ اس نے پھر ماں سے کہا:

''پوچھوں۔''

ماں چپ رہی۔ پھر کہا:

''پوچھوں۔''

تو ماں نے کہا:

''پوچھ!''

بچی ہرنیلزون کے پاس ادب سے آ کر کھڑی ہوئی اور کہا:

''دادا ابا ایک بات پوچھوں؟''

ہرنیلزون نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا:

''بیٹی پوچھو۔''

بچی بولی:

''دادا ابا تم رات کو سوتے وقت یہ ڈاڑھی لحاف کے اندر رکھتے ہو یا باہر؟''

غریب دادا ابا نے بہت سوچا مگر سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں، آدمی سچے تھے کہہ دیا کہ

''بیٹی! یاد نہیں آتا۔''

خود بیان کرتے تھے کہ

''اس دن، دن بھر یہی دھیان رہا۔ رات ہوئی سونے لیٹا تو پہلے ڈاڑھی لحاف کے

اندر رکھی، جی گھبرایا، باہر رکھی۔ پھر بے کلی سی رہی۔ اسی اندر باہر میں تین پہر رات بیت گئی۔ آخر اُٹھ کر ایک صوفے پر بیٹھا پیروں پر کمبل ڈال لیا تو آنکھ لگی۔''

ہاں تو ہکلے بچے بھی جب اپنی بولی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تو بولنا اور مشکل ہو جاتا ہے اور کمزور یا کسی کمی کا احساس رکھنے والے بچوں کو اپنی اس نئی کمزوری سے بڑوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ایک اور وسیلہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ اسی طرح کمی کا احساس رکھنے والے بچے جب کوئی مثبت طریقہ اپنی کمیوں کی تلافی کا نہیں اختیار کر پاتے تو کچھ کمزوروں کی سیاست سے کام لیتے ہیں اور اوروں کو متوجہ کرنے کی منفی تدبیریں سوچتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کام میں سستی کرنے لگتے ہیں۔ بیمار بن کر پڑ جاتے ہیں کھانا نہیں کھاتے اور کچھ بن نہیں پڑتا تو بستر پر پیشاب کر دیتے ہیں۔ خصوصاً جس غذا کو ماں کھلانا چاہتی ہے اس سے انکار ہوتا ہے۔ ماں کی طرف سے خوشامد ہوتی ہے، پھر دھمکیاں، پھر ٹھکائی۔ ان کا مقصد سب سے حاصل ہوتا ہے۔ اوروں کو متوجہ کر لیا۔ رفتہ رفتہ غذا کی طرف سے ہی طبیعت میں ایک روک سی پیدا ہو جاتی ہے اور بچے کبھی کبھی واقعی بیمار ہو جاتے ہیں۔

بستر پر پیشاب کر دینے کی وجہ بھی عموماً کوئی عضوی خرابی نہیں ہوتی۔ بچے کا مثانہ اور آنتیں ٹھیک ہوتی ہیں۔ یہ تو بس ماں باپ یا استاد کی توجہ حاصل کرنے کی ایک چال ہوتی ہے۔ اس پر سزا دینے سے ضد یا توجہ حاصل کرنے کی کامیابی سے ایک غیر عقلی محرک پیدا ہو جاتا ہے جس کا عمل رفتہ رفتہ عادت بن جاتا ہے۔ اگر ان حالتوں میں طبی علاج کی جگہ ذہنی علاج کیا جائے یعنی بچے کی توجہ طلبی کو کسی اور طرح تسکین دی جائے، اس کا اعتماد حاصل کیا جائے، اسے ہمت دلائی جائے تو یقیناً زیادہ کامیابی ہو گی۔ برخلاف اس کے بچے کو اوروں کے سامنے شرمندہ کرنا بڑی غلطی ہے۔ اس سے بچے میں اپنے اوپر بھروسہ اور کم ہوتا ہے اور مرض گھٹنے کی جگہ بڑھتا ہے۔

پھر بچے کی تربیت کے لیے ایک کٹھن مرحلہ دوسرے بھائی بہن کی پیدائش کے وقت درپیش ہوتا ہے۔ جس خاندان میں بہت سے بچے ہوں وہاں سب سے بڑا بچہ ایک عرصے تک اکیلا بچہ ہوتا ہے۔ یہ شرف دوسرے بچوں کو حاصل نہیں ہوتا۔ جب پہلا بہن بھائی پیدا ہوتا ہے تو اس سے بڑے بھائی کو ایسا لگتا ہے کہ اس نووارد نے مجھے تخت سے اُتار دیا اور اس میں ابا اماں نے اس اجنبی کی مدد کی اور مجھ سے بے وفائی برتی۔ اس پر ماں باپ سے اور

نو وارد سے خفا ہوتا ہے تو کیا بے جا کرتا ہے اور اپنی کھوئی مملکت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے تو کیا تعجب اور یہی ہوتا ہے۔ میں ایک خاندان کو جانتا ہوں اس میں دو بچے ہیں ایک بھائی ایک بہن۔ بہن چھ برس چھوٹی ہے۔ بھائی کی عمر گیارہ برس کی ہے۔ باپ انشورنس کمپنی کے ایجنٹ ہیں۔ ہمیشہ دورے پر رہتے ہیں۔ شادی کے بعد چار برس بے اولاد گزرے۔ بڑی دعاؤں منتوں، تعویذ گنڈوں اور علاج معالجے کے بعد بچہ پیدا ہوا۔

ظاہر ہے ماں کی آنکھ کا تارا تھا۔ اس نے جو چاہا وہی ہوا۔ بچے کی ماں لکھی پڑھی سلیقے مند بی بی ہے۔ بچے کی ابتدائی تربیت اچھی ہوئی تھی۔ تیسرے درجے تک مدرسے میں خوب شوق سے پڑھنے جاتا تھا۔ سب امتحانوں میں پاس ہوتا تھا۔ ادھر دو برس سے حال ہی کچھ اور ہے۔ ماں کو طرح طرح سے دق کرتا ہے۔ مارتا ہے، بال کھینچتا ہے، مہمانوں کے سامنے خاص طور پر بدتمیزی کرتا ہے۔ کپڑے پھاڑتا ہے۔ میلا رہتا ہے۔ استاد برابر شکایت لکھ لکھ کر بھیجتے ہیں۔ اب سمجھیے معاملہ کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ بہن نے اس کی زندگی کا سانچہ بدل ڈالا۔ اس کا آنا ہی ناگوار تھا۔ جب یہ تین سال کی ہوئی اور اپنے میٹھے میٹھے بولوں سے ماں کا دل لبھانے لگی یہ مدرسے میں رہتا اور وہ ماں کی گود میں۔ باپ بھی دورے سے آتے تو اسی سے باتیں زیادہ کرتے۔ یہ ناقابل برداشت تھا۔ اب یہ اسے بہن کیسے سمجھتا۔ اسے رقیب جانتا ہے، مدمقابل گردانتا ہے۔ اس کا تخت چھن گیا۔ آپ چاہتے ہیں کہ وہ کوئی تدبیر نہ کرے۔ اسی تخت کو پھر سے پانے کے لیے یہ طفلانہ جتن کرتا ہے۔ یہ کوششیں بے شک طفلانہ ہیں۔ آپ کا جی چاہے ان پر ہنسیے۔ اس کے دل سے پوچھیے اسے یہی تدبیر آتی ہے۔ ایسی بدتمیزی سے ماں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ استادوں کی خراب رپورٹوں سے خوش ہوتا ہے اس لیے کہ ایک مرتبہ کسی استاد نے کہہ دیا تھا کہ

''تم پڑھتے لکھتے نہیں ہو۔ ہم تمہارا نام کاٹ دیں گے۔ تم گھر ہی پر پڑھا کرو۔''

اس سے امید ہو گئی ہے کہ مدرسہ سے نجات پا کر گھر رہ سکوں گا تو دن بھر وہ رقیبہ ماں پر قابض نہ رہ سکے گی۔ غرض اس بچے نے ساری زندگی اسی ایک خیال پر منحصر کر دی ہے لیکن کیا یہ سب ضروری اور لازمی ہے؟ نہیں۔ اگر ماں بڑے بچے کو چھوٹے کی آمد سے پہلے اس واقعہ کے لیے تیار کر لے تو اس میں بہت کچھ کمی ہو سکتی ہے۔ پھر رقابت کے اس امکان کا خیال رہے تو یہ اپنی محرومی کو اس درجے محسوس نہ کرے۔ سلیقہ والی ماؤں کے لیے یہ ناممکن نہ

ہونا چاہیے کہ وہ اس بڑے بچے کے لیے اس واقعہ پیدائش کو حریف کی ولادت کے حادثہ کی جگہ واقعی بھائی، دوست، ساتھی کی آمد کا مبارک موقع بنا دے۔

زیادہ بچوں والے خاندان میں اس سے بھی عموماً بچوں کی ذہنیت پر بُرا اثر پڑتا ہے کہ ان کا مرتبہ ان بچوں میں کیا ہے؟ عموماً سب سے چھوٹا بچہ یا تو سب سے تیز ہوتا ہے یا بالکل نکما۔ وجہ صاف ہے۔ یہ سب سے کم ہوتا ہے۔ اس لیے سب سے بڑھنا چاہتا ہے۔ اگر صلاحیت ہے اور حالات موافق ہیں تو بڑی تیزی سے بڑھتا ہے اور سب پر سبقت لے جاتا ہے۔ اگر قوتیں حوصلہ کا ساتھ نہیں دیتیں تو بالکل شل ہو کر مایوسی سے کندھا ڈال دیتا ہے۔ سب سے چھوٹے بچے کے لیے یہ خطرہ بھی ہے کہ کچھ نہ ہو اور یہ امکان بھی کہ سب کچھ ہو جائے۔ اس کے مقابلے میں سب سے بڑا بچہ عموماً قوت کا پرستار، جبر کا حامی، حکومت اور قانون کا ساتھی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے اقتدار کا مزہ چکھا ہوتا ہے اور جب دوسرے بچوں کی پیدائش نے اس سے یہ اقتدار کچھ چھینا تو وہ اس وقت سے اسے اور بھی قیمتی سمجھنے لگتا ہے۔

ماں باپ اگر ان موقعوں پر جن کا ذکر میں نے کیا ہے ذرا ہوشیاری سے کام لیں تو بچے کی زندگی میں بہت سے پیچ نہ پڑنے پائیں۔ ضرورت ہے محبت کے ساتھ تھوڑی سی سمجھ اور تھوڑے سے علم کی اور ہاں، صبر کی۔ محبت تو کہتے ہیں ماں باپ کو بچوں سے ہوتی ہی ہے مگر یہ آخری تین چیزیں ذرا کمیاب ہیں۔



دوسرا حصہ

آٹھ بڑے ماہرین تعلیم

(ایک تعارف)

①	سقراط	Socrates
②	افلاطون	Plato
③	امام غزالی رحمہ اللہ	
④	ابن خلدون رحمہ اللہ	
⑤	روسو	Rousseau
⑥	فریڈرک ولہیم فروبل	Froebel
⑦	ماریہ مانٹیسوری	Maria Montessori
⑧	جان ڈیوی	John Dewey

دُنیا کی معلوم تاریخ کا پہلا ممتاز ماہرِ تعلیم فلسفیوں کا فلسفی اور عظیم تر انسان

سقراط (Socrates)

سقراط کی زندگی تلاش حق کی ایک روشن لکیر تھی۔ وہ عظیم انسان تھا جو سچائی کی خاطر زہر کا پیالہ پی کر امر ہو گیا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

سوانحی خاکہ

سقراط 469 (ق۔م) میں ایتھنز (یونان) کے نواح میں پیدا ہوا۔ اس کا آبائی پیشہ سنگ تراشی تھا۔ چنانچہ سقراط نے بھی اپنے کیریئر کا آغاز سنگ تراشی سے کیا۔ لیکن جلد ہی تفکر و تدبر اور تعلیم کی زندگی اختیار کر لی۔ وہ ایتھنز کی شاہراہوں پر کھڑے ہو کر سچائی (Truth) کی تلاش کا درس دیا کرتا تھا۔ اس کا لائف سٹائل حد درجہ سادہ تھا۔ 432 (ق۔م) میں اس نے اپنی ریاست ایتھنز کی طرف سے سپارٹا کی جنگ میں حصہ لیا اور خوب بہادری کے جوہر دکھائے۔ بدعنوان (Corrupt) حکومت وقت اس کی سوچنے اور عقل سے کام لینے کی تحریک سے خوش نہ تھی۔ چنانچہ 399 (ق۔م) میں اس پر نوجوانوں کو گمراہ کرنے (ریاست برگشتہ) کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔

سقراط نے اپنی وکالت خود کی اور آزادی فکر کو دبانے اور آزادیٔ اظہار کو روکنے پر حکومت پر سخت تنقید کی۔ عدالت نے اسے سزائے موت سنائی۔ اس کے شاگردوں نے اسے

جیل سے فرار ہونے کے کئی مواقع فراہم کیے۔لیکن اس نے یہ کہہ کر فرار ہونے سے انکار کر دیا کہ

''ریاست کے قانون کو بدلنا میرا حق ہے،توڑنا نہیں۔''

اس کے آخری الفاظ یہ تھے:

''سچائی کے لیے جان دینا بزدلی کی زندگی سے بہتر ہے۔''

399(ق۔م) کے اواخر میں اس زمانہ کے دستور کے مطابق اس نے ہیملاک ایک قسم کی زہریلی بوٹی، کا رس پی کر بڑے حوصلے اور سکون سے جان دی۔(سقراط کے آخری لمحات کا آنکھوں دیکھا حال اس کے نامور فلسفی شاگرد افلاطون نے مکالمات افلاطون میں لکھا ہے۔)

سقراط کا فلسفہ تعلیم

وہ کہتا تھا:

''علم ہی خیر ہے۔'' Knowledge is virtue

انسان کی پہلی ذمہ داری اپنے آپ کو جاننا ہے۔

Man's primary duty is to know himself.

وہ پہلا مفکر تھا جس نے علم کی ماہیت پر روشنی ڈالی جو تجربے، تفکر، تعقل اور تجزیے سے حاصل ہوتا ہے۔اس نے سمجھنے پر، Thoughtful learning پر زور دیا۔اس سے پہلے سوفسطائی معلم Sophists صرف بتانے، رٹانے، لیکچر دینے کو کافی سمجھتے تھے۔سقراط نے زور دے کر کہا:

Knowledge can not be given, it can only be gained.

سقراط کا طریق تعلیم

سقراط کا طریق تعلیم یہ تھا کہ وہ انجان بن کر سوال در سوال کر کے طالب علم ہی سے جواب نکلوایا کرتا تھا۔معنی خیز سوچے سمجھے سوالوں کے ذریعے سکھانے کا یہ طریقہ

Questioning method یا Socratic method کہلاتا ہے۔ آج بھی Discussion method یا تلاش علم کا Enquiry model بہت موثر (Effective) سمجھا جاتا ہے۔

سقراط کے نزدیک تعلیم کا مقصد دوسروں سے معلومات حاصل کرنا نہیں، بلکہ خود سوچ سمجھ کر تلاش کر کے اپنے تجربے سے علم حاصل کرنا ہے۔

> The aim of education according to Socarates was not verbal instruction but to enable the individual, by developing in him the power of though, to acquire knowledge by himself.



عظیم فلسفی، معلم اور ممتاز ماہر تعلیم

افلاطون (Plato)

افلاطون کو علم و فن کی دنیا کا یہ غیر معمولی امتیاز حاصل ہے کہ وہ فلسفیوں کے فلسفی، معلم اور ماہر تعلیم سقراط کا شاگرد اور ایک اور ممتاز فلسفی سائنس دان، معلم اور ماہر تعلیم ارسطو Aristotle کا استاد تھا۔ اس رول کے علاوہ اس کی کتاب Repbublic گزشتہ ڈھائی ہزار برس سے دنیا کی تعلیمی، سیاسی اور سماجی سوچ کو متاثر کرتی رہی ہے۔ افلاطون کا شمار سقراط اور ارسطو کے ساتھ دنیا کے عظیم محسنوں میں ہوتا ہے۔

سوانحی خاکہ

افلاطون 447 (ق۔م) میں ایتھنز یونان کے ایک امیر کبیر گھرانے میں پیدا ہوا۔ خاندانی روایت کے خلاف اپنے عہد کے عظیم صوفی فلسفی سقراط کی خدمت میں حاضر رہا اور اپنے استاد کے خیالات، افکار، ملفوظات کو مکالمات (Dialogues) کی صورت میں مرتب کیا۔ سقراط کے مرنے کے بعد کچھ عرصہ افلاطون نے سیاحت میں گزارا۔ پھر اپنی اکادمی قائم کی اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ تادم آخر جاری رکھا۔ ارسطو اس کا نامور شاگرد تھا۔ افلاطون کی کتاب ریاست، The Republic فلسفہ تعلیم پر پہلی کتاب ہے۔ قوانین، The laws میں تعلیمی موضوعات پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

تعلیم کے مقصد کے بارے میں افلاطون کہتا ہے:

The aim of education is the welfare of both

the individual and the society.

افلاطون نے پہلی بار تعلیم میں انفرادی اختلافات کا ذکر کیا اور پانچ حسوں (Senses) کے علاوہ چھٹی حس (Sixth Sense) ذہانت (Intelligence) کی بات کی اور ہر شخص کو اس کی صلاحیت کے مطابق تعلیم دینے کا تصور پیش کیا۔ افلاطون نے شروع سے Character Education دینے پر زور دیا اور لازمی تعلیم کے علاوہ پیشہ ورانہ تربیت Vocational Training کی ضرورت کو اُجاگر کیا۔ اس نے ایتھنز کے مردوں اور عورتوں کے لیے فوجی تربیت کو یکساں لازمی قرار دیا اور جسمانی تربیت، موسیقی، خطابت (Oratory) کو بھی نصاب Curriculum میں برابر کی اہمیت دی۔

اس نے تعلیم کا مقصد اعلیٰ یا Supreme objective شخصیت کی بہتری Imporvement of soul قرار دیا۔

طریق تعلیم

افلاطون نے اپنی اکادمی میں اپنے استاد سقراط کا استقرائی Inductive طریقہ اختیار کیا۔ اس نے کہا:

''پڑھانے میں کوئی جبر نہ کیا جائے۔ تعلیم ایک Joy ہے جبر نہیں۔''

The Laws میں افلاطون نے تعلیم میں کھیل (Play) کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اس کا خیال تھا کہ بچوں کی تعلیم میں ان کی دلچسپی Interest اور کھیل (Play) کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس لحاظ سے وہ روسو، فروبل اور مانٹیسوری کا پیش رو تھا۔

افلاطون نے The Laws میں تمام شہریوں کے لیے تعلیم کو لازمی قرار دیا جب کہ The Republic میں تعلیم کو اشراف تک محدود رکھا تھا۔

افلاطون نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

''نظم وضبط، Discipline خیر ہے اور بدنظمی وانتشار، شر۔''

افلاطون کے خیال میں سماجی اور انفرادی زندگی کا اصل الاصول عدل Justice ہے۔

In Republic Plato holds that justice consists in

a harmony that emerges when the various parts of a unit perform the functions proper to them and abstain from Interfering with the functions of any other part. Justice occurs with regard to the Individual when the three component parts of his soul-reason, appetite and spirit or will-each perform their appropriate task. With regard to demands of their allotted roles. Harmony is ensured in the individual when the rational part of his soul (reason) is in rulers because philosophers have a clear understanding of justice.



خبر میں، نظر میں یکتا، مفکر، متکلم، معلم اور ماہرِ تعلیم

امام غزالی رحمہ اللہ

سوانحی خاکہ

نام ابوحامد بن محمد بن غزالی، لقب امام الجلیل زین الدین۔ امام غزالی رحمہ اللہ 1058ء میں ایران کے شہر طوس کے مضافاتی قصبہ غزالہ میں پیدا ہوئے۔ غزالہ کی نسبت سے غزالی کہلائے۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ چونکہ ان کے والد اون کاتنے کا کام کرنے کی وجہ سے غزالی کہلاتے تھے اس لیے اس نسبت سے یہ بھی غزالی کہلائے۔

امام غزالی رحمہ اللہ بغداد کے مشہور مدرسہ نظامیہ میں ایک عرصہ تک استاد رہے۔ امام غزالی کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی علم الکلام کو یونانی اثرات سے پاک کیا۔ شریعت اور طریقت میں مطابقت پیدا کی اور ایک بار پھر وجدان اور ایقان کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ ان کو اس امتیاز کی وجہ سے ایک مجدد و مجتہد کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد 78 ہے جن میں احیاء العلوم (عربی) اور کیمیائے سعادت (فارسی) کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ کی ایک حیثیت ماہر تعلیم کی بھی ہے۔ انہوں نے 1111ء میں انتقال فرمایا۔

امام غزالی رحمہ اللہ کے تعلیمی نظریات وافکار

امام غزالی رحمہ اللہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے علم تعلیم اور فن تدریس کے تمام پہلوؤں پر اظہار خیال کیا جن کو بعد کے یورپی ماہرین تعلیم نے تحقیق کا موضوع بنایا۔

مقصد تعلیم

امام غزالی رحمہ اللہ اپنی تاریخ ساز تصنیف احیاء العلوم کے پہلے باب العلم میں لکھتے ہیں کہ تعلیم کا بنیادی مقصد کیریکٹر اور شخصیت کی تعمیر ہے۔ ہر بچہ اچھا بچہ ہوتا ہے۔ اچھا کیا ہے، بُرا کیا ہے کا شعور اسے ماحول سے، تعلیم سے، معاشرے سے ملتا ہے۔ دینی تعلیم کردار کی تربیت میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ نصاب تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(الف) فرض عین (لازمی Compulsory مضامین)

(ب) فرض کفایہ (آرٹس اور سائنس کے اختیاری Optional مضامین)

امام غزالی رحمہ اللہ کے نظریے کے مطابق دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت فرض عین نصاب کے زمرے میں آتی ہے۔

دینی تعلیم کے نصاب کے سلسلہ میں امام غزالی رحمہ اللہ نے واشگاف لفظوں میں کہا ہے کہ "دینی نصاب میں متنازع موضوعات کو شامل نہ کیا جائے تاکہ طلبا کے ذہن کسی الجھاؤ کا شکار نہ ہوں۔"

اخلاقی تعلیم کے بارے میں امام غزالی رحمہ اللہ کا خیال یہ ہے کہ اخلاقی تربیت بچپن ہی سے شروع کی جائے۔ اس اہتمام کے ساتھ کے والدین اور معلمین کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔

عورتوں کی تعلیم کے بارے میں امام غزالی رحمہ اللہ کا نظریہ یہ ہے کہ ان کی تعلیم کا نصاب زندگی میں ان کے رول کے مطابق ہونا چاہیے۔ (صدیوں بعد روسو نے اپنی کتاب Emile میں اپنی کتاب مثالی طالبہ صوفیہ (Sophy) کی تعلیم کے بارے میں یہی نقطہ نظر اختیار کیا۔)

پیشہ ورانہ تعلیم

امام غزالی رحمہ اللہ نے بہت زور دے کر نظام تعلیم میں پیشہ ورانہ Vocational تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو اُجاگر کیا۔ ان کا خیال ہے کہ دین کا منشا بھی یہی ہے کہ ہر انسان اپنی معاش کے لیے تگ و دو کرے۔ معاشی جدوجہد باعث خیر ہے۔

God made this world a place of work and

labour.

جدوجہد اور کوشش Effort and work بنیادی اسلامی قدریں ہیں۔

تعلیم کی ماہیت

امام غزالی رحمہ اللہ نے تعلیم کے عمل میں فرد اور نسل کے ذاتی تجربے کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

He considered the personal experience of the man and the race very important in the process of education.

یہ وہ نقطہ نظر ہے جس کی بازگشت صدیوں بعد روسو Rousseau اور ڈیوی کے نظریات میں سنائی دیتی ہے۔

طریق تدریس Model of Teaching

اس سلسلہ میں امام غزالی رحمہ اللہ کا کہنا ہے۔

- ☆ سبق کو دلچسپ بنایا جائے۔
- ☆ سبق میں طلبا کی شرکت Involvement کو یقینی بنایا جائے۔
- ☆ تدریسی معاونات استعمال کی جائیں۔
- ☆ کلاس کا ماحول خوشگوار اور باہمی اعتماد کا ہو۔
- ☆ نصاب کا مواد طلبا کی ذہنی استعداد Development level کے مطابق مرتب ہو۔
- ☆ استاد سادہ Simple سے پیچیدہ Complex کی طرف جائے۔

سبق کے تین مرحلے

1۔ توضیحی لیکچر

- ☆ سوال و جواب کے ذریعہ سبق میں طلبا کی شرکت Involvement۔
- ☆ آخر میں بحث و مباحثہ Discussion۔

2۔ ڈسپلن

نظم وضبط خوف سے نہیں، محبت اور شفقت سے قائم کیا جائے۔ سزا کے بارے میں غزالی کہتے ہیں۔

It curbs the initiative, shakes the confidence, and develops resistance against the teacher.

3۔ استاد کا رول

استاد اپنے رول کا ماڈل ہوتا کہ طلبا اس سے اپنے آپ کو ذہنی طور پر وابستہ کر سکیں۔

The teacher has to play the role of model so that the students could identify themselves with him.

تقریباً ہزار سال بعد بھی امام غزالی رحمہ اللہ کے تعلیمی تصورات، نظریات تازہ اور موثر Effective ہیں۔



مفکر، مدبر اور مورخ

تاریخ عمرانیات اور علم تعلیم کا ماہر ایک ہمہ جہت جینئس (Genius)

ابنِ خلدون

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

سوانحی خاکہ

ابوزید عبدالرحمان ولی الدین ابن خلدون 27 مئی 1333ء کو تیونس میں پیدا ہوا۔ اس کا آبائی تعلق اندلس کے ایک علم دوست گھرانے سے تھا۔ فقہ، حدیث، عربی شعر و ادب کی مروجہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے علم تاریخ میں خصوصی دلچسپی لی اور اس میں اس درجہ کمال کو پہنچا کہ امام کا لقب پایا۔ سفارت کاری اور سیاحت میں مصروف رہا۔ کچھ عرصہ مصر میں چیف جسٹس کے عہدہ پر بھی فائز رہا۔ 1400ء میں تیمور کے خلاف ایک جنگ میں نبرد آزما ہوا۔ ابنِ خلدون غیر معمولی صلاحیتوں اور قابلیتوں (Talents) کا انسان تھا۔ اس نے بہت سے میدانوں میں طبع آزمائی کی اور ہر میدان میں اپنا سکہ جمایا۔ 19 مارچ 1402ء کو قاہرہ میں انتقال کیا۔

ابنِ خلدون کو ابوالتاریخ کہا جاتا ہے۔ مشرق و مغرب میں اس کی شہرت فلسفہ، تاریخ، عمرانیات Sociology اور تعلیمی نظریات کی وجہ سے ہے۔

ابنِ خلدون کے تعلیمی تصورات

ابنِ خلدون نے اپنے مشہور عالم مقدمہ کے آخری باب میں فلسفہ تعلیم اور فن

تدریس پر اظہار خیال کیا ہے۔جس کے اہم نکات یہ ہیں۔

☆ پڑھاتے وقت انفرادی اختلافات کو ملحوظ رکھا جائے۔

☆ کتابی تعلیم کے ساتھ کوئی ہنر بھی سکھایا جائے۔

He stressed the need for integrated professional and vocational syllabus.

☆ Subject رٹنے رٹانے کا طریقہ بالکل غلط بلکہ مضر ہے۔

It curbs initiative, orignality, the power of creativity and innovation.

☆ رٹنے رٹانے کا طریقہ علم کی تحصیل کے لیے جدوجہد کی عادت پروان نہیں چڑھاتا۔

طریق تدریس

ابنِ خلدون نے تدریس کے جو تین مدارج تجویز کیے ہیں یعنی سبق کا

Introduction, development and reception.

وہ وہی ہیں جو Lesson Planning کا جدید تصور ہے۔

ابنِ خلدون کہتا ہے کہ نصاب کو ایک مکمل جز و کی شکل میں پڑھایا جائے۔Whole کا جو جدید تصور Module teaching کی شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ابن خلدون کا خیال ہے کہ نصاب کے مواد کو طلبا کی ذہنی وجذباتی نشوونما کے مدارج سے مربوط کیا جائے۔

Physical maturation and readiness is necessary for the teaching of any task and that the readiness comes at different times on the part of the learner.

ابنِ خلدون کا یہ خیال نصاب سازی Curriuclum development اور Planning کے لیے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

جدید فن تعلیم و تدریس کے بعض کلیے (Axioms) آج زبان زد خاص و عام ہیں جیسے آسان سے مشکل کی طرف معلوم سے نامعلوم کی طرف، ٹھوس (Concrete) سے مجرد (Abstract) کی طرف، سادہ سے پیچیدہ کی طرف، یہ ابنِ خلدون کے وضع کیے ہوئے ہیں۔ابنِ خلدون جسمانی سزا کے سخت خلاف ہے۔

تعلیم کا مقصد

تعلیم کا اوّلین مقصد سوچنے سمجھنے کی اہلیت اور قوت استدلال کو پروان چڑھانا ہے۔

He counts the power of thinking and reasoning as very important and valuable. Therefore the ability of logical thinking and reasoning has to be pursued as an educational goal at all levels.

تعلیمی نظام

ابنِ خلدون کہتا ہے کہ ہر معاشرہ کا تعلیمی نظام اس معاشرہ کی نظریاتی اساس کے مطابق ترتیب دیا جانا چاہیے۔

سماجی ذمہ داری کی نشوونما

ابنِ خلدون طالب علم کی سماجی کارکردگی (Social efficiency) بڑھانے کو تعلیم کا بنیادی مقصد سمجھتا ہے۔ یہ وہی تصور ہے جس کی بازگشت جان ڈیوی کے ہاں بیسویں صدی میں ملتی ہے۔

To develop social and economic efficency for the welfare of the individual and society.

اصل مقصد

تمام مضامین (تعلیم) ایک ذریعہ ہیں، مقصد ہیں انسان کی اندرونی مسرت یا طمانیت (Happiness) حاصل کرنے کا۔ یہ نظریہ وہی ہے جو ارسطو نے پیش کیا تھا۔ ابنِ خلدون قرآن و حدیث کی تعلیم کو تمام معاشرے کے لیے لازمی قرار دیتا ہے لیکن اس کا خیال ہے کہ ناظرہ پڑھانے سے پہلے بہتر ہے کہ عربی پڑھائی جائے تاکہ قرآن حکیم کو سمجھا جا سکے۔

ابنِ خلدون تمام علم (Knowledge) کو تین اجزا میں تقسیم کرتا ہے۔

(a) Useful Arts.

(b) Fine Arts.

(c) Arts.

روسو(Rousseau)

ایک سحر کار Charismatic انسان جو بیک وقت Humanist،فطرت پرست، فلسفی، ادیب، فنکار، Romantic، انقلابی، Educator،معلم، ماہر تعلیم Educationist اور عمرانیات کا محقق، سب ہی کچھ تھا۔ جس کی ذاتی زندگی ہمیشہ متنازع (Controversial) رہی لیکن جس کی تحریروں نے نہ صرف انقلاب فرانس برپا کرنے میں ایک کلیدی کردار ادا کیا بلکہ اس دور سے آج تک دنیا کے تعلیمی و تدریسی تصورات کو مسلسل متاثر کیے رکھا ہے۔ اس کا مقالہ (Social Contract) معاہدہ عمرانی آج بھی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

اس کے سوانحی اعترافات (Confessions) کو کلاسیکی ادب کا درجہ حاصل ہے۔ اس کی اپنی زندگی پستی و بلندی کے نشیب و فراز سے گزرتی رہی لیکن اس کے افکار ہمیشہ بلند اور Original رہے۔ اپنی تمام تر بشری کمزوریوں کے باوجود ایک مخلص اور قابل محبت، انسان دوست Lovable انسان تھا۔ اس کا ایک دلچسپ فقرہ ہے۔

''آدمی تو میں بُرا ہوں لیکن محبت مجھے اچھے کاموں سے ہے۔''

سوانحی خاکہ

فرانسیسی مفکر ژان ژاک روسو(Jean jacques Rousseau) 1712ء میں جنیوا میں ایک غریب گھڑی ساز کے گھر پیدا ہوا۔ ادبی تربیت تو دور کی بات ہے اسے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع بھی کبھی نہیں ملا۔ اس نے تھوڑا بہت جو کچھ پڑھا اپنے باپ سے پڑھا۔ 12 سال تک کا عرصہ اس کے شوق آوارگی کی نذر ہو گیا لیکن اس عرصہ میں اس نے

فطرت اور زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔ اس کی فطرت پرستی اور غریب دوستی کی بنیاد اسی دور میں پڑی۔

1735ء میں اتفاقاً اسے بچوں کی اتالیقی کرنے کا نادر موقع ملا۔ تعلیم و تعلم سے اس کی گہری دلچسپی اسی وقت سے شروع ہوئی اور اس نے سماجی موضوع پر لکھنا شروع کیا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان معصوم اور آزاد پیدا ہوتا ہے۔ سوسائٹی اور رسمی تعلیم اسے خراب اور Currupt کرتی ہے۔ وہ انسان کی فطری عظمت اور آزادی کا پر جوش علم بردار تھا۔

1762ء میں عمرانیات (Sociology) پر اس کی مشہور زمانہ کتاب معاہدہ عمرانی (The Social contract) اور فلسفہ تعلیم اور فن تدریس پر اس کا ناول ای میل (Emile) شائع ہوا۔

1778ء میں 66 سال کی عمر میں اس کی عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ گیا۔

عجیب آزاد مرد تھا۔ اپنے انقلابی خیالات اور اعمال کی وجہ سے وہ ایک عرصہ تک فرانسیسی اور سوئس حکومتوں کے زیر عتاب رہا۔

تعلیمی افکار و نظریات

☆ انسان اچھا پیدا ہوتا ہے، سوسائٹی اسے خراب کرتی ہے۔

☆ سب سے اہم بات یہ ہے کہ بچہ کو جلد سے جلد تعلیم حاصل کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔

The most important part of education, precisely which all the world neglects is that of preparing a child to receive education.

☆ تعلیم تین ذریعوں سے حاصل ہوتی ہے، آتی ہے:

- فطرت Nature سے
- انسانوں سے
- چیزوں سے

To him education does not mean merely

imparting of information or seeking knowledge but it is the development of the child's inner disposition.

تعلیم کا مقصد

☆ فطری صلاحیتوں کی نشوونما

☆ بچہ کی آزادی، Liberty اور خوشی Happiness

☆ تعلیم کا مقصد زندگی کے لیے تیاری ہی نہیں، کارزارِ حیات میں بھرپور حصہ لینا بھی ہے۔

The aim of education is not only preparation for life but participation in it.

☆ بچپن کا ایک نیا تصور

Childhood has its own place in the sequence of human life, the man must be treated as a man and the child as a child.

☆ بچہ، بچہ ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا سا آدمی نہیں۔ بچہ کو بچہ ہی سمجھنا چاہیے۔ اپنی تمام امتیازی خصوصیات کے ساتھ۔

The wisest writers devote themselves to what man ought to know without asking what a child is capable of learning. They are always looking for the man in a child without considering what he is before he becomes a man.

☆ بچہ کو وہی سکھایا جائے جو اس کی عمر کا تقاضا ہے۔

Emile should remain in complete ignorance of

those ideas. which are beyond his grasp.

☆ روسو نے بچہ کو اس کا مقام دیا، بچپن کی خصوصیات کو اجاگر کیا، اور ایسی تعلیم پر زور دیا جو بچپن کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔

امیل Emile

روسو نے اس کتاب میں ایک مثالی بچہ امیل Emile اور بچی صوفیہ Sophy کی خیالی تعلیم و تربیت کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ امیل کے نصاب میں جسمانی تعلیم کو شامل کیا ہے۔ روسو نے تاریخ تعلیم میں پہلی بار Rights of childhood پر زور دیا۔

Emile کو پیرس کے آرچ بشپ نے ملحدانہ کتاب گردانتے ہوئے اسے جلانے کا فتویٰ دیا تھا۔ امیل میں روسو نے ان مدارج کا ذکر کیا ہے۔ جن سے ایک طالب علم بچپن سے جوانی تک گزرتا ہے۔

In Emile Rousseau distinguishes various stages of life of a pupil like infancy, childhood, boyhood and adolescence.

اس نے ہر دور کی تعلیم کے لیے ایک منصوبہ Plan پیش کیا۔ اس نے زور دے کر کہا:

The possibilities of each stage of life should be fully exploited before proceeding to the next stage.

''دور کا مقصد تعلیم اور نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم علیحدہ ہونا چاہیے۔''

فروبل اور مانٹیسوری نے اسی اصول پر عمل کیا۔

In childhood senses should be developed to be the foundation of reasoning and judgement. In Rousseau's opinion, the power of reasoning can be developed through self

experience.

روسو نے جو اصول تدریس دیا وہ یہ تھا:

''بچہ کو کم بتاؤ، کم سکھاؤ، اسے خود سیکھنے دو۔''

طریق تدریس

Teach by using concrete and real life situations. Childhood is a step of reason. Reading is the curse of childhood. Let Emile learn from his own experience not books. Do not teach him truths so much as to show him how to set about discovering them himself for learning is by doing, by direct experience.

☆ روسو نے Adolescence پر خصوصی توجہ دی۔ ہر دور کا مقصد تعلیم علیحدہ متعین کیا۔

☆ روسو نے اخلاقی، مذہبی اور جمالیاتی تعلیم کو بھی ضروری قرار دیا۔

روسو زبانی تعلیم کے خلاف تھا۔

No verbal instruction is called for, there is too much stress on words.

☆ روسو نے مرد اور عورت کی تعلیم کا نصاب علیحدہ رکھا اور خواتین سے کہا:

Men will always be what women choose to make them. It will alway be the lot of your sex to govern ours. Training of the heart rather than the head is called for.

☆ استاد کا کام۔ Process of education is a matter of guidance.

I prefer to call the man, who has this knowledge, master rather than a teacher, since it's question of quidance rather than instruction. The art of teaching consists in making the pupil wish to learn and not in mere of knowledge.

 روسو صرف بتانے کے، Lecture method کے سخت خلاف ہے۔

He rejects verbal teaching on the part of the teacher. Rousseau said for the first time that the process of education is a matter of guidance not instruction. For the same reason, Dr. Maria Montessori later substituted the word 'directress' in place of teacher.

 استاد کا اصل رول کیا ہے؟

The chief responsibility of the teacher is to train the pupil to be as self-reliant as possible. The ordinary teacher teaches him everything except self-knowledge and self-control.

 کیا سیکھنا ہے، کیا کرنا ہے؟

Self-knowledge دینا ہے، Self-control سکھانا ہے۔

 زندگی گزارنے کا فن The art of living اور یہ کہ انسان خوش کیسے رہے، بقول روسو:

"تعلیم کا مقصد خوشی حاصل کرنا ہے۔"

Emile is an outline scheme of education for all

Rousseau for the first time demanded respect for the common man, and also recognises the labour.

روسو نے کہا:

Treat the child as a child.

روسو نے کیا دیا۔

Rousseau pointed out towards the importance of childhood and its desires for the first time.

طریق تعلیم

Rousseau emphasized play way method of teaching and learning by doing and maintaining sprit of play in the process of the education. Work and play are all one to him (Emile), his games are his work. Rousseau recommended mathod of discovery in education.

روسو آج کے تمام ماہرین تعلیم اور طریق تعلیم کا پیش رو ہے۔



تعلیمی افق کا ایک روشن ستارہ، پری سکول ایجوکیشن Pre-school education کا رمزشناس، انسان دوست اور وطن دوست، کھیل کھیل میں تعلیم Kindergarten کے نظریے کا خالق، جرمن استاد اور تعلیم داں Educator and Educationist

فریڈرک ولہیم فروبل

(Fredrich Wilhem froeble)

سوانحی خاکہ

جرمن ماہر تعلیم فریڈرک ولہیم فروبل جرمنی کے ایک قصبہ سیکنی میں اپریل 1772ء کی 21 تاریخ کو پیدا ہوا۔ 7 ماہ کا تھا کہ ماں کی ممتا سے محروم ہو گیا۔ باپ پادری تھا جس کی توجہ بھی اسے پوری طرح نہ مل سکی۔ ماں باپ کی محبت سے محرومی کے تجربے نے اس کو بچوں کے دکھ درد کے بارے میں بہت حساس بنا دیا تھا۔ دس سال کی عمر میں ایک چچا کی کفالت میں اس نے آگے بڑھنا شروع کیا۔

1899ء میں کچھ عرصہ اس نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ پھر اپنی منزل کی تلاش میں وہ تنہا بھٹک رہا تھا۔ 1805ء میں اسے ایک سکول میں پڑھانے کا موقع ملا۔ جو اس زمانہ کے مشہور پیستالوزی کے نظریہ تعلیم کی روشنی میں قائم کیا گیا۔ 1808-10ء کے عرصہ میں دو سال اسے عظیم پیستالوزی کی ذاتی رہنمائی میں ایک سکول میں کام کرنے کا موقع ملا۔ پیستالوزی کے رول ماڈل کی روشنی میں اسے اپنی منزل کا سراغ مل گیا۔ 1813-14ء میں فروبل نے نپولین کے خلاف اپنے ملک کی جنگ آزادی میں حصہ لیا۔

جنگ آزادی لڑتے ہوئے ہی اسے یہ دور رس خیال آیا کہ جرمنی کے نظام تعلیم کو

نئے سرے سے ترتیب دے کر ایک نیا جرمنی پیدا کیا جا سکتا ہے۔

While a soldier he developed the idea of regenerating Germany through a basic reconstructing of its educational system.

1816ء میں فروبل نے اپنا سکول کھولا۔ 1826ء میں اس نے اپنے تعلیمی نظریات پر مبنی کتاب ''انسان کی تعلیم'' The education of man شائع کی۔

1837ء میں فروبل نے بچوں کی پری سکول تعلیم کے اپنے سکول کو کنڈرگارڈن (بچوں کا باغ) کا نام دیا۔ 1840ء سے اس کے نظریہ تعلیم نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی اور یورپ وامریکہ میں بہت سے کنڈرگارڈن کھولے گئے۔

فروبل کا نظریہ تعلیم پھل پھول رہا تھا لیکن اس کی اپنی زندگی آزمائشوں کی دھوپ چھاؤں کا ایک طویل سلسلہ بنی رہی۔ 1852ء میں اس عظیم معلم اور ماہر تعلیم نے انتقال کیا۔ فروبل نے انیسویں صدی کے اوائل میں بچوں اور بڑوں کی تعلیم کو کھیل بنانے کا نظریہ پیش کیا۔ فروبل نے اپنے عہد کے تعلیمی رجحانات کو شدت سے متاثر کیا۔ اس کا شمار جدید تعلیم کے معماروں میں ہوتا ہے۔

فروبل کا نظریہ تعلیم کیا ہے؟

فروبل نے اپنے نرسری سکول (کنڈرگارڈن) کو شروع میں......

"Child Nature and Activity Institute."

کا نام دیا تھا۔ اس کے طریق تعلیم کو کھیل کھیل میں تعلیم کا نام دیا جا سکتا ہے۔ فروبل کا نظریہ یہ ہے کہ جس طرح بیج کے اندر سے پیڑ پھوٹتا ہے، اسی طرح بچہ اپنی اندرونی تحریک سے سیکھتا ہے اور کھیل (Play) ہی وہ فطری طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے بچہ زندگی کے گوناگوں تجربات حاصل کرتا ہے۔ اسی نقطہ نظر سے اس کھیل کو اپنے سسٹم میں ذریعہ تعلیم بنایا اور بہت سے تعلیمی کھلونے خود وضع کیے۔ جنہیں وہ Gifts کہا کرتا تھا۔

In his own kindergarten he put into practice his theory of education as a natural inner

unfolding towards self-activity. He stressed play as the chief form of self expression and devised play-materials.

فروبل کے خیال میں استاد کا کام باہر سے طالب علم کے دماغ میں معلومات یا خیالات ٹھونسنا نہیں ہے بلکہ اس کے اندر سیکھنے کی جو فطری امنگ ہے اسے راہ پر لگانا ہے۔ فروبل کے نظریہ تعلیم کے تین جزو ہیں......

Self development through self activity and the child's need for cooperative activity.

وہ کہتا ہے:

The role of a teacher is not to instill or indoctrinate, but rather to encourage the child's self-development. This concept, together with the idea of self activity and the child's need for cooperative activity constitutes the core of kindergarten system that developed into a universal educational institution.

فروبل صوفیانہ مزاج کا تعلیمی مفکر تھا۔ اگرچہ اب اس کا نام پری سکول ایجوکیشن (کنڈرگارڈن) سے مربوط ہو کے رہ گیا ہے لیکن بنیادی طور پر اس کی تعلیمی سوچ بہت گہری تھی۔ وہ تخلیقی تصور کا پیش رو تھا۔

Frobel's methods were based on the premise that man is essentially active and creative.



دُنیا بھر کے بچوں کی تعلیمی ماں

ماریہ مانٹیسوری (Maria Montessori)

Montessrore Method کی بانی مبانی مخلص دردمند اور ذہین ڈاکٹر ماریہ مانٹیسوری، Dr. Maria Montessori۔

مختصر حالاتِ زندگی

- ☆ مادام ماریہ مانٹیسوری 1870ء میں اٹلی میں پیدا ہوئیں۔
- ☆ روم یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری لی۔ (وہ اٹلی کی پہلی خاتون ڈاکٹر تھیں)۔
- ☆ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز نفسیاتی امراض کے معالج کی حیثیت سے کیا۔
- ☆ 1904ء سے انہوں نے ذہنی طور پر پسماندہ Mentally deficient بچوں کی تعلیم میں دلچسپی لینا شروع کی اور بچوں کی تعلیم کا وہ سائنسی طریق تعلیم Scientific Model وضع کیا جو اب Montessori کے نام سے مشہور ہے۔
بعد میں یہی طریق تعلیم مادام ماریہ مانٹیسوری نے نارمل بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے استعمال کیا اور حیرت انگیز نتائج حاصل کیے۔
- ☆ 1909ء سے یہ طرزِ تعلیم نارمل بچوں کی تعلیم کے لیے دنیا میں مقبول ہو رہا ہے۔
- ☆ 1912ء میں ان کی پہلی کتاب Montessori Method شائع ہوئی۔
- ☆ 1914ء سے اس سسٹم سے متعلق اساتذہ کی تربیت کے لیے بین الاقوامی تربیتی ادارے قائم ہیں جیسے
"Association Montessori International."
- ☆ دوسری جنگ عظیم کے دوران برصغیر پاک و ہند کے بعض شہروں بشمول کراچی ڈاکٹر ماریہ مانٹیسوری نے مانٹیسوری ٹیچرز (Directresses) کی خود تربیت Training

کی۔

☆ اس عظیم معلّمہ Educator اور ماہر تعلیم Educationist نے جس نے دنیا بھر میں پری سکول تعلیم Pre-school education کا تصور ہی بدل دیا، 82 سال کی عمر میں 1953ء میں انتقال کیا۔ God bless her۔

مانٹیسوری نظریہ تعلیم کیا ہے؟

مانٹیسوری میتھڈ کا بنیادی نظریہ یہ ہے:

☆ بچہ میں از خود سیکھنے کی فطری صلاحیت اور اُمنگ ہوتی ہے۔

☆ اسے آزادی سے اپنے تجربے سے خود سیکھنے کا موقع دینا چاہیے۔

مانٹیسوری طریق تعلیم Montessori Method کیا ہے؟

☆ یہ ایک عملی تجرباتی طریق تعلیم ہے۔ اس میں بچہ کو ایک تیار شدہ ماحول Planned environment میں ایسی مشقیں Exercises کرائی جاتی ہیں جس سے اس کی پانچوں حسوں Senses، ذہانت Intelligence اور تخیل Imagination کی تربیت ہو۔ Montessori Method کی روح آزادی Freedom اپنی کوشش Self-activity خود سیکھنا، Self-learning ہے۔ اس طریق تدریس میں ٹیچر کو رہنما Directress کہا جاتا ہے۔

مانٹیسوری میتھڈ کی حد کیا ہے؟

ماریہ مانٹیسوری نے اس طریق تعلیم کو وضع تو 3 سے 16 سال یعنی میٹرک کی کلاسوں تک کے لیے کیا تھا لیکن عملی طور پر طریق تدریس و تعلیم پری اور پرائمری (3 سال سے 10 سال) کلاسوں تک کے لیے بہت مفید پایا گیا۔ آج کل دنیا میں یہ سسٹم +3 اور +4 عمر کے بچوں کی تعلیم کے لیے یعنی نرسری اور پریپ کے لیے خاص طور پر بہت مقبول ہے اور یقیناً موثر بھی ہے۔

دنیا بھر کے ننھے فرشتوں کی تعلیمی ماں، ماریہ مانٹیسوری زندہ باد۔

فلسفہ عملیت Pragmatism کا علمبردار
بیسویں صدی کا امریکی مفکر اور ماہر تعلیم جس کے افکار نے تمام تعلیمی دنیا کو متاثر کیا

جان ڈیوی (John Dewey)

سوانحی خاکہ

جان ڈیوی John Dewey، 1859ء میں برلنگٹن (امریکہ) میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے کیریئر کا آغاز ایک گاؤں میں سکول ٹیچر کی حیثیت سے کیا۔ بعد میں اس نے کئی یونیورسٹیوں میں پڑھایا۔ لیکن اس کی بنیادی دلچسپی سکول ٹیچنگ ہی میں رہی۔ شکاگو میں اس نے ایک تجرباتی، ایلیمنٹری سکول بھی قائم کیا۔ یہاں اس نے تعلیم کو فلسفیانہ غور وفکر کا موضوع بنایا۔ Democracy and Education اور Schools for Tomorrow ایسی کتابوں نے زمانہ حاضر کے تعلیمی تصورات کو بہت متاثر کیا۔ ڈیوی نے طویل عمر پا کر 1952ء میں انتقال کیا۔

ڈیوی کے تعلیمی افکار اور نظریات ...... تعلیم کی اہمیت

ڈیوی کہتا ہے:
"تعلیم تجربے کی مسلسل تشکیل نو Continual reconstruction of experience کا نام ہے۔"

تعلیم کا مقصد

☆ ڈیوی نے یہ نظریہ پیش کیا کہ تعلیم کا مقصد سوچنا Critical thinking سکھانا

ہے۔

سکھانا محض اس لیے نہیں کہ تفکر Thinking بذات خود باعث خیر Greatest good ہے۔ جیسا کہ یونانی فلسفیوں (سقراط اور افلاطون) کا خیال تھا بلکہ اس لیے کہ تخلیقی انداز سے سوچ سکنا کارزارِ حیات میں پیش آنے والے مسائل کو کامیابی سے حل کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔

Dewey worked out a theory of education in which people are taught to think not just because thinking is good in itself as it was considered by Greek philosophers, but becuase it is a means, an instrument for solving problems in a precarious world.

☆ ڈیوی کا یہ بھی خیال تھا کہ علم ایک ذریعہ ہے مقصد بالذات نہیں۔

Knowledge is always a means, never an end in itself, it is purely instrumental.

☆ جان ڈیوی نے تعلیم کے مقاصد Objectives نصاب تعلیم Curriculum اور طریق تعلیم Method of teaching تینوں پہلوؤں کو متاثر کیا۔ جان ڈیوی نے ایجوکیشن کا ایک نیا تصور دیا۔

To him education is a necessity of life and life-long process. Educatio, tieh he said, is not for the future life but it is life itself - a continuous interaction between the individual and society.

☆ جان ڈیوی تعلیم میں جمہوری قدروں اور اصولوں کا علمبردار تھا۔

He wanted democracy for the teacher and the taught. He advocated freedom of thought and

action.

☆ جان ڈیوی نے ایک نئے قسم کے، زندگی سے مربوط نصاب تعلیم Intergrated curriculum کا نظریہ پیش کیا اور سرگرمی Activity کے لفظ کو ایک نیا مفہوم دیا۔

He presented a new kind of curriculum which was based upon the occupations familar to children and which was deeply associated with their social enviroment.

اس طرح نصاب تعلیم Curriculum پیش کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ تعلیم فرد اور سماج دونوں کی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہے۔ (افلاطون نے The Laws میں یہی کہا تھا۔)

Education should be in accordance with both the needs and the interests of the individual and the Society.

☆ جان ڈیوی نے جو طریق تدریس تجویز کیا وہ Problem solving کا طریقہ تھا جسے Kilpartrick نے تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ Project Method کے طور پر پیش کیا۔

ڈسپلن کا نیا تصور

جان ڈیوی نے Learning by doing کے اصول کے تحت دُنیا کو ڈسپلن کے ایک نئے تصور سے روشناس کرایا۔ اس کا خیال تھا کہ سکول میں تعلیمی شور کا ہونا لازمی ہے۔ خاموشی اسی کلاس میں ہوتی ہے جہاں استاد بول رہا ہو اور لڑکے ساکت و صامت بیٹھے سن رہے ہوں۔

He said that the behaviour and conduct of the students should not be regulated by artificial

means, instead, the teacher should provide them with the right kind of environment so that the activities of the students may go on in co-operative attitudes, social interests and social habits.

استاد کا رول

According to Dewey activity should be on the part of the students and not of the teacher as used to be in conventional schools. The teacher is supposed to supervise children's activities during problem-solving sessions. The teacher's duty is not so much to impart knowledge as to create in them the interest for knowledge. He should not destroy the initiative of the child but he is there to guard it.

☆ جان ڈیوی کی کتاب Democracy and Education افلاطون کی Republic کے بعد تعلیم پر سب سے اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔

☆ جان ڈیوی کا شمار جدید تعلیم کے عظیم معماروں میں ہوتا ہے۔



تیسرا حصہ

ٹیچر مارننگ اسمبلی کے چھ پروگرام

Teacher Exposure Time

شرکاء کی تعداد 35...... وقت 10 منٹ

مقصد......

Character - Building Orientation

کے ساتھ

Communication Skills

اور

Confidence

کو

Build - Up

کرنا

Teacher's Exposure Time

پروگرام ٹیچرز مارننگ اسمبلی

تاریخ.....................دن.....................وقت.....................

① السلام علیکم، آپ کی میز بان.............................. میرا تعلق.................. سلطانہ فاؤنڈیشن سکول سے ہے۔

آج کی صبح اس ٹیچر کے نام جو کسی بچہ کو اجنبی نہیں سمجھتی خواہ وہ کسی گھر میں پیدا ہوا ہو۔

تقریب کا آغاز اللہ کے پاک کلام سورۃ العصر سے.......

② تلاوت سورۃ العصر:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ o اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ o

③ ترجمہ: ”زمانے کی قسم! انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔“

④ ....نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

سلام اس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا
سلام اس پر جو سچائی کی خاطر دُکھ اُٹھاتا تھا
سلام اس پر جو بھوکا رہ کے اوروں کو کھلاتا تھا

⑤

سلام اے آمنہ رضی اللہ عنہا کے لال اے محبوب سبحانی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
سلام اے فخر موجودات، فخر نوع انسانی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

⑥ آج کی حدیث:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

- گھڑی بھر غور و فکر برسوں کی عبادت سے بہتر ہے۔
- علم خزانہ ہے اور سوال اس کی کنجی۔
- لاعلمی کی دوا، سوال ہے۔
- اچھی طرح سوال کرنا نصف علم ہے۔
- جو علم سکھاتا ہے اور جو علم سیکھتا ہے دونوں اس کار خیر میں شریک ہیں۔

⑦......

Love Pakistan, Serve Pakistan

Be fair to all
Be it a friend or foe
Give each his due
Be he big or small
Be kind to every one
Love Pakistan, Serve Pakistan

Learn to tolerate

Learn to cooperate

Face the difficulties with a smiling face

Love Pakistan, Serve Pakistan

⑧ سلطانہ فاؤنڈیشن کا پیغام:

خوب سے خوب تر کی جستجو

⑨ قائداعظم نے فرمایا:

☆ اپنے فائدے سے پہلے قوم کا فائدہ دیکھیے۔

☆ اپنے کردار کی تعمیر کیجیے۔

☆ جو اپنی قدر کرتا ہے وہ وقت کی قدر کرتا ہے۔

☆ علم سرمایہ ہے۔

⑩ علامہ محمد اقبال نے فرمایا:

☆ فقط ذوق پرواز ہے زندگی۔

☆ غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں۔

☆ پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ۔

☆ زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے۔

☆ رفعت میں مقاصد کو ہمدوش ثریا کر۔

⑪ آج کا خیال:

"علم کی کمی خلوص سے پوری ہو جاتی ہے لیکن خلوص کی کمی کسی چیز سے پوری نہیں ہوتی۔"

⑫ آج کی شخصیت:

مورخ اور ماہر تعلیم ابن خلدون۔ زمانہ حیات۔

⑬ آج کی کتاب:

ابن خلدون کا ''مقدمہ تاریخ''۔

⑭ ورکشاپ کا پیغام:
ایک بچے کی تعلیم ایک فرد کی تعلیم ہوتی ہے۔
ایک بچی کی تعلیم، ایک عورت کی تعلیم اور ایک ماں کی تعلیم، ایک خاندان کی تعلیم ہوتی ہے۔

⑮ سلطانہ فاؤنڈیشن زندہ باد۔ پاکستان زندہ باد!

⑯ کورس کی شمع روشن کرنے کے لیے دعوت دیتی ہوں............................کو

⑰ قومی ترانہ!



Teacher's Exposure Time

پروگرام ٹیچرز مارننگ اسمبلی

تاریخ.................. دن...................... وقت..................

① السلام علیکم، آپ کی میزبان.......................... میرا تعلق.................. سلطانہ فاؤنڈیشن سکول سے ہے۔

آج کی صبح اس ٹیچر کے نام جو علم اور معلومات کا فرق جانتی ہے اور اپنے بچوں کو Pupils کو آدمی سے انسان بنانا چاہتی ہے۔

تقریب کا آغاز اللہ کے پاک کلام سورۃ العصر سے......

② سورۃ العصر:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالۡعَصۡرِ o اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ o اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ o

③ ترجمہ: ''زمانے کی قسم! انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔''

④ انگریزی ترجمہ:

In the name of Allah, Most Gracious Most Merciful, By the time. Truely man is in loss.

Except such as have Faith and do righteous deeds and join together in the mutual learning of Truth and of patience and consistency.

④ **نعت**

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی برلانے والا
خطاکار سے درگزر کرنے والا
بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا
اُتر کر حِرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

⑤ آج کی حدیث:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

- علم میرا ہتھیار ہے۔
- علم خزانہ ہے اور سوال اس کی کنجی۔
- علم مومن کی گم شدہ میراث ہے۔
- مسلمانو! جاننے والوں سے سوال کیا کرو۔
- جو تم نہیں جانتے اس کے بارے میں بار بار پوچھو۔ اس کا فائدہ ہے جو پوچھتا ہے اور جو جواب دیتا ہے اور اس کا بھی فائدہ ہے جو سنتا ہے۔

⑥ ....

Love Pakistan, Serve Pakistan

Think aright. Speak aright
Do the right and do it well
Keep the candle burning

Spread the light far and wide

Love Pakistan, Serve Pakistan.

⑦ سلطانہ فاؤنڈیشن کا پیغام:

''جہالت کے خلاف جہاد۔

⑧ قائداعظم نے فرمایا:

☆ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے۔

☆ پاکستان اسلام کی تجربہ گاہ ہے۔

☆ پاکستان کا لنگر اسلام ہے۔

⑨ علامہ محمد اقبال نے فرمایا:

☆ ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا۔

☆ میرے اللہ بُرائی سے بچانا مجھ کو۔

☆ نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو۔

☆ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ۔

☆ فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں۔

⑩ حالی نے کہا:

فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

کہ جن سختیوں کو اٹھانا ہے مشکل
وہی ہیں کچھ اے دل اٹھانے کے قابل

⑪ آج کا خیال:

جو سیکھو سبھی کو سکھاتے چلو
دیئے سے دیئے کو جلاتے چلو

⑫ آج کی تعلیمی شخصیت:

الغزالی۔ 1101ء تا 1188ء Truely

⑬ آج کی کتاب:

الغزالی کی ''احیاء العلوم''۔

⑭ آج کی محسن شخصیت:

ماں!!

☆ اللہ کی رحمت ...... ماں!

☆ جنت کا راستہ...... ماں!

☆ ہر تکلیف میں پہلا سہارا ...... ماں!

☆ دُکھ سُکھ کی ساتھی ...... ماں!

☆ ہر خوف سے امان ...... ماں!

☆ زندگی میں پہلا رول ماڈل Role Model...... ماں!

⑮ قوم کے گمنام محسنوں کو سلام۔ ہر اچھی ٹیچر کو سلام!

⑯ کورس کی شمع جلانے کے لیے میں دعوت دیتی ہوں...... صاحبہ کو۔

⑰ سلطانہ فاؤنڈیشن زندہ باد۔ پاکستان زندہ باد!

⑱ قومی ترانہ!



Teacher's Exposure Time

پروگرام ٹیچرز مارننگ اسمبلی

تاریخ............................ دن........................ وقت..................

① السلام علیکم، آپ کی میزبان.............................. میرا تعلق.................. سلطانہ
فاؤنڈیشن سکول سے ہے۔
آج کی صبح اس ٹیچر کے نام جسے استاد ہونے پر فخر ہے۔
اسمبلی کا آغاز اللہ کے پاک کلام سورۃ العصر سے......

② سورۃ العصر:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالۡعَصۡرِ ۝ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ۝

③ ترجمہ: ''زمانے کی قسم! انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔''

④ انگریزی ترجمہ:

In the name of Allah, Most Gracious Most Merciful, By the time. Truely man is in loss. Except such as have Faith and do righteous deeds and join together in the mutual

learning of Truth and of patience and consistency.

⑤ نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

خطا کار سے درگزر کرنے والا
بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اُتر کر حِرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

⑥ آج کی حدیث

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

❁ عالموں کے پاس بیٹھنا عبادت ہے۔
❁ مسلمانو! عالموں کی تعظیم کیا کرو۔
❁ اعلیٰ ترین صدقہ یہ ہے کہ ایک مسلمان علم سیکھے اور دوسرے مسلمان کو سکھائے۔
❁ قابل رشک ہے جسے اللہ نے علم عطا فرمایا اور وہ لوگوں کو علم سکھاتا ہے۔
❁ جس علم سے کسی کو فائدہ نہ پہنچے وہ اس خزانے کی مثل ہے۔ جس سے کچھ خرچ نہ کیا جائے اور کسی کو فائدہ نہ پہنچے۔
❁ جو شخص کسی علم میں اس لیے تحقیق کرے کہ اس سے آئندہ نسلوں کو فائدہ پہنچے گا تو اس کو خدا ریت کے ذروں کے برابر ثواب عطا کرے گا۔
❁ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب میں وہ عالم ہو گا جس کے علم سے دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

⑦ سلطانہ فاؤنڈیشن کا پیغام:

علم حاصل کرو اور علم پیدا بھی کرو۔

⑧ قائداعظم نے فرمایا:

☆ اپنے کردار کی تعمیر کیجیے۔

☆ Discipline First

☆ Islam is the shut anchor of Pakistan.

☆ Tolerance and good will for all.

⑨ اقبال نے پیغام دیا:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
بے لوث محبت ہو، بیباک صداقت ہو

⑩ آج کی شخصیت:

افلاطون۔ Plato

عظیم فلسفی سقراط کا نامور شاگرد اور ایک نامور فلسفی ارسطو کا استاد 447 قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اس نے سقراط کے خیالات کو مکالمات کی شکل میں لکھا۔

⑪ آج کی کتاب:

افلاطون کی کتاب The Republic

جو فلسفہ تعلیم پر دنیا کی پہلی کتاب ہے۔

⑫ آج کا خیال:

Plato said: The aim of education is the welfare of both the individual and the society.

⑬ A Teacher's Self Task

⑭ کورس کی شمع روشن کرنے کے لیے میں دعوت دیتا ہوں جناب................کو

⑮ سلطانہ فاؤنڈیشن زندہ باد۔ پاکستان زندہ باد!



Teacher's Exposure Time

پروگرام ٹیچرز مارننگ اسمبلی

تاریخ.............................دن.......................وقت..................

① السلام علیکم، آپ کی میزبان............................ میرا تعلق.................. سلطانہ فاؤنڈیشن سکول سے ہے۔

② سورۃ العصر:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالۡعَصۡرِ o اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ o اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ o

③ ترجمہ: ''زمانے کی قسم! انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔''

④ انگریزی ترجمہ:

In the name of Allah, Most Gracious Most Merciful, By the time. Truely man is in loss. Except such as have Faith and do righteous deeds and join together in the mutual learning of Truth and of patience and consistency.

⑤ نعت رحمۃ اللعالمین ﷺ

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرہ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

(اقبالؔ)

⑥ رسول اللہ ﷺ نے دُعا فرمائی:

❁ یااللہ! میں تجھ سے ایسے علم کا طلب گار ہوں جو فائدہ پہنچائے۔
❁ یا اللہ! مجھے نفع دے اس علم سے جو تو نے مجھے دیا ہے اور مجھے عطا کر وہ علم جو مجھے نفع دے۔
❁ یااللہ! میں تجھ سے ہدایت طلب کرتا ہوں پرہیزگاری، کردار اور فراخ دلی کی۔
❁ یااللہ! میری زندگی کو ہر بھلائی میں اضافے کا سبب بنا دے۔
❁ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا.

ترجمہ: ''اے میرے ربّ میرے علم میں اضافہ فرما۔''

⑦............

Quaid-e-Azam said:
Islam is a code of life.
One God, One Book, One Prophet, One Nation.
Build quickly and well.
Clean in though, word and deed.
Spread the light far and wide.
I'm a solider of Pakistan.

⑧ علامہ محمد اقبال نے فرمایا:

☆ پوشیدہ قرار میں اجل ہے۔
☆ غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں۔

☆ شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا۔

☆ مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

⑨ آج کی تعلیمی شخصیت:

امریکی مفکر جان ڈیوی۔ John Deway

زمانہ حیات: 1859ء۔ 1952ء

⑩ آج کی کتاب:

جان ڈیوی کی کتاب: "Democracy and Education"

⑪ آج کا خیال:

جان ڈیوی نے کہا:

Learning is by doing

⑫ استاد کے تین رول:

مدرس...... Instructor

معلم...... Educator

اور مربی...... Mentor

⑬ مٹی کا دیا اور دسمبر کا گلاب

⑭ ایک استاد کی Self-Image

⑮ کورس کی شمع روشن کرنے کے لیے میں دعوت دیتا ہوں جناب.................کو

⑯ سلطانہ فاؤنڈیشن زندہ باد۔ پاکستان زندہ باد!

⑰ قومی ترانہ!!



Teacher's Exposure Time

پروگرام ٹیچرز مارننگ اسمبلی

تاریخ.......................دن.......................وقت.................

① السلام علیکم، آپ کی میزبان............................میرا تعلق.................سلطانہ فاؤنڈیشن سکول سے ہے۔
آج کی صبح اس ٹیچر کے نام جو سیکھنا چاہتا ہے۔
اسمبلی کا آغاز اللہ کے پاک کلام سورۃ العصر سے......

② سورۃ العصر:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ o اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ o

③ ترجمہ: ''زمانے کی قسم! انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔''

④ انگریزی ترجمہ:

In the name of Allah, Most Gracious Most Merciful, By the time. Truely man is in loss. Except such as have Faith and do righteous deeds and join together in the mutual learning of Truth and of patience and consistency.

⑤ نعتِ رسولِ رحمت ﷺ

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

⑥ آج کی حدیث:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا.

''میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

⑦ سلطانہ فاؤنڈیشن کا پیغام:

یقیں افراد کا سرمایہ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیرِ ملت ہے

⑧ قائداعظم نے فرمایا:

☆ پاکستان اسلام کی تجربہ گاہ ہے۔

Pakistan is the laboratory of Islam.

☆ قلم تیز چلتا ہے تلوار سے۔

Pen is stronger than sword.

⑨ علامہ محمد اقبال نے فرمایا:

ہو تیری خاک کے ہر ذرہ سے تعمیر حرم

⑩ آج کی شخصیت:

دُنیا کا پہلا ماہر تعلیم سقراط جو 469 قبل مسیح میں ایتھنز (یونان) میں پیدا ہوا۔ 399 قبل مسیح میں تلاش حق میں زہر کا پیالہ پی کر جان دی۔

⑪ سقراط نے کہا:

علم خیر کثیر ہے۔

Knowledge is Virtue.

Knowlede is the greatest good.

جہالت ہی بُرائی ہے۔

Ignorance is Vice.

⑫ آج کا خیال:

☆ آدمی اور انسان میں فرق ہے۔

☆ علم اور معلومات میں فرق ہے۔

⑬ استاد کے تین رول:

① مدرس Instructor

② معلم Educator

③ اور مربی Mentor

⑭ Teacher's Prayer.

⑮ ورکشاپ کی شمع روشن کرنے کے لیے میں دعوت دیتی ہوں .... صاحبہ کو

⑯ سلطانہ فاؤنڈیشن زندہ باد۔ پاکستان زندہ باد!

⑰ قومی ترانہ!!



Teacher's Exposure Time

پروگرام ٹیچرز مارننگ اسمبلی

تاریخ.......................دن.......................وقت.................

① السلام علیکم، آپ کی میزبان.............................میرا تعلق.................سلطانہ
فاؤنڈیشن سکول سے ہے۔
آج کی صبح اس ٹیچر کے نام جو سیکھنا چاہتی ہے۔
اسمبلی کا آغاز اللہ کے پاک کلام سورۃ العصر سے......

② سورۃ العصر:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالۡعَصۡرِ ۝ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ۝

③ ترجمہ: ''زمانے کی قسم! انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔''

④ انگریزی ترجمہ:

In the name of Allah, Most Gracious Most Merciful, By the time. Truely man is in loss. Except such as have Faith and do righteous deeds and join together in the mutual learning of Truth and of patience and consistency.

⑤ نعت رسول مقبول ﷺ:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

⑥ آج کی حدیث:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

❁ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا.

”میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“

❁ علم نور ہے۔

❁ علم خیر ہے۔

❁ علم کی تلاش جہاد ہے۔

❁ علم دین کا ستون ہے۔

❁ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

❁ علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین ہی جانا پڑے۔

⑦ Pakistan Song............

Fair and peaceful Pakistan.
Fair and peaceful Pakistan.
Bright and beautiful Pakistan.
Great and strong Pakistan.

⑧ سلطانہ فاؤنڈیشن کا پیغام:

یقیں افراد کا سرمایہ تعمیر ملت ہے۔

⑨ قائداعظم نے فرمایا:

✪ کام، کام، کام۔

✪ اتحاد، ایمان، تنظیم۔

Unity, Faith, Discipline.

☆ علم روشنی ہے۔
☆ علم عافیت ہے۔
☆ قلم تیز چلتا ہے تلوار سے۔

Pen is stronger than sword.

⑩ علامہ محمد اقبال نے فرمایا:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے
نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

⑪ آج کی تعلیمی شخصیت:
دنیا بھر کے تعلیمی بچوں کی ماں...... ڈاکٹر ماریہ مانٹیسوری۔

⑫ آج کا خیال:
☆ علم اور معلومات میں فرق ہے۔
☆ آدمی اور انسان میں فرق ہے۔

⑬ خواتین کا ترانہ:

ہم مائیں، بہنیں، بیٹیاں
قوموں کی عزت ہم سے ہے
ہم مائیں، بہنیں، بیٹیاں
تاریخ نے خود لکھ دیا
انساں عبارت تم سے ہے

⑭ کورس کی شمع روشن کرنے کے لیے میں دعوت دیتی ہوں ....کو
⑮ سلطانہ فاؤنڈیشن زندہ باد۔ پاکستان زندہ باد!
⑯ قومی ترانہ!!



تتمہ

- کتابوں کی دُنیا
- تاریخ پر ایک نظر
- نئے طلبا کے نام ایک خط

کتابوں کی دُنیا

انسانی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی معاشرہ کسی قدر منظّم ہوا ہے اور انسان نے تہذیبی زندگی شروع کی ہے، کتاب کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود رہی ہے۔ کتاب موجودہ صورت میں حال ہی کی ایجاد ہے۔قدیم زمانے میں کتابیں درختوں کے پتوں، چھال، سوتی اور ریشمی کپڑوں، مٹی کی ٹکیوں، تختیوں، چمڑے کے ٹکڑوں اور پیپرس پر لکھی جاتی تھیں۔

پیپرس ایک طرح کا کاغذ تھا۔قدیم مصری ایک خاص قسم کے سرکنڈے کے گودے کو کاٹ کر کاغذ بنایا کرتے تھے اور اس کو پیپرس کہتے تھے۔موجودہ لفظ پیپر بھی اسی سے بنا ہے۔ یہ مخصوص سرکنڈہ جس سے مصری کاغذ بنایا کرتے تھے دریائے نیل کی وادیوں میں پایا جاتا تھا۔کئی صدیاں گزرنے کے بعد جاپان اور چین میں شہتوت کی لکڑی سے بھی کاغذ بنایا جانے لگا۔

قدیم مصر یا شام میں کتاب اس اینٹ، قرص یا مٹی کی اس تختی کو کہتے تھے جس پر کچھ علامتیں کندہ ہوتی تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تورات بھی پتھروں پر کندہ کی گئی تھی۔مصر میں لفظ کتاب نقشہ کی طرح لکڑی کی ڈنڈی پر لپٹے ہوئے چرمی کاغذ کے لیے مستعمل تھا۔جس پر عبارت لکھی ہوتی تھی۔قدیم روم اور یونان میں بھی کتاب سے یہی مفہوم لیا جاتا تھا۔

سب سے قدیم کتب خانہ نینوا کے کھنڈرات سے برآمد ہوا ہے۔اس میں جو کتابیں ہیں وہ پہلے مٹی کی کچی تختیوں پر تحریر کی گئی تھیں اور پھر ان تختیوں کو پکایا گیا تھا۔

مصر کے ٹالمی عہد میں سکندریہ میں دو عظیم الشان کتب خانوں کی بنیاد رکھی گئی لیکن وہ زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ پہلے کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ مطبوعہ کتابیں اگرچہ پندرہویں صدی عیسوی میں یورپ میں رائج ہوئی تھیں لیکن طباعت کی ایجاد کا سہرا چینیوں کے سر ہے۔

قدیم ترین کتاب 11 مئی 868ء کو چھاپی گئی۔ اس کی ابتدا ٹھپے کی چھپائی سے ہوئی۔ ساٹھ ستر سال پہلے چین کے صوبہ کانوں میں یہ کتاب ملی۔ اس کتاب کو ''وانگ چی الیہ'' نے مفت تقسیم کرنے کے لیے چھاپا تھا۔ کتاب چھاپنے کا مقصد یہ تھا کہ اس کے والدین کی یاد کو دوام حاصل ہو۔ حروف کی چھپائی بھی چین میں شروع ہوئی۔ ایک شخص پی تنگ اس کا موجد تھا۔ جس نے 49-1041ء تک ٹائپ میں چھپائی کا کام جاری رکھا۔

اس کے بعد کتاب کی تاریخ، طباعت یا پریس کی تاریخ ہے۔ جب تک پریس کے ذریعہ طباعت کا رواج نہیں ہوا تھا کتب کی فراہمی پر بے اندازہ روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ کاغذ کی ایجاد اور طباعت کے رواج نے کتابوں کو نسبتاً ارزاں کر دیا۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا یورپ میں مطبوعہ کتابیں پندرہویں صدی عیسوی میں رائج ہو گئی تھیں۔ لیکن برصغیر پاک و ہند میں طباعت کی ابتدا سترہویں صدی میں ہوئی۔

مغل بادشاہ اگرچہ ہر نئی چیز کا خیر مقدم کرتے تھے لیکن انہوں نے طباعت میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر کے دربار میں جو یورپی مسیحی علما موجود تھے۔ انہوں نے چھپائی کے کچھ نمونے بادشاہ کے سامنے پیش کیے۔ لیکن اکبر نے جو دیدہ زیب قلمی نسخوں کا عادی تھا بھدے ٹائپ کی طباعت کو نظر انداز کر دیا۔ طباعت کا فروغ نہ ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ علمی اور ادبی شہ پاروں کی مانگ بہت محدود تھی۔ اس زمانے میں کتابیں علمی، ادبی اور مذہبی بس تین موضوعات پر ہوا کرتی تھیں۔ اگر کتابوں کی مانگ زیادہ ہوتی تو طباعت کو بھی تیزی سے فروغ ہوتا۔

اگرچہ برصغیر میں سترہویں صدی کے وسط میں چھاپہ خانہ قائم ہو گیا تھا لیکن انگریزوں نے اپنا پہلا چھاپہ خانہ 1674ء میں نصب کیا۔ کاغذ اور ٹائپ کا بہت سا سامان مہیا کیا۔ جلد ہی فارسی اور بنگالی کے ٹائپ ایجاد ہو گئے اور کتابیں چھپنے لگیں۔

1836ء میں لیتھو کی طباعت شروع ہوئی۔ چونکہ یہ ٹائپ کے مقابلہ میں ارزاں تھی

اس لیے بہت جلد مقبول ہوگئی۔ اب تو طباعت میں کمپیوٹر کا استعمال عام ہوگیا ہے۔ آج کل بازاروں میں ہر قسم کی کتابوں کی ریل پیل ہے۔ ہر سائز اور ہر رنگ میں ہر موضوع پر کتابیں مل سکتی ہیں لیکن ہر کتاب، کتاب نہیں ہوتی اور نہ ہی ہر کتاب کا ہر شخص کے لیے پڑھنا مفید ہو سکتا ہے۔ آسانی کے لیے کتابوں کو چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

سنجیدہ کتابیں، نیم سنجیدہ کتابیں، غیر سنجیدہ کتابیں، تفریحی ادب۔ چوتھے نمبر پر وہ نام نہاد کتابیں نظر آتی ہیں جنہیں اصولاً تو کتابیں نہیں کہا جا سکتا البتہ صورت وشکل سے وہ ضرور کتابیں نظر آتی ہیں۔ سنجیدہ کتابوں کے قاری بہت کم نظر آتے ہیں۔ نیم سنجیدہ کتابوں کے قاری نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کتابوں میں سنجیدہ حصے کم اور غیر سنجیدہ حصے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔ آج کل سب سے زیادہ مانگ غیر سنجیدہ کتابوں میں تفریحی ادب کی ہے۔ چھپنے والی کتابوں کی زیادہ تعداد ان ہی کتابوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ کتابیں وقت کاٹنے یا نیند بلانے کے کام آتی ہیں۔

چوتھی قسم کی کتابیں جیسا کہ کہا گیا ہے، بالکل فضول قسم کی ہوتی ہیں۔ نہ لکھنے والے ان پر فخر کر سکتے ہیں اور نہ ہی پڑھنے والے ان کا نام کھلے بندوں لے سکتے ہیں۔ جب کہا جاتا ہے کہ کتابیں پڑھنی چاہئیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے سنجیدہ کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کبھی کبھار غیر سنجیدہ کتابیں بھی پڑھی جا سکتی ہیں لیکن صرف انہی کتابوں کو اپنے مطالعے کا مرکز بنائے رکھنا سخت بدذوقی بلکہ بدنصیبی ہوگی۔ عظیم کتابوں کی عظیم روشنی سے اپنے آپ کو محروم رکھنا بدنصیبی نہیں تو کیا ہے۔ ہر چھپی ہوئی چیز پڑھنے کے قابل نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض کتابیں (رسالے اور ڈائجسٹ) انتہائی مہلک اثرات رکھتی ہیں۔ بعض انسان دشمن رائٹرز اور حریص اور ظالم پبلشرز صرف پیسہ کمانے کے لیے زہر سے بھرے لٹریچر کو تصویروں وغیرہ سے مزین کر کے بڑے خوبصورت کورز میں چھاپتے رہتے ہیں۔

گھٹیا کتابوں کے بارے میں ''آواز دوست'' میں مختار مسعود نے لکھا ہے:

''صرف رزق ہی سے نہیں، بعض کتابوں سے بھی پرواز میں کوتاہی آتی ہے۔''

اشارہ اقبال کے اس شعر کی طرف ہے۔

اے طاہر لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

کتابوں کے بارے میں انگریزی کا مشہور انشا پرداز فرانسس بیکن لکھتا ہے:

Some books are to be tasted, others to be swallowed and some few to be chewed and digested.

ہر موضوع کی کتاب کا الگ اثر ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں بیکن کہتا ہے:

Histories make man wise, poets, witty, mathematics subtle, natural philosophy (Sciences) deep, morals grave, logic and rehetoric, able to contend.

کتابوں کی قدر و قیمت کے بارے میں ملٹن ایجوکیشن پر اپنے مقالہ میں لکھتا ہے:

A good book is the precious life blood of a master spirit embalmed and treasured up on purpose to a life beyond life.

اچھی کتابیں پڑھنا کیوں ضروری ہے

یوں تو علم انسان اپنے تجربے اور مشاہدے سے بھی حاصل کرتا ہے۔ لیکن ذہین سے ذہین انسان صرف اپنے تجربے سے زندگی بھر بھی سیکھتا رہے تو وہ علم کے اس سمندر کے قطرہ کے برابر بھی نہ ہو گا جو صدیوں بلکہ ہزاروں سال سے ہزاروں لاکھوں ذہین ترین انسانوں نے ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اب تک لاتعداد کتابوں کی شکل میں ہمارے لیے چھوڑا ہے۔ اس لیے کتابیں پڑھنا گویا دنیا کے بہترین دماغوں کے بہترین تجربات سے براہ راست استفادہ کرنے کے مترادف ہے۔

عظیم کتابیں دنیا کے عظیم انسانوں کی طرح ایک نعمت خداوندی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت سے بڑھ کر کوئی اچھی عادت نہیں ہو سکتی۔ کتابیں علم ہی کا نہیں تفریح کا بھی ایک ذریعہ ہوتی ہیں۔ کتاب کو انسان کا بہترین دوست کہا گیا ہے۔ لیکن کتابوں کو Reproductive انداز میں نہیں کہ جو کچھ پڑھا اس پر آنکھ بند کر کے

یقین کر لیا اور اس کو امتحان میں یا امتحان کے کمرہ سے باہر دھرا دیا بلکہ Creative انداز میں پڑھنا چاہیے کہ ذہن کے دریچے کھلے رہیں۔ جو پڑھا ہے اس کو پرکھا بھی جائے، سمجھا بھی جائے۔ اس کا تجزیہ بھی کیا جائے۔ اس کو Interpret کیا جائے بلکہ اس کو Challenge بھی کیا جائے۔ اقبال نے طلبا کو مشورہ دیا تھا کہ

''علم حاصل کرو اور علم پیدا بھی کرو۔''

مکھی پر مکھی مارنے سے، رٹنے رٹانے سے یعنی Convergent Thinking سے علم پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ علم Divergent Thinking سے پیدا ہوتا ہے۔

کتب خانے

آج تک ہونے والی تحقیق کے مطابق سب سے قدیم کتب خانہ نینوا (موجودہ عراق) کے کھنڈرات سے برآمد ہوا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے علمی عروج کے زمانہ میں بڑے بڑے کتب خانے قائم کیے۔ اندلس کی لائبریری اتنی بڑی تھی کہ جب 1221ء میں ہلاکو خان نے بغداد کو تاراج کیا تو لائبریری کی قلمی کتابوں کی سیاہی سے دجلہ کا پانی سیاہ پڑ گیا تھا۔

زمانہ حال کی بڑی بڑی لائبریریوں میں روم میں پاپائے اعظم کی لائبریری سب سے بڑی اور مشہور سمجھی جاتی ہے۔ جو 1588ء میں موجودہ عمارت میں آئی۔ لندن کا برٹش میوزیم، پیرس کی قومی لائبریری، نیویارک کی استور لائبریری اور ماسکو کی لینن لائبریری میں بہت بڑے بڑے کتب خانے ہیں۔ پاکستان میں مرکزی حکومت کا کتب خانہ اور مرکزی عجائب گھر، لیاقت لائبریری کراچی، لاہور میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری، پبلک لائبریری، عجائب گھر کی لائبریری، محکمہ آثار قدیمہ کی لائبریری اور قائداعظم لائبریری اعلیٰ درجے کے کتب خانے ہیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور، دیال سنگھ کالج اور کے۔ ای میڈیکل کالج لاہور کے کتب خانے بھی اچھے کتب خانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے علم دوست اور صاحب ذوق حضرات کے اپنے ذاتی کتب خانے بھی ہیں۔

جو طالب علم صحیح معنوں میں علم کا طالب ہوتا ہے وہ کتابوں کی شکل میں علم کے خزانے کو ضرور جمع کرتا ہے۔ اس خزانے سے بڑھ کر کوئی خزانہ نہیں۔

اُردو کی چند قابلِ مطالعہ کتابیں

①	باغ و بہار	میر امن دہلوی
②	طلسم ہوشربا (انتخاب)	حسن عسکری
③	فسانہ آزاد (انتخاب)	رئیس احمد جعفری
④	مضامین سرسید (انتخاب)	
⑤	خطوط غالب	
⑥	توبۃ النصوح	نذیر احمد
⑦	مسدس حالی	الطاف حسین حالؔی
⑧	سیرت النبی ﷺ	شبلی نعمانی
⑨	قصص الہند	محمد حسین آزاد
⑩	اردات	پریم چند
⑪	سیپارہ دل	خواجہ حسن نظامی
⑫	تذکرہ	ابوالکلام آزاد
⑬	بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم	علامہ محمد اقبال
⑭	گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی
⑮	شاہنامہ اسلام	حفیظ جالندھری
⑯	خطبات و تقاریر قائد اعظم	قائد اعظم
⑰	جدوجہد آزادی	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

⑱	دُنیا کی کہانی	ڈاکٹر مجیب
⑲	کمپنی کی حکومت	باری علیگ
⑳	جہان دانش	احسان دانش
㉑	درس زندگی	پطرس بخاری
㉒	پاکستان کی نظریاتی بنیادیں	ڈاکٹر وحید قریشی
㉓	آبِ کوثر، موجِ کوثر، رودِ کوثر	شیخ محمد اکرام
㉔	آوازِ دوست	مختار مسعود
㉕	شہاب نامہ	قدرت اللہ شہاب
㉖	اردو کا انشائی ادب (انتخاب)	ڈاکٹر وحید قریشی
㉗	اقبال کے حضور میں	نذیر نیازی



دُنیا کی عظیم کتابیں

کتابوں کے بارے میں کارلائل لکھتا ہے:

All that mankind has done, thought or gained, is lying as in magic preservation in the pages of books. They are the chosen possession of man.

دُنیا میں چھپی ہوئی کتابیں تو بے شمار ہیں۔ ان میں سے سو عظیم کتابوں کا تعارف ''دنیا کی عظیم کتابیں'' نامی کتاب میں ستار طاہر نے کرایا ہے۔ جس کے شروع میں والٹیر کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:

''آپ کو اس حقیقت کا شعور ہونا چاہیے کہ جب سے دُنیا بنی ہے وحشی نسلوں کو چھوڑ کر دنیا پر کتابوں نے حکمرانی کی ہے۔''

اس کتاب میں جن سو عظیم کتابوں کی نشاندہی کی گئی ہے وہ یہ ہیں:

1۔القران
2۔صحیح بخاری
3۔عہدنامہ عتیق
4۔عہدنامہ جدید
5۔گیتا
6۔اقوال کنفیوشش
7۔دھماپد
8۔گرنتھ صاحب
9۔ایلیڈ۔ ہومر
10۔کلیلہ دمنہ۔
11۔کہانیاں۔ایسپ۔
12۔الف لیلیٰ۔
13۔کنٹری بری ٹیلز چاسر۔
14۔ایڈی پیس۔سوفوکلیز۔

15۔الیکٹرا۔یوری پیڈیز۔

16۔شکنتلا۔کالی داس۔

17۔فیدرا۔راسین۔

18۔ہیملٹ۔شیکسپیئر۔

19۔فاؤسٹ۔گوئٹے۔

20۔اے ڈالز ہاؤس۔ابسن۔

21۔ڈیکمرون۔بوکیچو۔

22۔ڈیوائن کامیڈی۔دانتے۔

23۔فصوص الحکم۔ابن عربی۔

24۔کشف المحجوب۔علی ہجویری۔

25۔شاہنامہ۔فردوسی۔

26۔گلستان۔سعدی۔

27۔مثنوی۔رومی۔

28۔دیوان۔حافظ۔

29۔یوٹوپیا۔مور۔

30۔نیواٹلانٹس۔بیکن۔

31۔پرسپیا۔نیوٹن۔

32۔اصل الانواع۔ڈارون۔

33۔مقدمہ۔ابن خلدون۔

34۔ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن ایمپائر۔گبن۔

35۔اے سٹڈی آف ہسٹری۔ٹائن بی۔

36۔لیوتھن۔ہابز۔

37۔ٹریکیٹس تھیالوجیکو پولیٹیکس۔اسپنوزا۔

38۔ری پبلک۔افلاطون۔

39۔سیاسیات۔ارسطو۔

40۔میڈی ٹیشنز۔ڈیکارت۔

41۔تنقید برعقل محض۔کانٹ۔

42۔فلاسیکل ڈکشنری۔والٹیر۔

43۔پرنس۔میکاویلی۔

44۔معاہدہ عمرانی۔روسو۔

45۔ورلڈ ایز ول اینڈ آئیڈیا۔شوپنہار۔

46۔بینگ اینڈ نتھنگنیس۔سارتر۔

47۔ایستھیٹک۔کروچے۔

48۔پرنسپلز آف سوشیالوجی۔سپنسر۔

49۔اورزرتشت نے کہا۔نطشے۔

50۔کونیسپٹ آف دی ڈریڈ۔کرکیگارڈ۔

51۔کرئیٹیو ایوولیوشن۔برگساں۔

52۔لوجک۔ہیگل۔

53۔رائٹس آف پین۔پین۔

54۔داس کیپیٹل۔مارکس۔

55۔سائیکوانالسز۔فرائیڈ۔

56۔میموریز۔ڈریمزری ملیکشنز۔ژونگ۔

57۔پلگرمز پراگریس۔بنین۔

58۔جیسٹن۔دی سیڈ۔

59۔لامزرابیلز۔ہیوگو۔

60۔سکارلٹ لیٹر۔ہاتھیورن۔

61۔ڈیڈ سولز۔گوگول۔

62۔انکل ٹام کیبن۔ہیریٹ سٹوو۔

63۔ودرنگ ہائیٹس۔ایملی برونٹے۔

64۔فادر اینڈ سنز۔ترگنیف۔

65۔ہیروآف آور ٹائمز۔لرمنتوف۔
66۔ریڈ اینڈ دی بلیک۔ستاں وال۔
67۔ریمبرینس آف تھنگز پاسٹ۔پروست۔
68۔دی ٹرائل۔کافکا۔
69۔مادام بوواری۔فلوبیئر۔
70۔ماں۔گورکی۔
71۔فرام ارتھ ٹو دی مون۔ورن۔
72۔برادرز کرمازوف۔دوستوفسکی۔
73۔ڈیوڈ کاپرفیلڈ۔ڈکنز
74۔دی نیٹوسن۔رائٹ۔
75۔ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائیڈ۔سٹونسن۔
76۔رابنسن کروسو۔ڈیفو۔
77۔موبی ڈک۔میلول۔
78۔گلیورز ٹریولز۔سوئفٹ۔
79۔کاؤنٹ آف مانٹی کرسٹو۔ڈوما۔
80۔ہیومن کامیڈی۔بالزاک۔
81۔وار اینڈ پیس۔ٹالسٹائی۔
82۔ڈان کیخوٹے۔سروانٹیز۔
83۔یولیسز۔جوائس۔
84۔نظمیں۔پوشکن۔
85۔بدی کے پھول۔بودلیئر۔
86۔رباعیات۔عمر خیام۔
87۔لیوز آف گراس۔وہمین۔
88۔اے سیزن ان دی ہل۔راں بو۔
89۔ایلیجیز۔رلکے۔
90۔ویسٹ لینڈ۔ایلیٹ۔
91۔کینٹوز۔پونڈ۔
92۔جاوید نامہ۔علامہ محمد اقبال۔
93۔فیری ٹیلز۔اینڈرسن۔
94۔چھوٹی بڑی کہانیاں۔چیخوف۔
95۔منتخب کہانیاں۔او ہنری۔
96۔کہانیاں۔موپساں۔
97۔والڈن۔تھوریو۔
98۔سینچریز۔نوسٹراڈامس۔
99۔تشکیل انسانیت۔رابرٹ بربغالت۔
100۔شاخ زریں۔فریزر۔



تاریخ پر ایک نظر

(اجمالی جائزہ)

تاریخ پر ایک نظر

1۔ دُنیا کی قدیم ترین تہذیبیں؟

❁ مصر میں دریائے نیل کے کنارے کی تہذیب ۵۰۰۰ ق۔م۔ عراق میں دجلہ و فرات کے کنارے کی سمیری تہذیب ۳۰۰۰ ق۔م۔ مشہور بابل و نینوا کی تہذیب ۲۰۰۰ ق۔م۔

2۔ ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اس شعر میں عشق کا اشارہ کس کی طرف ہے؟

❁ خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف۔

3۔ نمرود کون تھا؟

❁ عراق کا بادشاہ وقت، زمانہ ۲۰۰۰ ق۔م۔

4۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وطن اور زمانہ؟

❁ وطن فرات کے کنارے کا شہر، ملک عراق، زمانہ ۲۰۰۰ ق۔م۔

5۔ ؎

دُنیا کے بُت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

اس شعر میں اشارہ کس گھر کی طرف ہے؟

❁ بیت اللہ، خانہ کعبہ کی طرف۔

6۔ بیت اللہ خانہ کعبہ کو سب سے پہلے کس نے تعمیر کیا؟

❁ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ۲۰۰۰ ق۔م۔

7۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ابوالانبیاء علیہم السلام کیوں کہا جاتا ہے؟

❁ حضرت ہاجرہ علیہا السلام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے اور ان کے سلسلۂ نسب میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے جبکہ حضرت سارہ علیہا السلام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام بھی نبی تھے اور ان کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام (جن کا نام اسرائیل بھی تھا) کی اولاد میں بہت سے انبیا علیہم السلام حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت داوٴد علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ابوالانبیاء علیہم السلام کہا جاتا ہے۔

8۔ ؎

ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کر ضرب کلیم پیدا کر

ضرب کلیم سے کیا مراد ہے؟

❁ کلیم اللہ لقب ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اور ضربِ کلیم اشارہ ہے فرعون وقت کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے معجزہ کی طرف۔

9۔ بنی اسرائیل کے نجات دہندہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ حیات کیا ہے؟ اور بنی اسرائیل کے ساتھ مصر میں تاریخ خروج؟

❁ زمانہ حیات ۱۵۷۱ق۔م۔اور تاریخ خروج ۱۵۰۰ق۔م۔

10۔ اہرام مصر کا زمانہ تعمیر؟

❁ ۲۷۰ تا ۲۰۰۰ق۔م۔

11۔ موہنجوداڑو کا زمانہ؟ موہنجوداڑو کے لفظی معنی؟ یہ آثار کہاں واقع ہیں؟

❁ زمانہ ۲۵۰۰ق۔م۔بمعنی مردوں کا ٹیلہ، آثار لاڑکانہ سندھ سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر۔

12۔ پاکستان کے دوسرے اہم آثار قدیمہ کہاں کہاں پائے جاتے ہیں؟

❁ ہڑپہ (ساہیوال کے قریب) ٹیکسلا (پنڈی کے قریب)، تخت بائی (مردان کے قریب)۔

13۔ وہ عظیم اندھا عوامی شاعر جس نے قدیم یونانی تہذیب کے گیت گائے۔اس کا نام؟ اوراس کی شاہکار رزمیہ نظموں کے نام؟

❁ نام، ہومر۔ زمانہ ۸۰۰ق۔م۔، نظموں کے نام Iliad اور Eniad۔

14۔ اولین اولمپک کھیل یونان میں کب شروع ہوئے؟

❁ ۷۶۰ق۔م۔

15۔ عظیم سلطنت روما Roman Empire کے مرکز روم کی بنیاد کب پڑی؟

❁ ۷۰۰ق۔م۔

16۔ کپل وستو کا وہ شہزادہ جس نے فقیری لے کر نروان کی تلاش میں ایک پیڑ کے نیچے دھیان گیان کیا اور ایک مذہب کی بنیاد رکھی۔اس کا نام؟ اور مذہب کا نام؟

❁ نام سدھارتھ گوتم بدھ۔ زمانہ ۵۶۰ تا ۴۸۳ق۔م مذہب بدھ مت۔

17۔ وہ مفکر، مدبر اور معلم اخلاق جو قدیم چین میں ایک مثالی حکمران کی تلاش میں نکلا؟ اس کا نام اور زمانہ حیات؟

❁ کنفیوشس، زمانہ ۵۵۱ تا ۴۷۹ق۔م۔

18۔ دُنیا میں جمہوریت کا پہلا چراغ یونان میں روشن ہوا۔ یہ کتنی پرانی بات ہے؟

❁ ۵۱۰ق۔م۔

19۔ وہ یونانی مورخ جسے بابائے تاریخ کہا جاتا ہے؟

❁ ہیروڈوٹس Herodotus ۴۸۵ تا ۴۲۵ق۔م۔

20۔ وہ عظیم یونانی فلسفی جس نے سچائی کی خاطر زہر کا پیالہ پیا۔ جس کا قول تھا کہ Knowedge is Virtue۔علم خیر کثیر ہے؟

❁ سقراط Socrattes زمانہ ۴۶۹ تا ۳۹۹ق۔م۔

21۔ سقراط کا نامور فلسفی شاگرد؟ اس کی مشہور کتابوں کے نام؟

❁ افلاطون Plato۔ زمانہ ۴۴۷ تا ۳۴۷ق۔م۔ معروف کتابوں کے نام مکالمات افلاطون اور ریاست The Republic

22۔ ارسطو کون تھا اور اس کی اکیڈمی کا نام کیا تھا؟

❁ افلاطون کا شاگرد، سکندر کا استاد نامور فلسفی اور سائنس دان۔ اکیڈمی کا نام لائی سئیم

Lyciuwl دور حیات ۳۸۴ تا ۳۲۲ ق۔م۔

23۔ فاتح عالم سکندر اعظم Alexander the Great جو ایک عظیم جرنیل ہی نہیں عظیم انسان بھی تھا۔ جس نے ایران کی مہم کے دوران کہا تھا I do not want to steal victory۔ اس کا زمانہ حیات؟

❁ ۳۵۶ تا ۳۲۳ ق۔م۔

24۔ وہ کون یونانی سائنس دان تھا جو Eureka, Eureka یعنی I have found, I have found کہتا ہوا باتھ ٹپ میں سے برہنہ نکل کر بازار کی طرف بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کون سا اصول دریافت کر لیا تھا؟ اس کا زمانہ؟

❁ نام ارشمیدس، اصولِ ارشمیدس، زمانہ ۲۱۲ تا ۲۸۷ ق۔م۔

25۔ مشہور فاتح اور جرنیل ہنی بال رومیوں سے کب نبرد آزما ہوا؟

❁ ۲۱۹ تا ۲۰۱ ق۔م۔

26۔ دیوار چین کتنی لمبی ہے؟ اس کا زمانہ تعمیر؟

❁ ۲۴۰۰ کلومیٹر۔ زمانہ ۲۱۵ ق۔م۔

27۔ Brutus, you too یہ تاریخی جملہ کس موقع کا ہے؟

❁ جب رومی شہنشاہ اور جرنیل جولیس سیزر (۱۰۴ تا ۴۴ ق۔م۔) پر اس کے پرانے دوست بروٹس نے بھی قاتلانہ وار کیا۔ یہ جملہ شیکسپیئر کے ڈرامہ جولیس سیزر میں آتا ہے۔

28۔ ایک چینی سیاح نے ۳۹۹ء سے ۴۱۳ء تک ہندوستان کی سیاحت کی اور اپنا سفر نامہ لکھا۔ اس کا نام کیا تھا؟

❁ فاہیان۔

29۔ وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا۔ رحمۃ اللعالمین ﷺ، رسول رحمت ﷺ جن کی شان میں اقبال نے لکھا ''لوح بھی تُو قلم بھی تُو تیرا وجود الکتاب'' آپ ﷺ کی تاریخ ولادت کیا ہے؟

❁ ۲۰/ اپریل ۵۷۰ء۔ ۱۲/ ربیع الاوّل بروز پیر بوقت صبح۔

30۔ حضور نبی کریم ﷺ پر پہلی وحی ''اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ '' کب اور کہاں نازل ہوئی؟

❁ ۱۲/فروری ۶۱۰ء، مقام غارِحرا۔

31۔ کس سال آپ ﷺ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی؟

❁ ۶۲۱ء۔

32۔ کس جنگ میں حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سیف اللہ کا لقب عطا فرمایا؟

❁ جنگ موتہ۔ ۸ھ۔ ۶۲۹ء۔

33۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ''الیوم یوم رحمتہ'' کس موقع پر ارشاد فرمایا؟

❁ فتح مکہ کے موقع پر ۹ھ۔ ۶۳۰ء۔

34۔ حضور نبی کریم ﷺ کا وصال اور روضۂ انور؟

❁ ۱۲/ربیع الاوّل ۱۱ھ بمطابق ۶ جون ۶۳۲ء۔ روضۂ انور مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔

35۔ ؎

پروانے کو چراغ ہے بُلبُل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے خدا کا رسول ﷺ بس

حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو صدیق کا لقب کس موقع پر عطا فرمایا؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت؟

❁ معراج کے موقع پر، دورِ حیات ۵۷۲ء تا ۶۳۴ء۔ دورِ خلافت ۳۴۔۶۳۲ء۔

36۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جنہیں خود رسول اللہ ﷺ نے اللہ سے اسلام کے لیے مانگا اور جو معرکہ حق و باطل میں فاروقِ اعظم ثابت ہوئے آپ رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت؟

❁ ۴۴۔۶۳۴ء۔ جس کی تفصیل شبلی کی الفاروق میں ہے۔

37۔ جنگِ یرموک میں قیصرِ روم کی افواج کو شکست فاش ہوئی۔ اس تاریخی معرکہ میں اسلامی لشکر کو کس نے کمان کیا تھا؟

❁ ۶۳۶ء۔ کمانڈر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ۔

38۔ قبلہ اوّل بیت المقدس پر اسلامی پرچم کب لہرایا؟

❁ ۶۳۸ء۔حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت۔

39۔ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کو ذوالنورین کہا جاتا ہے۔آپ رضی اللہ عنہ کا دورِ حیات اور زمانہ خلافت؟

❁ دورِ حیات ۵۷۵ء تا ۶۵۶ء اور زمانہ خلافت ۶۴۴-۶۵۶ء۔

40۔ اسد اللہ حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ جن کا لقب ابوتراب بھی ہے کب سے کب تک خلیفہ رہے؟

❁ ۶۵۶-۶۶۱ء۔

41۔ علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کے شکوہ کا شعر ہے:

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

یہ اشارہ کس معرکہ کی طرف ہے؟

❁ فاتحِ شمالی افریقہ۔عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ، ۶۸۱ء۔

42۔ محمد علی جوہر نے کہا۔اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔کربلا کا سانحہ عظیم کب پیش آیا؟

❁ ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ بمطابق ۶۸۲ء۔

43۔ کس جواں سال مجاہد نے اجنبی دیس میں کشتیاں جلاتے ہوئے تلوار پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا ''ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست۔''

❁ طارق بن زیاد، مقام جبرالٹر (جبل الطارق) اندلس ۷۱۱ء۔

44۔ ہند کے بُت کدہ میں پہلی فاتحانہ اذان؟

محمد بن قاسم، ۷۱۲ء۔یوم باب الاسلام ۱۰ رمضان۔

45۔ خلافتِ راشدہ کی ایک جھلک دُنیا نے اُموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دور میں دیکھی۔آپ کا زمانہ خلافت؟

❁ از ۷۱۷ تا ۷۱۹ء۔آپ کو زہر دے کر شہید کیا گیا۔

46۔ ایک بے خانماں اُموی شہزادہ اُندلس میں اسلامی حکومت کا آغاز کرتا ہے؟
❁ عبدالرحمٰن الداخل۔ زمانہ حیات ۸۶۔۷۳۰ء۔ آغاز حکومت ۷۵۶ء۔
47۔ اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود۔ مسجد قرطبہ کب تعمیر ہوئی؟
❁ عبدالرحمٰن الداخل کے عہد میں مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔
48۔ آٹھویں صدی عیسوی میں دُنیا میں تہذیب وعلم وفن کا روشن مرکز اور الف لیلیٰ کی افسانوی داستانوں کا شہرعروس البلاد، بغداد کس عباسی خلیفہ کے دور میں اُبھرا؟
❁ ہارون الرشید، زمانہ خلافت ۸۰۹ء۔۷۶۳ء۔
49۔ پہلا نامور مسلمان سائنس دان جابر بن حیان، پیدائش؟
❁ ۷۷۶ء۔
50۔ مامون الرشید کا دورِ حیات؟ زمانہ خلافت؟
❁ دور خلافت ۳۳۔۸۰۹ء، دورِ حیات ۸۳۳ء۔۷۸۶ء۔
51۔ احادیث کے پہلے معروف اور مستند مجموعہ بخاری شریف کے مرتب امام بخاری رحمہ اللہ کا زمانہ حیات؟
❁ ۸۱۰ء تا ۸۷۰ء۔
52۔ اسلامی تاریخ کا مورخ اوّل، طبری، زمانہ حیات؟
❁ ۸۳۸ء تا ۹۳۳ء۔
53۔ مشہور سائنس دان اور فلسفی ذکریا رازی کا زمانہ حیات؟
❁ ۸۶۵ء تا ۹۲۵ء۔
54۔ عبدالرحمٰن الناصر جس نے اندلس میں اسلامی حکومت کو مستحکم کیا۔ زمانہ حیات؟
❁ ۸۸۰ء تا ۹۶۱ء۔
55۔ پہلا مسلم سیاح المسعودی، زمانہ حیات؟
❁ ۸۹۲ء تا ۹۵۶ء۔
56۔ مشہور ماہر طبیعیات ابن الہیثم کا دورِ حیات؟
❁ ۹۶۵ء تا ۱۰۳۹ء۔

57۔ میں بُت فروش نہیں، بُت شکن ہوں۔ یہ الفاظ کس نے کس موقع پر کہے؟

❁ محمود غزنوی نے، موقع فتح سومنات۔ ۱۰۲۶ء، دورحیات ۹۷۱ء تا ۱۰۳۱ء۔

58۔ جغرافیہ داں اور مورخ البیرونی کا دور حیات؟

❁ ۹۷۳ء تا ۱۰۴۸ء۔

59۔ مشہور صوفی بزرگ حضرت داتا گنج بخش رحمہ اللہ کی تاریخ وفات؟

❁ ۱۰۰۹ء۔ مزارِ مبارک لاہور میں۔

60۔ عظیم ایرانی شاعر، فردوسی۔ شاہنامہ مکمل کرتا ہے؟

❁ ۱۰۲۲ء۔

61۔ ریاضی داں اور شاعر عمرِ خیام کا دورِ حیات؟

❁ ۹۴ء۔ ۱۰۴۸ء۔

62۔ جرنیل اور حاکم یوسف بن تاشفین جس نے اُندلس میں اسلامی حکومت کا علم بلند رکھا، زمانہ حیات؟

❁ ۱۰۶۱ء تا ۱۱۰۶ء۔

63۔ مفکر، مدبر، ماہرِ تعلیم، اسلامی علم الکلام کے بادشاہ کیمیائے سعادت کے مصنف الغزالی کا زمانہ حیات؟

❁ ۱۰۵۸ء تا ۱۱۱۱ء۔

64۔ صلیبی جنگوں کا آغاز کب ہوا؟

❁ ۱۰۷۱ء۔

65۔ پیرانِ پیر حضرت الشیخ عبدالقادر جیلانی الحسنی والحسینی رحمہ اللہ کا دورِ حیات؟

❁ ۱۰۷۶ء تا ۱۱۷۶ء۔

66۔ صلیبی جنگوں کے ہیرو صلاح الدین ایوبی کا دورِ حیات؟

❁ ۱۱۳۸ء تا ۱۱۹۳ء۔

67۔ ہند کے بُت کدہ میں پہلی آوازِ حق حضرت معین الدین چشتی اجمیری رحمہ اللہ نے بلند کی۔ آپ کا دورِ حیات؟

❁ ۱۱۳۹ء تا ۱۲۰۹ء۔

68۔ عالم اور فلسفی زکریا رازی کا زمانہ حیات؟

❁ ۱۱۴۹ء۔ ۱۲۰۹ء۔

69۔ منگول تموجن جسے دنیا جابر فاتح چنگیز خان کے نام سے جانتی ہے؟

❁ ۱۱۶۲ء تا ۱۲۲۷ء۔

70۔ شاعر اور معلم اخلاق، گلستان اور بوستان کا مصنف سعدی شیرازی رحمہ اللہ، زمانہ؟

❁ ۱۱۸۴ء تا ۱۲۹۴ء۔

71۔ صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو صلیبوں کے قبضہ سے کب آزاد کرایا؟

❁ ۱۱۸۷ء۔

72۔ شمالی ہند میں اسلامی حکومت قائم ہوئی؟

❁ ۱۱۹۲ء۔

73۔ علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کے مرشد، مولانا جلال الدین رومی رحمہ اللہ جن کی فارسی مثنوی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ہست قرآن در زبان پہلوی۔ آپ کا زمانہ حیات؟

❁ ۷۳۔ ۱۲۰۷ء۔

74۔ ہلاکو خان منگول کے ہاتھوں سقوط بغداد؟

❁ ۱۲۲۱ء۔

75۔ عظیم منگول شہنشاہ قبلائی خان؟

❁ ۹۴۔ ۱۲۲۶ء۔

76۔ سیاح مارکو پولو جس نے مغرب کو مشرق سے آشنا کیا؟

❁ ۱۲۴۵ء۔ ۱۳۲۴ء۔

77۔ شاعر، موسیقار، صوفی، امیر خسرو؟

❁ دورِ حیات ۱۲۵۳ء تا ۱۳۴۴ء۔

78۔ سلطنتِ عثمانیہ کا بانی عثمان خان؟

❁ ۱۲۵۸ء تا ۱۳۲۴ء۔

79۔ طربیہ خداوندی Divine Comedy کا شاعر دانتے؟

❁ ۱۲۶۵ء تا ۱۳۲۱ء۔

80۔ ابن حمر حاکم غرناطہ اندلس میں قصر الحمرا تعمیر کرتا ہے؟

❁ وفات: ۱۲۷۲ء۔

81۔ فارسی کا شاعر حافظ شیرازی؟

❁ ۸۹۔۱۳۰۰ء۔

82۔ سیاحوں کا سیاح ابن بطوطہ؟

❁ دور حیات: ۷۸۔۱۳۰۴ء۔

83۔ جدید علم تاریخ کا بانی ابن خلدون؟

❁ دورِ حیات: ۱۳۳۲ء تا ۱۴۰۶ء۔

84۔ فاتح اعظم تیمور، دہلی کے دروازہ پر؟

❁ ۱۳۷۸ء۔

85۔ فرانس کی نجات دہندہ دوشیزہ جون آف آرک جسے آگ میں جلایا گیا؟

❁ دورِ حیات: ۳۱۔۱۴۱۲ء۔

86۔ لیونارڈو ڈی ونچی لاثانی پراسرار مسکراہٹ کی تصویر مونالیزا تخلیق کرتا ہے؟

❁ ۱۴۵۲ء۔تا ۱۵۱۹ء، مونالیزا ۱۵۰۳ء۔

87۔ بحر روم کا بے تاج بادشاہ امیر البحر خیر الدین باربروسا؟

❁ ۱۴۷۴ء تا ۱۵۴۶ء۔

88۔ نامور مصور اور سنگ تراش مائیکل انجیلو؟

❁ دورِ حیات: ۱۴۷۵ء تا ۱۵۴۶ء۔

89۔ کیکسٹن (۹۱۔۱۴۲۲ء) چھاپہ خانہ (پرنٹنگ پریس) ایجاد کرتا ہے؟

❁ ۱۴۷۵ء۔

90۔ مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیر الدین بابر؟

❁ ۱۴۸۲ء تا ۱۵۴۵ء۔

91۔ سلطان عادل اور عظیم منتظم فرید خان شیر شاہ سوری؟

❁ ۱۴۸۲ء تا ۱۵۴۵ء۔

92۔ سقوطِ غرناطہ، ابوعبداللہ غرناطہ سے آنسو بہاتا رُخصت ہوتا ہے؟

❁ ۱۴۹۲ء۔

93۔ کولمبس (۱۴۵۱ء تا ۱۵۰۶ء) امریکہ دریافت کرتا ہے؟

❁ ۱۴۹۲ء۔

94۔ سلطنت عثمانیہ کا اولوالعزم تاجدار سلیمان اعظم؟

❁ ۱۴۹۵ء تا ۱۵۶۹ء۔

95۔ واسکوڈی گاما (۱۴۶۹ء تا ۱۵۲۴ء) بحری راستہ سے ہندوستان پہنچتا ہے؟

❁ ۱۴۹۹ء۔

96۔ ترکی میں خلافت عثمانیہ کا آغاز ہوتا ہے؟

❁ ۱۵۰۴ء۔

97۔ موسیقار تان سین دیپک راگ گاتا ہے۔ دورِ حیات؟

❁ ۱۵۳۱ء تا ۱۵۸۵ء۔

98۔ باپ (بابر) بیٹے (ہمایوں) پر جان نثار کرتا ہے؟

❁ ۱۵۳۱ء۔

99۔ مغل شہنشاہ اکبر تخت پر بیٹھتا ہے؟

❁ ۱۵۵۸ء۔ دورحیات: ۱۵۴۲ء تا ۱۶۰۵ء۔

100۔ عظیم شاعر اور ڈرامہ نگار ولیم شیکسپیئر؟

❁ دورِحیات: ۱۵۶۴ء تا ۱۶۴۲ء۔

101۔ حق گو اطالوی سائنس دان گلیلیو؟

❁ دورِحیات: ۱۵۶۴ء تا ۱۶۴۲ء۔

102۔ ے

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

آگرہ میں شاہ جہاں تاج محل تعمیر کرتا ہے؟

❁ دورِحیات: ۱۵۷۴ء تا ۱۶۴۲ء۔

103۔ ولیم ہاروے دوران خون کا اصول دریافت کرتا ہے؟

❁ دورِ حیات: ۱۵۷۸ء تا ۱۶۵۷ء۔

104۔ ہندوستان کی غاصب حاکم انگلستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوتی ہے؟

❁ ۱۶۰۰ء۔

105۔ ترکش مارا خدنگ آخری درویش تاجدار محی الدین اورنگزیب عالمگیر؟

❁ ۱۶۱۸ء تا ۱۷۰۷ء۔

106۔ سیب نیچے کیوں گرتا ہے؟ کشش ثقل کا راز نیوٹن دریافت کرتا ہے؟

❁ دورِ حیات: ۱۶۴۲ء تا ۱۷۲۷ء۔

107۔ نیوٹن تاریخ ساز کتاب Principia لکھتا ہے؟

❁ ۱۶۸۷ء۔

108۔ ہندوستان میں مسلم قومیت کا پہلا ترجمان مدبر، مفکر اور عالم دین شاہ ولی اللہ؟

❁ پیدائش: ۱۷۰۳ء۔

109۔ بینجمن فرینکلن آسمانی بجلی کا توڑ دریافت کرتا ہے؟

❁ ۱۷۰۶ء تا ۱۷۹۰ء۔

110۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کا آغاز۔ اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال؟

❁ ۱۷۰۷ء۔

111۔ ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اردو غزل کا بادشاہ میر تقی میر۔

❁ ۱۷۲۲ء تا ۱۸۱۰ء۔

112۔ سیاح اور Explorer جیمز کک براعظموں کی تلاش میں نکلتا ہے؟

❁ ۱۷۲۸ء تا ۱۷۹۹ء۔

113۔ آرک رائٹ سوت کاتنے کی مشین Spinning ایجاد کرتا ہے؟

❁ دورِ حیات: ۱۷۳۲ء تا ۱۷۹۲ء۔

114۔ پہلا امریکی صدر جارج واشنگٹن؟

❁ زمانہ صدارت: ۹۷۔۱۷۸۹ء، دورِ حیات: ۹۹۔۱۷۳۲ء۔

115۔ شامت اعمال ما صورت نادر گرفت۔ نادرشاہ درانی دہلی کو تاراج کرتا ہے؟

❁ ۱۷۳۸ء۔

116۔ فاوسٹ کا مصنف جرمن شاعر گوئٹے؟

❁ دورِ حیات: ۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۱ء۔

117۔ انسان دوست سائنس دان ایڈورڈ جینز جس نے چیچک کا ٹیکہ دریافت کیا؟

❁ زمانہ حیات: ۱۷۴۹ء تا ۱۸۲۳ء۔

118۔ آزادی کا سرفروش مجاہد سلطان فتح علی ٹیپو شہید؟

❁ ۹۹۔۱۷۵۳ء، شہادت سرنگا پٹم۔۱۷۹۹ء۔

119۔ ایک تاریخ ساز معرکہ، جنگ پلاسی، انگریزی حکومت کا آغاز، نواب سراج الدولہ کو شکست ہوئی؟

❁ ۱۷۵۷ء۔

120۔ پانی پت کی تیسری جنگ میں احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کو شکست فاش دیتا ہے؟

❁ ۱۷۶۱ء۔

121۔ بکسر کی جنگ، ہندوستان کے تخت و تاج کا فیصلہ ہوتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال پر مہر لگتی ہے؟

❁ ۱۷۶۴ء۔

122۔ دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو۔ ایک عظیم جرنیل اور شہنشاہ جو قید میں جان دیتا ہے؟

❁ نپولین بوناپارٹ، دورِ حیات ۱۷۶۹ء تا ۱۸۳۲ء فرانس کا شہنشاہ جسے واٹرلو میں شکست ہوئی۔

123۔ ؎

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

❁ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر۔ دورِ حیات: ۱۷۷۵ء تا ۱۸۶۲ء۔

124۔ قرآن مجید کا پہلا اُردو ترجمہ؟
❁ مترجم شاہ رفیع الدین ۱۷۷۵ء۔
125۔ ریلوے انجن کا موجد؟
❁ جارج سٹیفن ۱۷۸۱ء۔۱۸۴۸ء۔
126۔ امریکہ کی آزادی کا اعلان؟
❁ ۴ جولائی ۱۷۷۶ء، آزادی ۱۷۸۳ء۔
127۔ مجاہد آزادی سید احمد شہید رحمہ اللہ؟
❁ دورِ حیات: ۱۷۸۶ء تا ۱۸۳۱ء، شہادت: بالاکوٹ۔
128۔ فرانس میں عوامی انقلاب آتا ہے؟
❁ ۱۷۸۹ء۔
129۔ یورنیم دریافت ہوتا ہے؟
❁ ۱۷۸۹ء دریافت، جرمن مارٹن کلپ راتھ
130۔ مائیکل فیراڈے۔ برقی مقناطیسیت کا اصول دریافت کرتا ہے؟
❁ دورِ حیات: ۱۷۹۱ء تا ۱۸۶۷ء۔
131۔ تار برقی کا موجد سموئیل مارس؟
❁ دورِ حیات: ۱۷۹۱ء تا ۱۸۷۲ء۔ ایجاد: ۱۷۴۴ء۔
132۔ ملکہ فرانس میری انٹونیو کا سر قلم ہوتا ہے؟
❁ ۱۷۹۳ء۔
133۔ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور؟
❁ اسد اللہ خان غالب، ۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء۔
134۔ اور تلوار ٹوٹ گئی۔ سرنگاپٹم کے قلعہ میں سلطان ٹیپو کی شہادت؟
❁ ۱۷۹۹ء۔
135۔ اُردو کا عظیم مرثیہ گو شاعر۔ میر ببر علی انیس؟
❁ ۱۸۰۱ء تا ۱۸۷۴ء۔

136۔ Theory of Evolution نظریہ ارتقا کا داعی ڈارون؟

❁ ۱۸۰۹ء تا ۱۸۹۸ء۔

137۔ عظیم امریکی صدر ابراہم لنکن؟

❁ ۱۸۰۹ء تا ۱۸۶۵ء۔

138۔ دوقومی نظریہ کا پہلا شارح، پاکستان کا مورث اعلیٰ سرسید احمد خان؟

❁ ۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء۔

139۔ مریضوں کی مسیحا فلارنس نائٹ انگیل؟

❁ ۱۸۲۰ء تا ۱۹۱۰ء۔

140۔ ایک وطن پرست اور انسان دوست سائنس دان لوئی پاسچر جس نے کتے کے کاٹے کا علاج دریافت کیا؟

❁ ۱۸۲۲ء تا ۱۸۹۵ء۔

141۔ دُنیا کے عظیم ترین ناول War and Peace کا مصنف لیوٹالسٹائی؟

❁ ۱۸۲۸ء تا ۱۹۱۰ء۔

142۔ کالے صاحب اور کلرک پیدا کرنے کے لیے لارڈ میکالے ہندوستان کے لیے ایجوکیشن بل پیش کرتا ہے؟

❁ ۱۸۳۲ء۔

143۔ ڈائنا مائٹ کا موجد نوبل انعامات کا بانی الفریڈ نوبل Nobel؟

❁ ۱۸۳۶ء تا ۱۸۹۶ء۔

144۔ مسدس حالی کا مصنف قومی شاعر الطاف حسین حالؔی؟

❁ دورِ حیات: ۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء۔

145۔ مسلمانوں کے اتحاد کا داعی جمال الدین افغانی؟

❁ ۱۸۳۸ء تا ۱۸۹۷ء۔

146۔ بائیسکل ایجاد ہوتی ہے؟

❁ ۱۸۴۰ء۔

147۔ انٹارٹیک دریافت ہوتا ہے؟

❁ ۱۸۴۰ء۔

148۔ ایکس ریز کا دریافت کنندہ؟

❁ رونجن ۱۸۴۵ء تا ۱۹۲۵ء۔

149۔ پنجاب میں انگریزوں کے تسلط کا آغاز؟

❁ ۱۸۴۶ء۔

150۔ پورا جموں وکشمیر ڈوگرہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت ہوتا ہے؟

❁ ۱۸۴۶ء۔ قیمت، ۷۵ لاکھ روپے۔

151۔ ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا یہ ان سے آپ کا پردہ کدھر گیا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

قومی شاعر اکبر حسین الہ آبادی؟

❁ ۱۸۴۶ء تا ۱۹۱۰ء۔

152۔ وہ موجد جسے اشتہار کی ضرورت نہیں۔ بلب اور سینما ایسی بے شمار ایجادوں کا موجد ایڈیسن؟

❁ ۱۸۴۷ء تا ۱۹۳۱ء۔

153۔ جدید نفسیات کا امام سگمنڈ فرائڈ؟

❁ دورِ حیات: ۱۸۵۶ء تا ۱۹۳۳ء۔

154۔ آزادی کا شعلہ بھڑکتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہوتا ہے؟

❁ ۱۸۵۷ء۔

155۔ ایک تاریخ ساز کتاب چھپتی ہے ڈارون کی؟ Origin of Species

❁ ۱۸۵۹ء۔

156۔ لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں۔ مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر انگریزوں کی قید

میں رنگون میں جان دیتا ہے؟

❁ ۱۸۶۲ء۔

157۔ جنیوا میں ریڈ کراس کی بنیاد پڑتی ہے؟

❁ ۱۸۶۳ء۔

158۔ مورخ اور ناول نگار ایچ جی ویلز جنم لیتا ہے؟

❁ ۱۸۶۶ء۔

159۔ ہندوؤں کا بے تاج بادشاہ موہن داس کرم چند گاندھی پیدا ہوتا ہے؟

❁ ۱۸۶۹ء۔

160۔ نہر سویز نکلتی ہے؟

❁ ۱۸۶۹ء۔

161۔ دو بار نوبل انعام یافتہ سائنس دان خاتون مادم کیوری؟

❁ پیدائش: ۱۸۷۱ء۔ نوبل انعام: ۱۹۰۳ء اور ۱۹۱۱ء۔ انتقال: ۱۹۴۴ء۔

162۔ ریڈیو کا موجد مارکونی؟

❁ ۱۸۷۴ء تا ۱۹۳۷ء۔ ایجاد: ۱۸۹۵ء۔

163۔ پاکستان کی بنیادی اینٹ، علی گڑھ کالج کی بنیاد پڑتی ہے؟

❁ ۱۸۷۵ء۔

164۔ گراہم بیل ٹیلی فون ایجاد کرتا ہے؟

❁ ۱۸۷۶ء دورِ حیات: ۱۸۴۷ء تا ۱۹۲۲ء۔

165۔ ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت کے داعی۔ آزادی کے بیباک ترجمان مولانا محمد علی جوہر؟

❁ پیدائش: ۱۸۷۶ء۔ انتقال: ۱۹۳۱ء۔ تدفین: بیت المقدس۔

166۔ مملکت خداداد اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کا بانی، عظیم رہنما، عظیم تر انسان، قائداعظم محمد علی جناح رحمہ اللہ؟

❁ دورِ حیات: ۱۸۷۶ء تا ۱۹۴۸ء۔

167۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ؟

❁ ۱۸۷۷ء تا ۱۹۳۸ء۔

168۔ ترکوں کا نجات دہندہ اتاترک مصطفیٰ کمال؟

❁ ۱۸۷۸ء تا ۱۹۳۸ء۔

169۔ ایڈیسن، سینما ایجاد کرتا ہے؟

❁ ۱۸۷۹ء۔

170۔ زمانہ حال کا عظیم ترین سائنس دان آئن سٹائن جنم لیتا ہے؟

❁ ۱۸۷۹ء۔

171۔ انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوتی ہے؟

❁ ۱۸۸۵ء۔

172۔ تقسیم ہند کے لیے پہلی آواز؟

❁ ۱۸۹۲ء عبدالحلیم شرر۔

173۔ موٹر کار ایجاد ہوتی ہے؟

❁ ۱۸۹۳ء۔

174۔ یونان میں اولمپک کھیل ۳۱۰ء کے بعد دوبارہ شروع ہوتے ہیں؟

❁ ۱۸۹۶ء۔

175۔ ڈیزل انجن کی ایجاد ۱۸۹۷ء جرمن روڈولف ڈیزل؟

❁ ۱۸۳۸ء تا ۱۹۱۳ء۔

176۔ لارڈ منٹو سے مسلمانوں کا وفد سر آغا خان کی سربراہی میں ملتا ہے؟

❁ اکتوبر ۱۹۰۶ء۔

177۔ ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑتی ہے؟

❁ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء۔

178۔ علیحدہ حق انتخاب کا قانون منٹو مارلے اصلاحات پاکستان کی طرف پہلا قدم؟

❁ ۱۹۰۹ء۔

179۔ علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کی یورپ سے واپسی؟

❁ ۱۹۰۸ء۔

180۔ ایڈون پیری قطب شمالی دریافت کرتا ہے؟

❁ ۱۹۰۹ء۔

181۔ جناح کی مسلم لیگ میں شمولیت؟

❁ ۱۹۱۳ء۔

182۔ علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کی نظم اسرارِ خودی شائع ہوتی ہے؟

❁ ۱۹۱۵ء۔

183۔ نہر پانامہ کھلتی ہے؟

❁ ۱۲ جولائی ۱۹۱۸ء۔

184۔ پہلی جنگ عظیم؟

❁ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء۔

185۔ میثاقِ لکھنؤ، جناح کو ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کا لقب ملتا ہے؟

❁ ۱۹۱۶ء۔

186۔ اعلان بالفور جس نے فلسطین میں یہودی ریاست کی بنیاد رکھی؟

❁ ۱۹۱۷ء۔

187۔ روس میں کمیونسٹ انقلاب آتا ہے؟

❁ نومبر ۱۹۱۷ء۔

188۔ جلیانوالہ باغ کا قتل عام؟

❁ ۱۹۱۹ء۔

189۔ بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دیدو؟

❁ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت شروع ہوتی ہے۔

190۔ جناح کانگریس کو خیر باد کہتے ہیں؟

❁ ۱۹۲۲ء۔

191۔ ترکی میں خلافت کا چراغ گل ہوتا ہے؟

❁ ۱۹۲۲ء۔

192۔ بانگِ درا شائع ہوتی ہے؟

❁ ۱۹۲۴ء۔

193۔ جان برڈ ٹیلی ویژن کا جلوہ دکھاتا ہے؟

❁ ۱۹۲۶ء دورِ حیات: ۱۸۸۸ء تا ۱۹۴۶ء۔

194۔ آئینی اصلاحات کے لیے سائمن کمیشن آتا ہے؟

❁ ۱۹۲۷ء۔

195۔ فلیمنگ زندگی بخش دوا پنسلین دریافت کرتا ہے؟

❁ ۱۹۲۸ء۔

196۔ جناح ۱۴ نکات پیش کرتے ہیں؟

❁ ۱۹۲۹ء۔

197۔ علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ پاکستان کا خاکہ پیش کرتے ہیں؟

❁ خطبہ الٰہ آباد ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء۔

198۔ لندن میں گول میز کانفرنس منعقد ہوتی ہے؟

❁ ۱۹۳۰۔۳۲ء۔

199۔ لفظ پاکستان وضع ہوتا ہے؟

❁ جنوری ۱۹۳۳ء کتابچہ Now or Never

200۔ جناح کی لندن سے واپسی اور مسلم لیگ کی سربراہی؟

❁ ۱۹۳۴ء۔

201۔ ریڈار دریافت ہوتا ہے؟

❁ وائس واٹ ۱۹۳۵ء۔

202۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ آتا ہے؟

❁ ۱۹۳۵ء۔

203۔ پہلے صوبائی الیکشن ہوتے ہیں؟

❁ ۱۹۳۷ء۔

204۔ محمد علی جناح رحمہ اللہ کو قائداعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے؟
❁ ۱۹۳۸ء۔
205۔ دوسری جنگ عظیم چھڑتی ہے؟
❁ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء تا اگست ۱۹۴۵ء۔
206۔ مسلم لیگ یوم نجات مناتی ہے؟
❁ ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء۔
207۔ ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا۔قرارداد پاکستان پاس ہوتی ہے؟
❁ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء۔
208۔ سان فرانسسکو میں یو۔این۔او کی بنیاد پڑتی ہے؟
❁ ۶ جون ۱۹۴۵ء۔
209۔ پہلا ایٹم بم ہیروشیما پر گرتا ہے؟
❁ ۶/اگست ۱۹۴۵ء اور دوسرا ناگاساکی پر ۹/اگست۔
210۔ لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ گونجتا ہے، پاکستان کے سوال پر الیکشن ہوتے ہیں؟
❁ ۵ دسمبر ۱۹۴۵ء۔
211۔ عبوری حکومت بنتی ہے؟
❁ ۱۹۴۶ء۔
212۔ تقسیم ہند کا اعلان ہوتا ہے؟
❁ ۳ جون ۱۹۴۷ء۔
213۔ اسلام کی تجربہ گاہ، اسلام کا قلعہ، پاکستان معرضِ وجود میں آتا ہے؟
❁ ۱۴/اگست ۱۹۴۷، ۲۷ رمضان المبارک، بروز جمعرات۔
214۔ میر کارواں رُخصت ہوتا ہے؟
❁ قائداعظم رحمہ اللہ کا انتقال ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء۔
215۔ ماؤزے تنگ کی رہنمائی میں جدید چین اُبھرتا ہے؟
❁ ۱۹۴۹ء۔

216۔ لیاقت علی خان کی شہادت؟

❁ ١٦/ اکتوبر ١٩٥١ء۔

217۔ ڈی این اے کی دریافت؟

❁ ١٩٥٣ء۔

218۔ بلند ترین چوٹی ایورسٹ فتح ہوتی ہے۔ ٨٨٠٠ میٹرز اونچی؟

❁ ١٩٥٣ء ہیلری، تن سنگھ۔

219۔ امریکہ پہلے ہائیڈروجن بم کا دھماکہ کرتا ہے؟

❁ مارچ ١٩٥٤ء۔

220۔ پاکستان کا پہلا آئین نافذ ہوتا ہے؟

❁ ٢٣ مارچ ١٩٥٦ء۔

221۔ پہلا خلائی جہاز سپٹنک خلا میں پرواز کرتا ہے؟

❁ ١٤/ اکتوبر ١٩٥٧ء۔

222۔ پہلا جاندار خلا میں پرواز کرتا ہے؟

❁ نومبر ١٩٥٧ء (لائیکا Laika)

223۔ پاکستان میں مارشل لا لگتا ہے۔ آئین معطل؟

❁ اکتوبر ١٩٥٨ء۔

224۔ پہلا انسان خلا میں پرواز کرتا ہے؟

❁ روسی خلا باز یوری گیگارین۔ ١٢/ اپریل ١٩٦١ء۔

225۔ پاکستان کو بنیادی جمہوریتوں پر مبنی دوسرا آئین ملتا ہے؟

❁ ١٩٦٢ء۔

226۔ دوسری پاک بھارت جنگ چھڑتی ہے؟

❁ ٦ ستمبر ١٩٦٥ء تا ٢٣ ستمبر۔

227۔ انسان کا چاند پر پہلا قدم؟

❁ ٢١ جولائی ١٩٦٩ء امریکی خلا باز آرمسٹرانگ۔

228۔ پاکستان میں دوسرا مارشل لا لگتا ہے؟

❁ ۱۹۶۹ء۔

229۔ پاکستان میں ''ایک آدمی ایک ووٹ'' کی بنیاد پر عام انتخابات ہوتے ہیں؟

❁ دسمبر ۱۹۷۰ء۔

230۔ مشرقی پاکستان میں بغاوت ہوتی ہے؟

❁ مارچ ۱۹۷۱ء۔

231۔ خون کے آنسو روتی ہے ہر آنکھ؟

❁ سقوط ڈھاکہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء۔

232۔ پاکستان کو تیسرا آئین ملتا ہے؟

❁ اگست ۱۹۷۳ء۔

233۔ لاہور میں دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد ہوتی ہے؟

❁ ۱۹۷۴ء۔



نئے طلبا کے نام

ایک خط



عزیزم!

تم نے ....سکول میں داخلہ لیا ہے۔ مبارک ہو، بار بار مبارک ہو۔ آج سے تم جیسے بھی ہو، سکول کے ہو اور سکول تمہارا ہے۔

تمہارا سکول، الحمدللہ! یوں تو پہلے سے بہت اچھا سکول ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ تمہارے یہاں آنے سے یہ اور اچھا ہو جائے گا۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہر بچے میں (چھپی ہوئی یا ظاہر) کوئی نہ کوئی ایسی خوبی ضروری ہوتی ہے جو کسی دوسرے میں نہیں ہوتی۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنی ذات کے اندر چھپے ہوئے امکانات کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری جدوجہد کرنے کا عزم اور حوصلہ رکھتے ہو۔ اللہ جل شانہٗ کا واضح وعدہ ہے:

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى.

(سورۃ النجم، آیت:39)

یعنی انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ سعی کرتا ہے۔

عزیز من!

تمہیں بھی سکول سے بہت سی امیدیں وابستہ ہوں گی۔ ہمیں بھی تم سے بہت سی امیدیں ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ یہاں تمہیں کوئی خوف نہ ستائے، کوئی بے چینی تمہیں بے چین نہ رکھے۔ پڑھنا لکھنا تو بعد کی بات ہے۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ تمہیں تحفظ کا احساس ہو،

جو توجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ حوصلہ افزائی سے بڑھتا ہے اور پیار سے مضبوط ہوتا ہے۔ ان شاء اللہ تمہیں یہاں توجہ بھی ملے گی اور محبت بھی۔

یاد رکھو! لمبے سے لمبے سفر کی ابتدا پہلے قدم سے ہوتی ہے۔ بیج ہی سے پیڑ بنتا ہے رفتہ رفتہ بچہ ماں کی گود سے اُتر کر زندگی کی شاہراہ پر قدم رکھتا ہے۔ آہستہ آہستہ ہر قدم آگے کی طرف بڑھتا ہے اور بلندیوں کی طرف بھی۔ تم جانتے ہو کہ بلندیوں کو سر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس میں جان بھی مارنی پڑتی ہے اور خطرات کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ جسے کامیابی کی اونچی چوٹی تک پہنچنا ہوتا ہے وہ نہ مشقت سے جی چراتا ہے اور نہ خطرات سے ڈرتا ہے۔ بلندیوں تک پہنچنے کا انعام بھی تو بڑا ہوتا ہے۔ اگر بڑا بننا آسان ہوتا تو ہر کوئی بڑا بن جایا کرتا۔ ہر قیمتی چیز کی طرح بڑائی بھی اپنی قیمت رکھتی ہے۔ اگر تم بڑائی چاہتے ہو تو اس بڑائی کی قیمت ادا کرنے کے لیے بھی تیار رہو۔

اب تم سایہ دار درختوں کی چھاؤں میں ہموار راستوں پر سفر کر رہے تھے۔ اب چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ اب ہمت، حوصلے اور کردار کے امتحان کا وقت آن پہنچا ہے۔ اب کھرا کھوٹا کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ اب جو کمر کس کے آگے بڑھے گا وہی منزل مراد تک پہنچے گا۔

گھر اور سکول میں فرق

میرے بچے! گھر اور سکول میں والدین اور باہر کی دُنیا میں جو فرق ہے وہ بھی تم اچھی طرح سمجھ لو۔ گھر میں بچہ چھوٹا ہو یا بڑا، دوسرے اسے سہارا دیتے ہیں۔ گھر سے باہر قدم رکھتے ہی اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ یہی دنیا کی ریت ہے۔

پھر یہ سمجھو گے کہ گھر میں، ماں باپ قابلیت کو نہیں ضرورت کو دیکھتے ہیں۔ گھر میں کوئی مقابلہ کوئی امتحان نہیں ہوتا۔ سکول میں عموماً مقابلہ کی فضا ہوتی ہے۔ کلاس میں بھی اور کلاس سے باہر بھی۔ یہاں جو مقابلہ میں جیتتا ہے وہ انعام پاتا ہے۔ باقی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ گھر میں رعایت ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے۔ گھر میں لاڈ ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے لیکن باہر نہیں۔ گھر میں ضد، من مانی یا سستی چل سکتی ہے لیکن باہر نہیں۔

سکول قابلیت، محنت اور شوق کا کھیل ہے۔ یہاں وہی بچہ آنکھ کا تارا ہوگا جو جان مارے، جو جی توڑ کے کوشش کرے، دوسروں کے کام آئے، جو مل جل کے رہنا جانتا ہو، جو اپنی کلاس کی سکول کی عزت کا خیال رکھے۔ یہاں تنگ دلی، تن آسانی اور لاپرواہی کی کوئی جگہ نہیں۔

علم کے پُرعزم طلب گار!

سکول میں تم صرف کتابیں پڑھنے اور امتحانات پاس کرنے نہیں آئے۔ یہاں تم زندگی بنانے آئے ہو۔ یہ کامیابی کی شاہراہ پر تمہارا پہلا قدم ہے۔ یہاں بہت سی کامیابیاں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ سکول کا زمانہ کئی لحاظ سے زندگی کا بہترین زمانہ ہوتا ہے۔ یہاں شاندار مستقبل کی بنیاد ہی نہیں پڑتی، یہاں زندگی بھر کے اچھے دوست ہی نہیں ملتے، ایسے روشن دماغ، شریف النفس اور شفیق اساتذہ سے بھی نیاز حاصل ہوتا ہے جو نصابی کتابیں ہی نہیں پڑھاتے درس زندگی بھی دیتے ہیں اور خود عظمتوں کی علامت بن جاتے ہیں۔

روشنی کے نوخیز مسافر!

تعلیم صرف نصابی کتابیں رٹنے اور امتحان پاس کرنے کا نام نہیں۔ تعلیم کا اصل مقصد ذہن کی نشوونما ہے۔ مطالعہ سے، مشاہدے سے، تجربے سے دماغ کو روشن کرنا ہے۔ اس لیے صرف جاننا ہی کافی نہیں، سمجھنا بھی ضروری ہے اور سمجھنا بغیر سوچنے کے ممکن نہیں۔ اس لیے بہتر تعلیم وہ ہے، صحیح تعلیم وہ ہے جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرے، جو ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرے۔

لیکن صرف علم ہی کافی نہیں، صرف جاننے اور سوچنے سے زندگی کی کٹھن منزلیں سر نہیں ہوں گی۔ علم ذریعہ ہے اور کردار مطلوب و مقصود۔ محض علم تو دو دھاری تلوار ہے۔ اس سے فائدہ بھی ہوسکتا ہے اور نقصان بھی۔ کردار سے ہی علم خیر کثیر بنتا ہے۔ اس لیے خدا سے علم کی دُعا کی جاتی ہے تو علم نافع کی دُعا کی جاتی ہے۔ ایک مفکر کا قول ہے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

آدمی پیدا ہوتا ہے اور انسان تہذیبی عمل سے بنتا ہے۔ تعلیم و تربیت ہی وہ تہذیبی عمل ہے جس کے ذریعے سے آدمی انسان میں بدلتا ہے۔ جو اس کے اندر چھپا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آدمی سے انسان بننے کا سفر مشکل ہے۔ ہر ایک کے نصیب میں انسان ہونا بھی نہیں ہوتا لیکن تم اس مشکل کو آسان کرو۔ تم اس مقام بلند پر کمند ڈالو۔ ہمت سے، حوصلے سے سفر شروع کرو اور بڑھے چلو۔

ع شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا

ع اُس نے نہ جانا یہ نادانی ہے

زندگی آزمائش بھی ہے اور انعام بھی۔ زندگی اپنے عظیم انعامات صرف ان دلیروں اور بہادروں کو پیش کرتی ہے جو آزمائش کی بھٹی سے تپ کر نکلے ہوں۔ تم نے ایک بلند چوٹی پر پہنچنے کے لیے پتھروں پر چلنا شروع کر دیا ہے۔ احتیاط سے، حوصلے سے آگے بڑھتے رہو۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

آخر میں، میں تمہاری توجہ ایک اور ذمہ داری کی طرف بھی دلانا چاہوں گا۔ گھر کے، سکول کے علاوہ تمہارا ایک رشتہ ایک تعلق اور بھی ہے۔ یعنی پاکستان!!

پاکستان کے ہونہار سپوت!

پاکستان تمہارا ہے، تم پاکستان کے ہو۔ تم اچھے ہوئے تو پاکستان بھی اچھا ہو گا۔ تمہارا ذہن روشن ہو گا تو پاکستان کے بام و در بھی روشن ہوں گے۔ تمہاری زندگی میں نظم و ضبط ہو گا تو اس کی جھلک کسی نہ کسی طرح، کسی نہ کسی جگہ، کبھی نہ کبھی پاکستان میں بھی نظر آئے گی۔ تم محنت اور ذہانت سے اپنے آپ کو مضبوط بناؤ گے تو پاکستان بھی آخرکار مضبوط ہو گا۔ تم گھر میں اور سکول میں انصاف، خدمت، قربانی، برداشت اور درگزر کے رویوں کو اپناؤ گے تو پاکستان میں بھی دیر سویر انصاف، خدمت، برداشت اور درگزر کی فضا پیدا ہو گی۔

جانِ من، جانِ پاکستان!

یقین رکھو! نیا پاکستان اور صحیح پاکستان، پاکستان کے سکولوں ہی میں پروان چڑھے گا۔ تم طلبا ہی پاکستان کے حقیقی معمار ہو۔ تم پاکستان کا مستقبل ہو۔ قائداعظم نے ایک بار

نوجوان طلبا سے کہا تھا:

''تم ہی میں سے بہت سے جناح پیدا ہوں گے۔''

مجھے یقین ہے کہ ضرور ہوں گے اور میرا دل چاہتا ہے کہ تم بھی ان میں سے ایک ہو۔

شاد باد منزل مراد
مرکزِ یقین شاد باد



میرے بچے! تُو سچ بولا کر

سچ
اعتبار ہے
سچ
عزت ہے
سچ
طاقت ہے
سچ
سب سے مضبوط
ڈھال ہے
سچ
سکون ہے
میرے بچے!
تو سچ بولا کر
جھوٹ
میرے بچے!
تجھے بے اعتبار کر دے گا
تجھ سے تیرا
سکون
چھین لے گا
میرے بچے!

جھوٹ سانپ ہے
یہ تجھے
چپکے سے
ڈس لے گا
تیری زندگی میں
زہر
گھول دے گا
اور تو اور
یہ تجھے
اپنی نظروں میں بھی
گرا دے گا
بے عزت،
بے وقار
جینا تو
کیا جینا
میرے بچے!
میری جان!
تو سچ
بولا کر
سچ
صرف سچ!!

میرے بچے! تُو انصاف کیا کر

جہاں انصاف
ہے
وہاں
سکھ ہے
جہاں
انصاف ہے
وہاں
اتفاق ہے
جہاں
انصاف ہے
وہاں
رواداری ہے
جہاں
انصاف ہے
وہاں
محبت ہے
جہاں
انصاف ہے
وہاں
قانون کی حکومت ہے
جہاں
انصاف ہے

وہاں
ترقی ہے
جہاں انصاف ہے
وہاں
مضبوطی ہے
میرے بچے!
تُو انصاف کیا کر
دنیا کا
اصل الاصول
انصاف
Justice ہے
امن کی
آزادی
کی
ضمانت
انصاف ہے
انصاف خیر کثیر ہے
میرے بچے!
تُو
انصاف کیا کر
سب سے
اپنے آپ سے بھی!

میرے بچے! تُو Care کرنا Share کرنا سیکھ

خود غرضی
بُری بلا ہے
میرے بچے!
تُو Care
کیا کر
Share کیا کر
میرے بچے!
تو دل کو
کھلا رکھ
اور
ہاتھ کو بھی
جو Care کرتا ہے
دوسرے اس کی Care کرتے ہیں
جو Share کرتا ہے
دوسرے اس سے
Share کرتے ہیں
جو Share کرتا ہے
وہ دل میں گھر
کر لیتا ہے
اس کی عزت
کرنے کو
دل چاہتا ہے
میرے بچے!

Care اور Share
کرنے میں
سکھ ہے
دوسروں کا دکھ درد
بانٹنے میں
اپنے پرائے کا
غم کھانے میں
مصیبت میں
غیروں کے
کام آنے میں
خدا کی رضا
دل کا چین
اور ذہن کا
سکون ہے
میرے بچے!
کبھی دل کو تنگ
اور
ہاتھ کو
چھوٹا
نہ کرنا
ربّ کریم
تجھ پر کرم فرمائے!

میرے بچے! تُو اپنے وقت کی قدر کیا کر

قائداعظم
کہا کرتے تھے
جو اپنی
قدر کرتا ہے
وہ
وقت کی قدر
کرتا ہے
میرے بچے!
تو
اپنے وقت کی قدر
کیا کر
وقت کو ضائع
کرنا
اپنے آپ کو
ضائع کرنا ہے
وقت سرمایہ
Capital
ہے
وقت
ترقی ہے
وقت ہی تو
زندگی ہے

وقت سونا ہے
لیکن
کوئی سونا
وقت کے ایک لمحے کو
خرید
نہیں سکتا
کوئی پچھتاوا
کوئی آنسو
گئے وقت کے ایک لمحے کو
واپس
نہیں لا سکتا
میرے بچے!
اپنے وقت کو
Manage کرنا
Forward
اور
Back ward
Plan کرنا
سیکھ
میرے بچے!
تو وقت کی
قدر کیا کر!

میرے بچے! تُو اپنے دماغ سے کام لیا کر

میرے بچے!
تو آنکھیں کھول کر
چلا کر
آس پاس کی
چیزوں کو
پیڑوں، پودوں کو
اڑتے ہوئے
پرندوں کو
غور سے دیکھا کر
غور سے دیکھنا
پھر
سوچنا، سمجھنا، تجربہ کرنا
علم کی پہلی
سیڑھی ہے
میرے بچے!
تُو
آنکھ سے بھی پڑھا کر
دماغ سے بھی
اور
دل سے بھی
جو کچھ سوچ سمجھ کر
پڑھا جاتا ہے
وہی صحیح علم ہے
وہ آئندہ
کام آتا ہے
میرے بچے!
علم خزانہ ہے
اور سوچنا Thinking
اس کی کنجی
میرے بچے!
تُو
اپنے تجربے سے
سیکھا کر
علم
اس کا ہوتا ہے
جو اسے
سمجھتا ہے
میرے بچے!
تُو علم کو
تلاش کیا کر
تو سچائی کا
کھوج لگایا کر
میرے بچے!
تُو تحقیق
Research
کا راستہ
اختیار کر

میرے بچے! کبھی تُو نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا ہے

میرے بچے!
کبھی سوچا ہے
تیرے اندر
کتنی صلاحیتوں کے
بیج ہیں؟
کبھی غور کیا ہے
ترا دماغ
کتنی بڑی قوت ہے
تجھے معلوم ہے
تیرا علم
کتنا طاقتور ہتھیار ہے
تیرا کردار
کتنی مضبوط ڈھال ہے
بتا تو سہی
تو
محض لکیر کا
فقیر ہے
یا اپنے
دماغ سے بھی
کام لیتا ہے؟

میرے بچے!
تو نے کبھی
اپنی امنگوں
اپنے دل میں
چھپی ہوئی آرزوؤں
اپنی ترجیحات کا
بھی
جائزہ لیا ہے؟
کبھی اپنے اندر
جھانک کر بھی دیکھا ہے؟
اپنے آپ کو جاننے کی
کوشش
کی ہے؟
میرے بچے!
میری امید
کبھی
اپنے اندر بھی جھانکا کر
اپنی سوچوں
اپنے رویوں کو بھی
تولا کر



میرے بچے! اپنی صحت کا خیال رکھا کر

جان ہے تو
جہان ہے
صحت ہے
تو
تعلیم ہے
صحت ہے تو
ترقی ہے
صحت ہے تو
زندگی کا
مزہ ہے
صحت نہیں تو
ذہن
بیکار ہے
صحت نہیں تو
علم بے کار ہے
صحت نہیں
تو
پیسہ بیکار ہے
میرے بچے!
صحت

تجھے کوئی اور
نہیں دے سکتا
یہ تیری
اپنی چیز ہے
خواہ تو
اسے
بنائے یا
بگاڑے
صحت کا تعلق
سوچ
سے ہے
صحت کا تعلق
کیریکٹر
سے ہے
صحت کی
بنیاد
ڈسپلن ہے
صحت کا
اصل الاصول
اعتدال

ہے
میرے بچے!
تجھے ترقی کرنا ہے
تجھے آگے بڑھنا ہے
تو قوم کے مقدر کا
ستارا ہے
تجھے آدمی سے
انسان
اور عظیم انسان
بننا ہے
میرے بچے!
تو اپنی صحت کو
Manage کرنا سیکھ!ا



میرے بچے! حسد کی آگ سے ہمیشہ دُور رہنا

دوسری آگیں
دوسروں کو جلاتی ہیں
حسد کی آگ
خود اسے
جلاتی ہے
جو حسد کرتا ہے
حسد سے
اس کا
کچھ نہیں بگڑتا
جس سے
حسد کیا جاتا ہے
حسد
احساس کمتری ہے
حسد
بیوقوفی ہے
کسی کو گرانے سے
کوئی خود
آگے نہیں بڑھ جاتا
کسی کو بُرا کہنے سے
کوئی خود
اچھا نہیں ہو جاتا
کسی کا بُرا چاہنے سے
کسی کو
بڑائی
نہیں مل جاتی
میرے بچے!
کسی کو
گرا کر
کوئی اوّل آیا
تو کیا آیا
میرے بچے!
اپنی کوشش سے آگے
بڑھنا
کسی کو گرا کر نہیں
Never Try to Steal Victory
چوری کی
کامیابی بھی
کوئی کامیابی ہے
کھلے میدان میں
دن کی روشنی میں

حوصلے سے ہارنا
رات کی تاریکی میں
دھوکے سے
جیتنے سے
بہتر ہے
اور ہزار درجہ
بہتر ہے

میرے بچے!
Self respect کا
محنت کا
دیانت کا
کوئی بدل
نہیں



میرے بچے! تُو برداشت کرنا سیکھ

جو
حق پر ہوتا ہے
جو
مضبوط ہوتا ہے
جو سمجھ دار
Proactive
ہوتا ہے
وہ برداشت بھی کرتا ہے
Tolerate بھی
کرتا ہے
آواز
اس کی اونچی ہوتی ہے
چہرہ
اس کا سرخ ہوتا ہے
جس کا مقدمہ
کم زور ہو
میرے بچے!
اپنے مقدمے کو
اپنے کام کو
سیدھا
رکھنا
کبھی آواز کو
اونچا نہ کرنا
آواز کو
اونچا کرنے سے
اینٹ کا جواب
پتھر سے
دینے سے
Reactive
ہونے سے
بات
بنتی نہیں
بگڑتی ہے
میرے بچے! میری جان!
یاد رکھ
نفرت کی
آگ
کبھی
نفرت سے
نہیں بجھتی!



میرے بچے! کبھی پیچھے مُڑ کے نہ دیکھنا

جو پیچھے مڑ کے
دیکھتا ہے
اس کا اگلا قدم
رُک جاتا ہے
میرے بچے!
کبھی پیچھے مڑ کے نہ دیکھنا
چھوٹی چھوٹی باتوں میں
نہ الجھنا
اپنی ترجیحات پر
نظر رکھنا
تکلیف اٹھا لینا
ذلت نہ اُٹھانا
زندگی
آزمائش بھی ہے
اور
انعام بھی
میرے بچے!
آزمائش سے گزر کر
انعام کا
انتظار کرنا

گلاب
کانٹوں میں
کھلتا ہے
دانہ خاک میں مل کر
گل و گلزار ہوتا ہے
میرے بچے!
اپنے حصے کی
آزمائشوں کے لیے
اپنے حصے کے
کانٹوں کے لیے
تیار رہنا
پریشان ہونے سے
کوئی پریشانی
دور نہیں ہوتی
الجھنے سے
کوئی مسئلہ
حل نہیں ہوتا
زبردستی کرنے سے
کوئی نہیں بدلتا
غصہ کرنے سے

کسی کا غصہ
کم نہیں ہوتا
میرے بچے!
ذہن کو
اور دامن کو
صاف رکھنا

اور
کسی سے الجھے بغیر
آگے بڑھتے رہنا
جب تک
قدم اٹھتا رہے گا
فاصلے طے ہوتے رہیں گے



میرے بچے! غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں

غیرت ہے بڑی چیز
جہان تگ و دو میں
یہ قول
علامہ اقبال رحمہ اللہ کا ہے
میرے بچے!
اپنی غیرت کی
حفاظت کرتے رہنا
سوال سے
(مانگنے سے)
خودی ضعیف ہوتی ہے
یہ قول بھی
اقبال رحمہ اللہ ہی کا ہے
میرے بچے!
دست سوال
(کسی شکل میں بھی)
دراز نہ کرنا
تعلیم میں بھی
اپنی خودی کو
ضعیف نہ ہونے دینا
ہمیشہ

اپنی عقل سے
اپنے تجربے سے
کام لینا
صرف
اپنی محنت
اپنے مطالعہ
سے
آگے بڑھنا
فرد ہو
یا قوم
اپنی خودی کی
حفاظت
اس پر
لازم ہے
دست سوال
خواہ وہ
کسی شکل میں ہو
اپنی خودی
اپنی انا
اپنی شخصیت کی

توہین ہے
تکلیف اٹھالینا
بہتر ہے
مانگنے کی

ذلت اٹھانے سے
میرے بچے!
اپنی غیرت کی
حفاظت کرنا
ہر قیمت پر



میرے بچے! تُو Trust کیا کر

جس کی
نیت
صاف ہو
جس کا
دل
شفاف ہو
جسے
اپنے کردار پر
اعتماد ہو
وہ
Trust کرتا ہے
میرے بچے!
تُو Trust
کیا کر
جو وفا کرے
اس سے وفا
کی جاتی ہے
جو Trust کرے
اس پر
Trust کیا جاتا ہے
میرے بچے!
تُو Trust
کیا کر
جو Trust کرتا ہے
وہ
خاموشی سے
دل میں گھر
کر لیتا ہے
جو Trust
کرتا ہے
وہ Tension کا
شکار
نہیں ہوتا
Trust
Creativity کو
اُکساتا ہے
Trust کے
ماحول میں
Efficiency
بڑھ جاتی ہے
Trust

Confidence دیتا ہے
اسے
جو Trust کرتا ہے
اور اسے بھی
جس پر Trust
کیا جاتا ہے
میرے بچے!
ہر رشتہ
خواہ وہ
ذاتی ہو،
Official یا کاروباری
Trust سے
اور Trust پر
قائم رہتا ہے
قائم ہوتا ہے
Trust نہ رہے
تو رشتہ بھی نہیں رہتا
جس دل میں
Trust نہ ہو
اس میں
بدگمانی ہوتی ہے
اور
بعض بدگمانیاں
گناہ کے
زمرہ میں آتی ہیں (القرآن)
میرے بچے!
کبھی بدگمانی نہ کرنا
اپنوں کو
دشمن نہ بنا لینا
اپنے سکون کو
خود برباد
نہ کر لینا
میرے بچے!
تُو Trust کیا کر



میرے بچے! Modest ہونا اچھا ہوتا ہے

ذہانت
Talent
حسن
دولت
خوبصورتی
رب کریم کی
عطا کی ہوئی
کوئی
نعمت ہو
اسے Over expose
کبھی
نہ کرنا
Modesty سے
کام لینا
میرے بچے!
Modest ہونا
ہمیشہ
اچھا ہوتا ہے
جیت
کتنی بڑی ہو
کامیابی
خواہ کتنی
شاندار ہو

اس پر
کبھی
نہ اترانا
کبھی اسے
Over Project
نہ کرنا
Modesty
میرے بچے!
اللہ کو پسند ہے
Modesty میں
برکت ہے
عاجزی،
سو بلاؤں سے
محفوظ رکھتی ہے
نام بڑا ہو
تو
میرے بچے!
ظرف بھی
بڑا رکھنا
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ
(سورۃ الرحمٰن)



میرے بچے! کبھی لالچ نہ کرنا

سچ ہے
لالچ بُری بلا ہے
لالچ
انسان کو
اندھا کر دیتا ہے
لالچ میں اسے
اپنے غیر
اچھے بُرے کا فرق
نظر نہیں آتا
لالچ
انسان کو
بے انصاف
ظالم بنا دیتا ہے
لالچ میں
انسان کی عقل پر
پتھر پڑ جاتے ہیں
وہ ہوس کی دلدل میں
پھنستا چلا جاتا ہے
میرے بچے!
کبھی لالچ نہ کرنا
کبھی زیادہ چالاک
بننے کی
بیوقوفی نہ کرنا



میرے بچے! کبھی Reactive نہ ہونا

اپنے آپ کو
اپنے Mood
یا
دوسروں کے
Responses
(ردِعمل)
کا قیدی
نہ بنا لینا
میرے بچے!
کبھی
Reactive نہ ہونا
جو اپنے آپ سے
ہار گیا
وہ کس سے
جیت سکے گا!



میرے بچے! تُو ربّ کا شکر کیا کر

حضرت علی رضی اللہ عنہ
کا
قول ہے
جو شخص
بصیرت رکھتا ہے
وہ آنکھ سے بھی
دیکھتا ہے
دماغ سے بھی
دیکھتا ہے
اور دل سے بھی
دیکھتا ہے
میرے بچے!
تُو آس پاس کی دُنیا کو
اپنے
آپ کو
آنکھ سے دیکھ
دماغ سے
دیکھ
دل سے
دیکھ

اور سجدے میں گر جا
میرے بچے!
تو ربّ کریم کا
شکر کیا کر
صبح و شام

افلا یشکرون (القرآن)



یہ کون لوگ ہیں؟

یہ
صاحب خیر
کون لوگ ہیں؟
جن کے راستے میں
کوئی کہکشاں نہیں ہے
جو آدمی میں
انسان کی تلاش میں
پتھروں پہ چل رہے ہیں
یہ باعث خیر
کون لوگ ہیں؟
جن کا سارا سرمایہ
شفاف خلوص ہے
یہ اہل نظر
کون لوگ ہیں؟
جو شب گزیدہ
بستیوں کی
تاریک راہوں میں
صلہ کی تمنا
اور
ستائش کی پروا
کیے بغیر
خدمت کے دیئے
جلا رہے ہیں؟
آیئے
سلطانہ فاؤنڈیشن کے
اس
انسان دوست قافلے میں
شریک ہوں
اور
اپنے حصے کا
دیا جلائیں
”جس کا عمل ہے بے غرض
اس کی جزا
کچھ اور ہے۔“



غور سے دیکھو

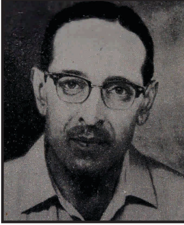
لوگو!
آدمیوں کے
ہجوم میں
''اس انسان
(استاد)
کو
غور سے دیکھو

اس کی آنکھوں میں
کوئی بڑا
مقصد ہے
اپنے کیریئر سے
بڑا
اپنے خاندان سے
بڑا''



چند ہم عصر

یہاں سول اور ملٹری کالج کے سٹاف کے اُن مندرجہ ذیل ہم عصرین کا تذکرہ ہے جو کالج کی خدمت کم وبیش دس سال یا اس سے زیادہ طویل عرصے تک دل و جان سے بجا لائے اور جن کے خونِ جگر سے اس ادارے کی آبیاری ہوئی۔



1۔ پروفیسر فضل حق حیدری

مجموعہ کمالات مسٹر حیدری جو کالج پر صبح کے ستارہ کی طرف برسہا برس چمکتے رہے۔بمبئی کے ایک پارسی پبلک سکول سے آ کر ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو کالج سے وابستہ ہوئے اور اسے پبلک سکول کا آب و رنگ دیا۔ ۲۰/دسمبر ۱۹۴۶ء کو کالج کو خیر باد کہا۔ یکم اگست ۱۹۴۸ء کو دوبارہ کالج سے منسلک ہوئے اور ۲۹ دسمبر ۱۹۶۹ء تک اس ادارہ کو اپنی شخصیت کے جمال و کمال سے فروزاں رکھا۔ انگریزی کے با کمال استاد مسٹر حیدری کالج کے فائن آرٹس اینڈ کلچرل سینٹر کے بانی اور اس کے روحِ رواں تھے۔



2۔ پروفیسر برکت علی چوہان

بزرگ استاد بی اے چوہان ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۸ء تک تقریباً دس سال کالج میں ریاضی کے اعزازی استاد رہے، آپ نے اپنے ٹیچنگ کیریئر کی ابتدا ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ میں ریاضی کے لیکچرر کی حیثیت سے کی تھی۔ اس سے ان کی سینیارٹی اور تجربے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔



3۔ پروفیسر عین الدین علوی

مسٹر عین الدین علوی نے ۸ اپریل ۱۹۵۳ء کو اس کالج میں اُردو کے سینئر ماسٹر کی حیثیت سے قدم رکھا تھا۔ ۲۲/فروری ۱۹۸۷ء کی شام یہیں سے ان کا جنازہ اُٹھا اور کالج کے ہی قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کے سنگ مزار پر لکھا ہے پروفیسر عین الدین علوی استاد ملٹری کالج جہلم (۸۷۔ ۱۹۵۳ء) وہ جو چراغ جلاتے جلاتے خود جل بجھے۔صاحبِ کتاب مصنف اور صاحبِ طرز ادیب ہونے کا امتیاز بھی انہیں حاصل تھا۔اس کالج کے لیے انہیں ایک تحفۂ خداوندی کا درجہ حاصل تھا۔



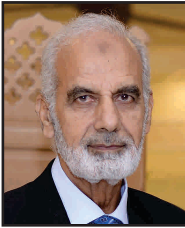
4۔ پروفیسر شفیق احمد

کیمسٹری کے بے مثال اُستاد شفیق صاحب ۱۹۵۴ء میں کالج کے اکیڈیمک اسٹاف سے وابستہ ہوئے۔ تیس سال بعد اپنی درخواست پر ریٹائرمنٹ لی۔ کالج کو خیر باد کہا۔ سائنسی دماغ پایا تھا لیکن مزاج کے اعتبار سے فنکار اور لائف سٹائل میں درویش تھے۔



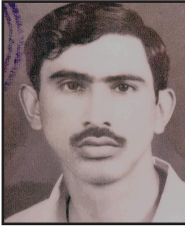
5۔ بریگیڈیئر آئی آر صدیقی

۱۹۵۸ء میں سیکنڈ لیفٹیننٹ ہو کر یہاں آئے۔ ریاضی کے بہترین استاد، مزید برآں اسکاؤٹر اور آؤٹ ورڈ باؤنڈ سرگرمیوں کے ماہر اور بہت ہی مؤثر ہاؤس ماسٹر تھے۔ ۱۹۶۲ء میں اپنے تبادلے تک کیپٹن صدیقی نے کئی زاویوں سے کالج کو روشن کیے رکھا۔ ۸۴۔۱۹۸۳ء میں بریگیڈیئر کے رینک میں کالج کے کمانڈانٹ بھی رہے۔



6۔ پروفیسر محمد مشتاق

اُردو کے اُستاد کی حیثیت سے ۱۹۷۱ء میں کالج کے شعبہ میں اُردو سے مُنسلک ہوئے۔ ۸۷۔۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۹ء تک میگزین عالمگیرین کے ایڈیٹر اور محمود غزنوی ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر رہے۔



7۔ پروفیسر طارق محمود

ریاضی کے استاد طارق محمود کالج میں ۱۹۷۴ء سے ۲۰۰۰ء تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ شعائر اسلامی کے پابند تھے۔ اسلامی قدروں کے امین اور قدروں کے مینارۂ نور تھے۔



8۔ پروفیسر مرزا عبداللطیف

آرٹ کے فاضل استاد مرزا عبداللطیف صاحب ۱۹۷۵ء سے ۲۰۰۰ء تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ شعبہ فائن آرٹس اور ایئرو ماڈلنگ کے نگران بھی رہے۔

9۔ ڈرائنگ ماسٹر احمد دین

ڈرائنگ کے باکمال اُستاد کریالے کے احمد دین صاحب نے ۱۹۲۶ء سے فروری ۱۹۵۱ء تک پچیس سال سے زیادہ کالج کی بے لوث خدمت کی۔ سینٹرل ہال میں کالج کی پہلی آرٹ گیلری انہی نے قائم کی تھی۔

10۔ مولوی عزیز احمد

مولوی عزیز احمد صاحب ۱۹۴۲ء سے ۱۹۷۰ء تک کالج میں دینیات کے اُستاد اور امام مسجد رہے۔ وہ کالج کے پہلے انگریزی داں امام مسجد تھے۔

11۔ سلطان حسین شمسی

شمسی صاحب ۱۹۴۵ء میں کالج میں جغرافیہ کے اسٹاف میں شامل ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں یہیں سے ای سی میں کمیشن لیا۔

12۔ اقبال احمد

پرنس آف ویلز کالج ڈیرہ دون کے سابق استاد مسٹر اقبال احمد ۱۹۴۸ء کے اواخر میں کالج میں آئے۔ سوِکس اور تاریخ پڑھاتے تھے۔ انٹرنیشنل افیئرز پر بڑی نظر تھی۔ انہوں نے کالج میں ذوقِ آگہی عام کیا۔ ۱۹۵۸ء میں ریٹائر ہوئے لیکن نقش قدم چھوڑ گئے۔

13۔ مظہر علی خان

۱۸ اگست ۱۹۴۸ء کو کالج میں آئے، کالج کی نئی لیبارٹری انہی نے سیٹ کی۔ بیالوجی کا میوزیم بھی قائم کیا۔ ہائیجین اور فزیالوجی ان کا مضمون تھا۔ جس کو وہ اُستادانہ مہارت سے پڑھاتے تھے۔ بحیثیت ہاؤس ماسٹر بھی بہت کامیاب تھے اور بچوں کی تربیت کرنے کا اپنا اسٹائل تھا۔ ۱۹۶۸ء میں کالج کو ریٹائرمنٹ پر خیر باد کیا۔

14۔عبدالحمید قریشی

تاریخ و جغرافیہ کے استاد مسٹر عبدالحمید قریشی کے جی آر آئی ایم کالج جالندھر سے ۱۹۴۸ء کے اوائل میں یہاں آئے تھے۔ جغرافیہ کی بے شمار درسی کتابوں کے مصنف تھے۔ رضیہ سلطانہ پر ایک تاریخی کتاب ''ملکہ ہند'' بھی لکھی تھی۔ ۱۹۶۹ء میں ریٹائر ہوئے۔

15۔محمد ایوب خان

انگریزی کے مستند استاد مسٹر محمد ایوب خان یکم اگست ۱۹۴۸ء کو کالج سے وابستہ ہوئے۔ تقریباً ستائیس سال اس ادارہ کی تعمیر میں منسلک رہے۔ جولائی ۱۹۷۶ء میں کالج کو خدا حافظ کہا۔

16۔صوبیدار عریف الحسن

کلکتہ یونیورسٹی کے پرانے بی ایس سی آنرز تھے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک تقریباً سات سال یہاں سائنس اور ریاضی پڑھاتے رہے۔ اس وقت جب یہاں سائنس کے استادوں کی بہت کمی تھی وہ قطب ستارے کی طرح جمے رہے اور بڑے خلوص سے اس شعبہ کو چمائے رکھا۔

17۔ضمیر احمد صدیقی

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۴ء تک انگریزی کے سینئر استاد رہے۔ انگریزی گرائمر پڑھانے میں خصوصی مہارت تھی۔ طلبا کی مذہبی تربیت پر بھی توجہ دیتے تھے۔

18۔سراج احمد علوی

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک اُردو کے سینئر استاد اور ''تربیت'' کے ایڈیٹر رہے۔ شاعر بھی تھے۔

19۔ریحان احمد بلگرامی

اکتوبر ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۵ء تک مسٹر بلگرامی نے اپنے علم اور تجربہ سے کالج کے بام و دَر کو روشن رکھا۔ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔

20۔ محمد حسن

علی گڑھ یونیورسٹی سے بیالوجی کے پُرانے بی ایس سی، کشمیر کے ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر محمد حسن جامع کمالات انسان تھے۔ فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ مقرر تھے، باوجودِ کہ عمر کے بڑے مگر زندہ دل چاق و چوبند تھے اور سونے پر سہاگہ کہ اُردو انگریزی کے علاوہ حساب کے بھی ماہر استاد تھے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۹ء تک وہ اپنے علم و فن کے موتی یہاں لُٹاتے رہے۔

21۔ قاضی عبدالحکیم ڈرائنگ ماسٹر

آرٹ میں انگلینڈ کے سند یافتہ، قاضی صاحب ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۹ء تک کالج میں ڈرائنگ کی تدریس کے علاوہ آرٹ کے شعبہ کے نگران رہے۔ اپنے فن کے ماہر تھے۔

22۔ کیپٹن آغا نسیم

۶۰۔۱۹۵۷ء میں صرف چند سال یہاں رہے لیکن بہت ہی مؤثر ثابت ہوئے۔ اپنے مضمون ریاضیات میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔

23۔ کیپٹن اعجاز اکبر

۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک تقریباً دس سال کیپٹن اعجاز اکبر اپنے کام سے کالج کے اُفق پر چھائے رہے۔ بحیثیت ریاضی کے استاد اور ٹیپو ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر ان کا جواب نہ تھا۔

24۔ عبدالرشید

مارچ ۱۹۶۰ء سے نومبر ۱۹۸۲ء تک رشید صاحب نے بڑے جوش و جذبے سے تاریخ کے شعبہ میں تدریسی و تعلیمی خدمات انجام دیں۔ کالج میں مذہبی امور کے نگران بھی تھے۔

25۔ کیپٹن غلام سرور

۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۸ء تک کیپٹن غلام سرور کالج میں علم و ادب کی شمعیں روشن کرتے رہے۔ انگریزی کے سکہ بند اُستاد تھے۔ مذہبی اور قومی جذبے سے معمور غلام سرور صاحب نے کالج کو اپنے ذوقِ آگہی سے بہت فیضیاب کیا۔

26۔ مصطفیٰ کمال

نومبر ۱۹۶۱ء سے جولائی ۱۹۷۵ء تک مسٹر مصطفیٰ کمال ہینڈی کرافٹس کے شعبہ میں اپنے کمالات دکھاتے رہے۔ ان کی سدا بہار شخصیت اپنی جگہ ذریعہ تربیت تھی۔

27۔ پروفیسر محمد لطیف عباسی

بزرگ صورت و سیرت عباسی صاحب ۱۹۶۲ء میں کیمسٹری کے ڈیمانسٹریٹر ہو کر کالج میں آئے تھے۔ تعلیمی تجربہ اور کرداری برگزیدگی طلبا کے لیے سرچشمہ فیض ہے۔

(داستانِ علم و عمل، ''ملٹری کالج جہلم کی تاریخ ۱۹۲۵ء تا ۲۰۰۱ء'' ص ۲۶۴ تا ۲۶۷)



ملٹری کالج جہلم کا ترانہ

ملٹری کالج جہلم! زندہ تابندہ، پائندہ باد

علم کی شمعوں سے روشن ہیں ہر کیڈٹ کی راہیں
ذہن منور ہنستی آنکھیں اور فولادی باہیں
پائیں جو بھی چاہیں

ہم ہیں عالمگیرین
ہم ہیں عالمگیرین

اے کالج جی جان سے پیارے
ہر لحظہ ہر آن سنوارے
تو کردار ہمارے

مرحبا۔ مرحبا۔ مرحبا
اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر
ملٹری کالج جہلم! زندہ تابندہ، پائندہ باد

کس میں ہمت پاکستان کی جانب آنکھ اُٹھائے
او للکارنے والو ٹھہرو! ہم آئے ہم آئے
ہم شیروں کے جائے

ہم ہیں عالمگیرین
ہم ہیں عالمگیرین

ان کی روایت دائم ہم سے
شان شہادت قائم ہم سے
گونج رہے ہیں نعرے

مرحبا۔ مرحبا۔ مرحبا
اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر
ملٹری کالج جہلم! زندہ تابندہ، پائندہ باد